اللمعان

اردو شرح

التبیان فی علوم القرآن

الشیخ محمد علی الصابونی

ترجمہ و تسہیل
شیخ ولی خان المظفر
سابق استاذ حدیث وتفسیر جامعہ فاروقیہ کراچی

ضبط تحریر و حواشی
مولانا سید عطاء الرحمن بخاری
استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

اللمعان

اردو شرح

التبیان فی علوم القرآن

الشیخ محمد علی الصابونی

ترجمہ و تسہیل

شیخ ولی خان المظفر

سابق استاذ حدیث و تفسیر جامعہ فاروقیہ کراچی

ضبط تحریر و حواشی

مولانا سید عطاء الرحمٰن بخاری

استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی

مکتبہ لدھیانوی

فہرست مضامین

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمدللہ رب العالمین، والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین،

وعلی آلہ، وأصحابہ، ومن والاھم إلی یوم الدین، وبعد!

وفاق المدارس العربیہ پاکستان میں بطور نظامت، پرسنل سیکرٹری صدرِ وفاق، رکن امتحانی کمیٹی، رکن نصاب کمیٹی ورابطہ سیکرٹری برائے تخصصات کمیٹی کام کرنے کا ایک طویل موقع اللہ تعالیٰ کے خاص فضل وکرم اور صدرِ وفاق وصدرِ اتحاد تنظیمات مدارس دینیہ پاکستان سماحۃ الاسلام المحدث الشیخ سلیم اللہ خان صاحب مدظلہم العالی کی خصوصی شفقتوں سے ملا۔

درجہ سابعہ کے نصاب میں علوم القرآن کے حوالے سے جب کمیٹی میں بات ہوئی تو راقم نے فضیلۃ الشیخ محمد علی الصابونی الحنفی کی تالیف "التبیان في علوم القرآن" پیش کی، بالاتفاق اسے منظور کر کے نصاب کا حصہ بنایا گیا۔

ایک موقع پر حضرت صدرِ وفاق کی معیت میں عمرے کی سعادت نصیب ہوئی، ہم نے مطاف میں شیخ صابونی صاحب سے ان کی مخصوص نشست گاہ میں ملاقات کی، کتاب کی ترتیب اور دیگر متعلقہ امور پر کچھ معروضات گوش گزار کردیں، انہوں نے فرمایا "افعل یا بُنيّ ثم أرنیہ" چنانچہ واپس آ کر ہم نے نئی ترتیب کا مکمل خاکہ بنا کر حضرت مولانا مزمل سلاوٹ استاذ جامعہ فاروقیہ کراچی کی گرانقدر خدمات حاصل کیں، انہوں نے شبانہ روز عرق ریزی کر کے مطلوبہ معیار سے بھی بہتر ترتیب دے کر کتاب تیار کی، جو مکتبہ البشریٰ سے چھپ کر منظر عام پر آئی۔

اس درمیان مرتب شدہ کتاب مولانا یوسف یامین کے توسط سے ہم نے صابونی

صاحب اور ان کے صاحبزادے احمد صابونی صاحب کو بھی دکھائی، اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے ہمارے کام کی تحسین کی، اور ہمیں فون کر کے ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ کلمات تشکر سے بھی نوازا، بعد میں بیروت کے ایک سفر میں وہ نیا مرتب شدہ نسخہ ہم نے وہاں بھی ایک مکتبہ کو چھاپنے کے لئے دیا، امید ہے کہ وہاں سے بھی شایانِ شان زیورِ طبع سے آراستہ وپیراستہ ہوگی، انشاء اللہ تعالیٰ۔

جامعہ فاروقیہ کراچی میں ''نخبۃ الفکر'' کے ساتھ ''التبیان فی علوم القرآن'' کی تدریس کی سعادت بفضلہٖ تعالیٰ ہمیں تین چار سال تک نصیب ہوئی، اس دوران معہد اللغۃ العربیہ والدراسات الاسلامیہ اور جامعہ فاروقیہ کراچی کے مایہ ناز مدرس ومفتی مولانا سید عطاء الرحمٰن شاہ البخاری حفظہ اللہ نے تدریس کے دوران ہمارے ترجمہ وتسہیل کو منضبط فرمایا، کمپوز کیا، تصحیح کی، قابلِ قدر حواشی کا اضافہ کیا، مکمل ہونے کے بعد ہم نے بھی متن وحواشی اور ترتیب وتنظیم پر نظر ثانی کی۔

مکتبہ لدھیانوی کے ذمہ دار جناب طلحہ طاہر صاحب سلمہ نے نشر واشاعت کے امور کو اپنے ذمہ لیا، پیج میکنگ کا کام عرفان انور مغل نے مکمل کیا۔

اصول تفسیر یا علوم القرآن کے حوالے سے یہ ادنیٰ سی کاوش پیشِ خدمت ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دست بدعا ہوں کہ وفاق المدارس، صدرِ وفاق، جامعہ فاروقیہ کراچی، مولانا عطاء الرحمٰن شاہ بخاری، مکتبہ لدھیانوی، جناب طلحہ طاہر، جناب عرفان انور مغل اور متعلقہ تمام شخصیات واداروں کو دن دگنی رات چگنی ترقیوں سے نوازے، اور ہم سب کو قرآن کریم کی تعلیمات پر من وعن عمل کرنے اور کرانے کی توفیق نصیب فرمائے۔

وماذلک علی اللہ بعزیز۔

ابولبید الشیخ (مولانا) ولی خان المظفر

عضو رابطۃ الادب الاسلامی العالمیۃ

بانی وسرپرست مجمع اللغۃ العربیۃ بباکستان

المظفر ٹرسٹ انٹرنیشنل

مقدمہ از مصنف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین، والصلاۃ علی المبعوث رحمۃ للعالمین، وعلی وآلہ واصحابہ والتابعین لھم باحسان الی یوم الدین، وبعد:

علوم قرآن سے متعلق یہ چند علمی لیکچرز ہیں جو میں نے مکہ مکرمہ کی یونیورسٹی ’’کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیہ‘‘ کے طلبہ کرام کیلئے تیار کیے ہیں، تاکہ یہ تقاریر یونیورسٹی کے لئے درسی نصاب کی ضرورت کو پورا کریں، اور میرے وہ عزیز طلبہ جو حصول علم میں رغبت اور حد درجہ شوق رکھتے ہیں، انہیں ان تقاریر سے فائدہ پہنچے، اور افادۂ عامہ اور علم کی نشرواشاعت کی خاطر میں نے یہ بات مناسب سمجھی کہ ان تقاریر کو ایک کتاب کی شکل میں جمع کردوں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کام کو خالص اپنی رضا جوئی والا کام بنادے اور یوم حشر وحساب میں ہمیں فائدہ پہنچائے کہ جس میں نہ مال نفع دے سکے گا اور نہ ہی اولاد مگر جو شخص اللہ کے پاس صاف دل لے کر آیا، اور اللہ ہی ہمیں کافی ہے اور بہترین کارساز ہے۔

محمد علی صابونی

استاذ کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ مکہ مکرمہ

یکم رجب ۱۳۹۰ھ

مقدمۂ طبع ثالث

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی انزل کتابه المبین، تبیانا لکل شیئ وهدی ورحمة للمؤمنین، و الصلاة والسلام علی اشرف الانبیاء والمرسلین، المبعوث رحمة للعالمین، وعلی آله واصحابه شموس الهدایة ونجوم العرفان، والتابعین لهم باحسان الی یوم الدین وسلم تسلیما کثیرا۔ اما بعد!

بیشک قرآن کریم محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا دائمی معجزہ، پائیدار دلیل اور آپ کی رسالت کی سچائی کا منہ بولتا ثبوت ہے، اور یہ قرآن خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ وحی الٰہی ہے، جو کہ اس امی نبی پر اتری ہے کہ جس نے کسی انسان سے کوئی ادنیٰ علم حاصل نہیں کیا اور نہ ہی اس کا علمائے اہل کتاب میں سے کسی سے کوئی علمی استفادہ کا تعلق و ربط معروف ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لکھنا پڑھنا بھی نہ جانتے تھے، لیکن اس کے باوجود یہ معجزانہ کتاب لے آئے جو کہ رب العالمین کی طرف سے منزل وحی ہونے پر روشن دلیل اور ناقابل تردید حجت ہے: ﴿وما کنت تتلوا من قبله......﴾ (سورۃ عنکبوت: ۴۸،۴۹)

یہ قرآن کریم ان گنت علوم و معارف کا خزانہ ہے، اور معاشرتی، اقتصادی اور سیاسی امراض و بیماریوں کے علاج کے سلسلہ میں ایسے احکام و مسائل لے کر آیا ہے، جس سے عقلیں دنگ رہ گئی ہیں اور بڑے بڑے اہل فہم و دانش اس کا مقابلہ کرنے اور اس کی مثل لانے سے عاجز ہو چکے ہیں، اس کے اندر بلاغت و بیان کی ایسی ایسی وجوہ موجود ہیں جو بلاغت کے شہسواروں اور ادب و کلام کے بلند پایہ دانشوروں کی پہنچ سے بھی بالا ہیں، اسی لئے قرآنی تحقیقات میں مشغول حضرات کیلئے مناسب ہے کہ وہ لوگوں کو ان علوم و معارف کے اصول و قواعد سے متعارف کرائیں، جن کا قرآن نے احاطہ کیا ہوا ہے، اور قرآن کریم

کی سُوَر و آیات، قصص و اخبار اور اسلوب و بیان کی وجوہِ اعجاز اور اس میں دیگر موجود خزائن و دقائق کو بیان کریں۔

اور میں نے اس کتاب "التبیان فی علوم القرآن" میں انہی خصوصیات وخوبیوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے، اور علوم قرآن کے بارے میں اپنی تحقیق کے سلسلہ میں اس معجز کتاب کے بعض اسرار ورموز کو قدرے تفصیل کے ساتھ اس کتاب میں ذکر کیا ہے، اور اپنی اس بحث و تحقیق کو میں نے دس فصلوں کے اندر تقسیم کیا ہے جیسا کہ قارئین ملاحظہ فرمائیں گے:

۱۔ فصل اول: علوم قرآن کی تعریف، فضائل قرآن اور حاملین قرآن کے آداب کے بیان میں ہے۔

۲۔ فصل دوم: اسباب نزول کی معرفت، قرآنی آیات کے سمجھنے میں اسباب نزول کی معرفت کے فوائد اور اس کی مثالوں کے بیان میں ہے۔

۳۔ فصل سوم: قرآن کریم کے تدریجی نزول اور اس کے دیگر سابقہ کتب سماویہ کے یکبارگی نزول سے مختلف ہونے کی حکمت کے بیان میں ہے۔

۴۔ فصل چہارم: عہد نبوی میں جمع قرآن اور عہد صدیقی میں متعدد مصاحف واوراق میں جمع قرآن اور پھر عہد عثمانی میں ایک ہی مصحف میں جمع قرآنی کا بیان ہے۔

۵۔ فصل پنجم: قرآن کریم میں نسخ، نسخ کے معنی اور احکام شرعیہ میں نسخ کے وقوع کی تشریعی حکمت کے بیان میں ہے۔

۶۔ فصل ششم: تفسیر و مفسرین، تفسیر کی اقسام تفسیر منقولی اور تفسیر معقولی اور کتاب ربانی کی تفسیر کرنے والے حضرات کی شرائط کے بیان میں ہے۔

۷۔ فصل ہفتم: تفسیر اشاری اور علماء کا اس بارے میں موقف، تفسیر اشاری اور تفسیر باطنی میں فرق اور عجائب تفاسیر کے بیان میں ہے۔

۸۔ فصل ہشتم: منقول، معقول اور اشاری تفاسیر کی مشہور کتب اور کتب تفسیر کی خصوصیات کے بیان میں ہے۔

۹۔ فصل نہم: قرآن کے ترجمہ کے جواز وعدم جواز اور ترجمہ کے جواز کی شرائط کے

بیان میں ہے۔

۱۰۔فصل دہم: قرآن کریم کے سات حروف پر نزول، قراءات سبعہ مشہورہ، اور صحابہ وتابعین میں مشہور قراء ومفسرین کے بیان میں ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو خالص اپنی ذات اقدس کے لئے بنادے اور ہمارے مسلمان بھائیوں کو اس سے نفع پہنچائے اور اپنی واضح کتاب کے مطابق نیک عمل کی توفیق عنایت فرمائے تاکہ یہ ہمارے لیے یوم حساب میں ذخیرہ ہو، کہ جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ ہی اولاد مگر یہ کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے پاس صاف دل لے آیا اور اللہ ہی ہمارے لیے کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔

یکم رجب المرجب بمقام مکہ مکرمہ۔۱۴۰۸ھ
بقلم خود خادم الکتاب والسنۃ
شیخ محمد علی صابونی
استاذ جامعہ ام القریٰ مکہ مکرمہ

مقدمہ طبع رابع

الحمد لله الذی انزل علیٰ عبده الكتاب ولم يجعل له عوجا، والصلاة والسلام علیٰ عبده ورسوله المبعوث هادياً ورحمة للعالمين فكان نعم المبلغ للرسالة ونعم المودی للامانة وكان رووفا رحيماً، وبعد!

قرآن کریم یہ ایک ابدی معجزہ اور آسمانی کتابوں میں وہ آخری کتاب ہے جس میں باطل نہ تو آگے سے دخل انداز ہوسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، مسلمانوں نے شروع ہی سے قرآنِ کریم کے ساتھ انتہائی اہتمام واکرام کا معاملہ فرمایا ہے، اور اس کی قرآت وحفظ، تعلیم وتفسیر، اس کے پوشیدہ معانی ورموز کا اظہار، اس کی تفسیر وتاویل کی مختلف صورتوں کی وضاحت اور اسبابِ نزول وتدوین کی تاریخ کی معرفت مسلمانوں کا مطمح نظر رہا ہے۔

تہذیب وتمدن کا قافلہ جب ترقی کی طرف بڑھا تو علوم وفنون کی بہت سی قسمیں بن گئیں، اور ہر نوع وقسم اپنے دائرے ہی میں چلنے لگی، علوم قرآن کا فن بھی اسی علمی ترقی اور فنی تقسیم کا نتیجہ ہے، اس موضوع پر قدیم وجدید دور میں ہزاروں کتابیں لکھی گئی ہیں، اور یہ کتاب ''التبیان فی علوم القرآن'' درحقیقت ان تقاریر ودروس کا مجموعہ ہے جو میں نے جامعۃ ام القریٰ کے طلبہ کے سامنے پیش کئے تھے، اس کے بعد میں نے ان دروس کو مرتب کر کے افادۂ عامہ کی خاطر شائع کر دیا، اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو قبولیتِ عامہ عطا فرمائی اور پورے عالم میں اس کی اشاعت ہونے لگی ہے، سعودی عرب کے علاوہ بھی لوگ اسے مختلف ممالک میں چھپوانے لگے ہیں، پاکستان میں بھی بعض لوگوں نے اس کی طرف توجہ فرمائی اور اسے طبع فرمایا ہے، طلبہ وعلماء کے لئے نافع اور مفید پایا ہے اور اسے استحسان کی نظر سے دیکھا ہے۔

مکتبۃ البشریٰ کی انتظامیہ نے چونکہ دینی کتابوں کو بہترین اور عمدہ شکل میں شائع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لی ہے اس لئے وہ اس کتاب کی طباعت کی طرف بھی متوجہ ہوئے اور طبع رابع میں ترتیب کے اندر بعض مناسب تبدیلیاں کر کے اسے شائع کیا، ان تبدیلیوں کو بعض علماء (حضرت مولانا ولی خان المظفر صاحب زید مجدہ) نے قارئین کے لیے نافع اور مفید سمجھا ہے، مجھ سے اس سلسلہ میں مشورہ بھی کیا، موبائل کے ذریعے مجھ سے مسلسل رابطہ میں رہے، لہٰذا اس کتاب میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں کی گئی ہیں:

فصول کی نئی ترتیب۔

علامات ترقیم میں مناسب تبدیلی۔

مشکل کلمات کی حاشیہ میں توضیح۔

کتاب کی احادیث کی تخریج۔

ہر صفحہ پر رئیسی اور فروعی عنوانات کا اضافہ۔

اور اصل کتاب میں طبع ثالث پر کوئی زیادتی اور تبدیلی نہیں کی گئی۔

آخر میں صدرِ وفاق المدارس العربیۃ پاکستان اور وفاق کے مسئولین کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو علوم قرآن کے مضمون میں نصاب میں داخل فرمایا ہے، نیز اصحاب مکتبۃ البشریٰ کا بھی شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کو عمدہ ورق اور بہترین صورت میں طبع فرمایا ہے اور اس کتاب کے ساتھ بہت اہتمام کا معاملہ کیا ہے، جس کی وہ مستحق بھی تھی، میری اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ وہ ان سب کو اس عظیم الشان کام پر بہترین بدلہ عنایت فرمائے اور اللہ تعالیٰ ہی توفیق رحمت فرمانے والے ہیں۔

شیخ محمد علی صابونی

۱۴۳۰ھ

حالاتِ مصنف

پیدائش اور خاندان: شیخ محمد علی صابونی ۱۹۳۰ء میں شام کے مشہور شہر حلب میں پیدا ہوئے اس شہر کے پتھروں کا رنگ سفید ہونے کی وجہ سے اسے ''حلب الشھباء'' کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے، آپ کا خاندان نہایت معزز اور ممتاز علمی خاندان ہے، آپ کے والد حلب کے بڑے علماء میں سے تھے۔

ابتدائی تعلیم وتربیت: ابتدائی تعلیم آپ نے اپنے والد بزرگوار شیخ جمیل رحمۃ اللہ سے حاصل کی، عربی کتابیں، علم فرائض اور بعض دیگر ابتدائی علوم اپنے والد سے پڑھے، اور وہیں علاقہ کے مکتب میں نوعمری ہی میں حفظ قرآن بھی مکمل کرلیا جبکہ آپ درجہ ثانویہ کے طالب علم تھے۔

بچپن ہی سے آپ کو علم دین کے حاصل کرنے کا بہت شوق تھا، مساجد ومکاتب کے اندر علماء کے دروس ومواعظ میں اہتمام سے شریک ہوتے، متعدد علوم دینیہ کے حصول کے لئے شام کے کبار علماء کے سامنے زانوئے تلمذ طے کیا، آپ کے اساتذہ میں چند مشہور علماء کے نام یہ ہیں۔

۱۔ شیخ محمد نجیب سراج (عالم الشہباء)

۲۔ شیخ احمد شماع،

۳۔ شیخ محمد سعید ادلبی،

۴۔ شیخ راغب طبّاخ،

۵۔ شیخ القراء شیخ محمد نجیب خیاطہ وغیرہ۔

تعلیمی زندگی: آپ نے درس نظامی کی تکمیل حکومتی مدارس میں کی، درجہ ابتدائیہ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کامرس کالج میں داخلہ لیا، لیکن ایک سال ہی آپ نے گزارا تھا کہ آپ کی طبیعت اس تعلیم سے اچاٹ ہوگئی، کیونکہ وہاں طلبہ کو بینکوں میں رائج سودی معاملات

وکاروبار کے اصول وضوابط کی تعلیم دی جاتی تھی، اس لئے آپ نے اس کالج کو خیر آباد کہہ کر حلب ہی میں ایک شرعی کالج میں دینی تعلیم کے لئے داخلہ لیا، حالانکہ وہاں آپ سب طلبہ پر فائق اور پوزیشن ہولڈر تھے، شرعی کالج خسرویہ آکر آپ نے دینی علوم تفسیر، فقہ، حدیث، اصول، اور فرائض وغیرہ میں بھی کامل دسترس حاصل کی، اور ساتھ ساتھ علوم کیمیا، فزکس، الجبرا، ریاضی، جغرافیا اور تاریخ اور انگریزی وغیرہ کو بھی پڑھا، اور یوں آپ نے یہاں رہ کر مختصر سے عرصہ میں دینی اور عصری علوم دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا، شرعی کالج سے آپ کی فراغت ۱۹۴۹ء میں ہوئی۔

ثانویہ شرعیہ امتیازی نمبروں سے پاس کرنے کے بعد وزارت اوقاف شام نے اپنے خرچہ پر آپ کو قاھرہ میں جامعہ ازھر میں یونیورسٹی کی تعلیم کے لئے بھیجا اور ۱۹۵۲ء میں آپ نے وہاں سے شریعت کالج کی ڈگری اعلیٰ نمبروں سے حاصل کی۔ اور پھر دو سال تک درجہ تخصص فی القضاء الشرعی کی تعلیم حاصل کی، اور ۱۹۵۴ء میں آپ نے قضاء کی سند فراغت پائی، اس زمانہ میں یہ سند آج کی پی، ایچ، ڈی، کی ڈگری کی مساوی تھی، اور سب سے اعلیٰ سند شمار کی جاتی تھی، آپ نے یہاں بھی درجہ امتیاز کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

وظائف واعمال: جامعہ ازھر سے فرغت کے بعد آپ اپنے شہر واپس آگئے اور یہاں آپ کو ثانویات اور معلمین کورس میں اسلامی کلچر کے گھنٹہ کا لیکچرار، اور استاذ مقرر کر دیا گیا۔

۱۹۵۵ء سے لیکر ۱۹۶۲ء تک مسلسل آٹھ سال یہاں تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے، اس کے بعد شام کی وزارت تعلیم کی طرف سے آپ کو اپنا سعودی عرب کے لئے نمائندہ اور مندوب بنا کر بھیجا گیا، تاکہ آپ وہاں جامعہ ام القری مکہ مکرمہ کے ''کلیۃ الشریعۃ والدراسات الاسلامیۃ'' اور ''کلیۃ التربیۃ'' میں تدریس کی ذمہ داری سنبھالیں، اور آپ نے یہاں تقریباً اٹھائیس سال تک تدریس کی، جامعہ اُم القری کے بہت سے اساتذہ نے اس طویل عرصہ میں آپ سے تعلیم حاصل کی، جامعہ اُم القری نے تصنیف وتالیف میں آپ کی علمی سرگرمیاں دیکھتے ہوئے ''مرکز البحث الاسلامی واحیاء التراث الاسلامی'' کی بعض کتابوں پر تحقیقی کام کے لئے علمی باحث ومحقق کا منصب آپ کے سپرد کر دیا، اسی دوران آپ نے امام ابوجعفر نحاس متوفی ۳۳۸ھ کی تفسیر معانی القرآن کے مخطوطے پر تحقیقی

کام شروع کیا اور چھ جلدوں میں وہ اعلی تحقیق کے ساتھ ''مرکز البحث العلمی واحیاء التراث الاسلامی'' سے جامعہ اُم القری کے نام پر طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

اس کے بعد آپ ''رابطۃ العالم الاسلامی'' کے ''ھیئۃ الاعجاز العلمی فی القرآن والسنۃ'' کے ایڈوائزر مقرر کیے گئے، وہاں بھی آپ نے چند سال تک کام کیا۔

تالیفات وتصنیفات: آپ بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، آپ کی تالیفات تینتیس کے عدد سے بھی بڑھ چکی ہیں، آپ کی کتابوں کو پوری دنیائے اسلام میں پذیرائی حاصل ہے، آپ کی بعض کتابوں کے مختلف زبانوں ترکی، انگریزی، فرانسیسی، ملاوی، اردو وغیرہ میں ترجمے بھی ہو چکے ہیں، آپ کی چند مشہور کتابیں یہ ہیں:

۱-صفوۃ التفاسیر
۲-مختصر تفسیر ابن کثیر
۳-التفسیر الواضح المیسر
۴-فقہ العبادات فی ضوء الکتاب والسنۃ
۵-فقہ المعاملات فی ضوء الکتاب والسنۃ
۶-موقف الشریعہ الغراء من نکاح المتعہ
۷-النبوۃ والانبیاء
۸-روائع البیان فی تفسیر آیات الاحکام من القرآن
۹-قبس من نور القرآن الکریم
۱۰-حرکۃ الارض ودورانہا حقیقۃ علمیۃ اثبتھا القرآن
۱۱-المواریث فی الشریعۃ الاسلامیۃ
۱۲-من کنوز السنۃ
۱۳-السنۃ النبویۃ قسم من الوحی الالٰھی المنزل
۱۴-موسوعۃ الفقہ الشرعی المیسر
۱۵-الزواج الاسلامی المبکر سعادۃ وحصانۃ
۱۶-الھدی النبوی الصحیح فی صلاۃ التراویح

۱۷-التبیان فی علوم القرآن وغیرہ

مواعظ ودروس: ان تصنیفی کاموں کے علاوہ آپ کی علمی سرگرمیاں مواعظ ودروس کی شکل میں بھی جاری وساری ہیں، مکہ مکرمہ میں آپ کا یومیہ درس بھی ہوتا ہے، جس میں فقہی مسائل ذکر کئے جاتے ہیں، اور ایک درس کی مجلس جدہ کی مسجد میں ہفتہ وار بھی ہوتی ہے۔ جس میں آپ درس قرآن دیتے ہیں، آٹھ سال سے یہ سلسلہ بھی جاری ہے، جس میں تقریبا دوتہائی قرآن کی تفسیر بیان ہو چکی ھے، اور یہ دروس ریکارڈ شدہ بھی دستیاب ہیں، اسی طرح میڈیا پر بھی آپ نے چھ سو مجالس میں پورے قرآن کی تفسیر بیان کی ہے۔

خصوصی ایوارڈ واعزاز: علمی، تحقیقی اور تجدیدی میدان میں آپ کی گراں قدر خدمات کے صلے میں آپ کو ''جائزہ دبی للقرآن الکریم'' کے گیارہویں اجلاس میں ''شخصیت اسلامیہ'' کا خصوصی ایوارڈ بھی دیا گیا ہے جو عالم اسلام کی ممتاز شخصیات کو اعزازی طور پر دیا جاتا ہے۔

سید عطاء الرحمن
جامعہ فاروقیہ کراچی

علوم قرآن تاریخ کے آئینہ میں

قرآن مجید بنی آدم کے لئے خدا کا آخری پیغام اور قیامت تک کے لئے صحیفہ رشد وہدایت ہے۔ اور مخلوق کی اصلاح کے لئے رب کائنات کی طرف سے اتارا گیا ایک دستور حیات اور آسمانی ہدایت نامہ ہے، اسلام اپنے عقائد وعبادات، احکام ومسائل، آداب واخلاق، قصص ومواعظ اور علوم ومعارف میں اسی ربانی کتاب کا سہارا لیتا ہے، اور یہی وہ روحانی قوت ہے جس نے آتے ہی دنیا کے علمی، عملی مذہبی اور معاشرتی جغرافیہ کو یک دم بدل ڈالا اور جہالت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے کو اپنی نورانیت سے دھوڈالا اور اہل دنیا میں زندگی کی ایک نئی روح پھونکی اور انہیں دنیا میں رہنے کا ڈھنگ اور طریقہ سکھایا۔

یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے مسلمانوں کو قرآن مجید سے بڑا شغف رہا ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اصل منصب قرآن مجید کی آیتوں کی تلاوت اوران کے ذریعے نفوس انسانی کی تربیت وتزکیہ اوران کے احکام وقوانین کی تعلیم وتلقین تھا،

ارشاد ربانی ہے: ﴿هو الذي بعث..........﴾ (سورة الجمعه: ۲)

ترجمہ: وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جوان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اوران کو پاک کرتے ہیں اوران کو کتاب اور دانشمندی کی باتیں سکھاتے ہیں۔

علوم قرآن کا عہد اولیٰ: آپ ﷺ نے اس پیغام الٰہی کو لوگوں تک پہنچانے کا کام پوری ذمہ داری سے انجام دیا، اور صحابہ کرام کی تربیت وتزکیہ میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، آپ ﷺ کا وجود مبارک خود قرآن پاک کی عملی تصویر تھا، آپ ﷺ صحابہ کو قرآن پاک پڑھنے پڑھانے کی تلقین فرماتے رہتے تھے، اور صحابہ کرام خود بھی قرآن پاک سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے، اوراس کو سمجھنے اوراس پر عمل کرنے میں کوئی کوتاہی نہ ہونے دیتے تھے، لیکن ان کو قرآن مجید کا مدعا اور مقصد سمجھنے میں زیادہ دشواری بھی نہیں ہوتی تھی، کیونکہ قرآن

انہی کے اسلوب وبیان میں نازل ہوا تھا، ان حضرات کے سینے قرآنی علوم ومعارف کے خزینہ تھے، آپ ﷺ اپنے قول وعمل اور تقریر سے قرآنیات کی تعلیم دیتے رہے، اور صحابہ کرام ان علوم ومعارف کو اپنے قلوب میں ذخیرہ کرتے رہے، ان کو جمع کرنے میں انہیں تدوین وتالیف کی ضرورت پیش نہ آئی، کیونکہ قوت حافظہ، پاکیزگی، نفس، بلاغتِ کلام اور دیگر تمام عمدہ خصوصیات کے پائے جانے کی وجہ سے ان علوم کے ضیاع کا خدشہ نہ تھا، اور ساتھ ساتھ آلاتِ کتابت وطباعت بھی مفقود تھے، نیز آپ ﷺ نے ابتداء میں غیر قرآن کو لکھنے سے منع بھی فرمادیا تھا، کہ قرآن اور غیر قرآن کا آپس میں التباس نہ ہوجائے، چنانچہ پہلی صدی تک علومِ قرآن علوم حدیث کی طرح سینہ بسینہ چلتے رہے، تاہم قرآن وسنت کی نشرواشاعت بھرپور طریقے سے تلقین وتعلیم کی صورت میں جاری وساری تھی، پھر عہد عثمانی میں اسلامی سلطنت کا دائرہ حد درجہ وسیع ہوگیا، اور جب عرب وعجم کا اختلاط ہوا تو عربی صفات وخصائص میں کمی آنے لگی، حافظے کمزور پڑ گئے، اختلاف کی فضا پیدا ہوگئی، حتیٰ کہ قرآن میں بھی لوگ جھگڑنے لگے جس پر حضرت عثمانؓ نے ایک ہی مصحف میں تمام قرآن کو جمع کرنے کا شاہی فرمان صادر فرمایا اور اسی کی کتابت وقراءت کو حرفِ آخر قرار دیا، اور یوں ''علم الرسم العثمانی'' یا ''علم رسم القرآن'' وجود میں آیا، پھر حضرت علی رضی اللہ تعالی عنہ کا دور آیا اور انہوں نے جب عجمیت کو عربیت پر غالب آتے دیکھا اور قرآن میں لوگوں کی اعرابی غلطیوں کا مشاہدہ فرمایا تو اپنے خاص شاگرد ابوالاسود دئلی کو چند قوانین وضع کرنے کا حکم صادر فرمایا اور یوں ''علم اعراب القرآن'' کی بنیاد پڑی۔

خلافت راشدہ کا دور مکمل ہوا اور بنوامیہ کا دور آیا، اس وقت تک کبار صحابہ رضی اللہ تعالی عنہم اور مشاہیر تابعینؒ علوم قرآن کی نشرواشاعت میں مصروف تھے، لیکن یہ مشغولیت صرف روایت وتلقین تک محدود تھی، کتابت وتدوین کی طرف توجہ نہ تھی، خلفاء اربعہ، حضرت ابن عباس، ابن مسعود، زید بن ثابت، ابوموسی اشعری اور عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ قرآن کی خدمت میں نمایاں افراد تھے، اور تابعین کے سرخیل حضرت مجاہد، عطاء، عکرمہ، قتادہ، حسن بصری، سعید ابن جبیر اور زید بن اسلم رحمہم اللہ تھے، یہی حضرات ''علم تفسیر''، علم اسباب نزول''، ''علم ناسخ ومنسوخ'' اور ''علم غریب القرآن'' وغیرہ کے مؤسسین

شمار ہوسکتے ہیں۔

علوم قرآن کا عہد ثانوی: دوسری ہی صدی میں علوم وفنون سینوں سے کاغذ پر منتقل ہونا شروع ہو گئے، صدور سے سطور کی طرف اترنے کی راہ ہموار ہوئی تو سب سے پہلے لوگوں کی توجہ علوم قرآنیہ کو زیب قرطاس کرنے کی طرف ہوئی، علوم قرآن میں بھی علم تفسیر چونکہ بنیادی حیثیت کا حامل اورام العلوم القرآنیہ کا درجہ رکھتا تھا، اسی لئے ان کی خدمت میں پہل ہوئی، علم تفسیر کے ابتدائی شہسوارانِ قلم میں:

شعبہ بن حجاجؒ، سفیان بن عیینہؒ اور وکیع بن جراح کا نام نامی لیا جاتا ہے، یہ دوسری صدی کے علماء میں سے ہیں، اس کے بعد: علاء ابن جریر طبری متوفی ۳۱۰ھ کی آمد بابرکت ہوئی اور ایک شاندار اور عظیم الشان تفسیر وجود میں آئی، ان کی تفسیر کو جامعیت کے پیش نظر اس موضوع میں ابتدائی تصنیف کہا جاسکتا ہے، اسکے بعد پھر بے شمار و بے حساب تفاسیر وجود میں آئیں، آرہی ہیں اور آتی رہیں گی، تفسیر کے علاوہ دوسرے علوم قرآنیہ بھی زیر تحریر آنے لگے، لہذا تیسری صدی شیخ بخاری علی بن مدینیؒ نے ''اسباب النزول'' اور ابوعبید قاسم بن سلامؒ نے ''ناسخ ومنسوخ'' کے موضوع کو زیر قلم لایا، ابوبکر سجستانی نے ''غریب القرآن'' میں تصنیف فرمائی، یہ چوتھی صدی کے علماء میں سے ہیں، پانچویں صدی کے علماء میں سے علی بن سعید حوفیؒ آگے بڑھے اور ''اعراب القرآن'' کو سطور میں منتقل کیا، علامہ سہیلی ابوقاسم عبدالرحمن نے ''مبہات القرآن'' کے موضوع کو تحریر کے سانچہ میں ڈھالا، یہ چھٹی صدی کے عالم ہیں، اور ''مجاز القرآن'' میں ابن عبدالسلام اور ''علم قراءات'' میں علامہ سخاوی نے خامہ فرسائی فرمائی، اور یہ دونوں حضرات ساتویں صدی کے علماء میں سے ہیں۔

اور اس کے بعد پھر مسلسل علوم قرآن کی تصنیفات میں وسعت آگئی، اور ہر پہلو سے اس کی خدمت ہونے لگی اور دن بدن یہ علم ترقی کرتا گیا، اور ہر کوئی اپنی استعداد کے بقدر اس بحرِ ذخار میں غوطہ زنی کر کے چمکتے دمکتے موتی چننے لگا۔ اور زمانہ تو فنا ہوجائے گا لیکن اس مقدس کلام کے معارف واسرار روزِ اول کی طرح تر وتازہ رہیں گے!

علوم قرآن کا عہد اصطلاحی: ہمارے اسلاف واکابر کا علوم قرآن کی تالیفات میں طریقہ کار استیعاب واستقصاء کار ہا کہ انہوں نے علوم قرآن کی جس نوع کو بھی زیر بحث لایا

تو اس کی ایک ایک جزئی پر سیر حاصل کلام فرمایا، مثلاً اگر کسی نے ''غریب القرآن'' کے موضوع کو لیا تو قرآن کا کوئی مفرد جس میں ابہام یا غرابت ہو، ان کے قلم کی آغوش سے دور نہ رہا، اور اگر کسی نے ''مجاز القرآن'' پر لکھا ہے تو قرآن میں کوئی لفظ مجازی ان کی دور رس نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔

اور یہی حال علوم قرآن کی ہر نوع کی تصنیف میں رہا، اور ظاہر بات ہے کہ ان تمام علوم کا احاطہ اپنی مختصر سی زندگی میں کسی انسان کے بس کی بات نہیں، لہٰذا اسی وجہ سے علماء نے ان تمام علوم تک رسائی کے لئے ایک علم حدیث کا استخراج فرمایا تاکہ وہ ان علوم کے لئے فہرست یا گائیڈ بک کا کام دے اور اس کا نام ''علوم القرآن'' تجویز فرمایا۔

چوتھی صدی کے اواخر اور پانچویں صدی کے اوائل میں علی بن ابراھیم کوفیؒ متوفی ۴۳۰ھ کی تفسیر ''البرھان فی علوم القرآن'' کو اصطلاحی علوم قرآن'' کی پہلی کڑی قرار دیا جاسکتا ہے، یہ تفسیر تیس جلدوں میں لکھی گئی ہے، اس میں علوم قرآن کی انواع سے سیر حاصل بحث موجود ہے، لیکن یہاں ہر نوع سے بحث مرتب طور پر موجود نہیں ہے کہ ہر ایک نوع کو ایک ہی مقام پر ذکر کر کے اسے نظائر و امثلہ سے واضح کیا گیا ہو، بلکہ منتشر طور پر'' علوم قرآن'' کی مختلف انواع کا تذکرہ ہے کہ ہر آیت کے تحت جس جس نوع کا تعلق ہوسکتا تھا اسے بھی آیت کی تفسیر و تشریح کے ساتھ ساتھ زیر بحث لایا گیا ہے۔

چھٹی صدی میں علامہ ابن جوزیؒ متوفی ۵۹۷ھ آکاش علوم قرآن پر ایک درخشندہ ستارہ بن کر ابھرے اور خاص علوم قرآن کے موضوع پر دو شاہکار تصانیف تحریر فرمائیں، ایک کا نام ''فنون الافنان فی علوم القرآن'' اور دوسری کا نام ''المجتبیٰ فی علوم تتعلق بالقرآن'' ہے۔

ساتویں صدی میں علامہ علم الدین سخاویؒ متوفی ۶۴۱ھ نے ''جمال القراء'' اور شیخ ابو شامہؒ متوفی ۶۶۵ھ نے ''المرشد الوجیز فیما یتعلق بالقرآن العزیز'' اس موضوع کی مناسبت سے تصنیف فرمائیں۔

آٹھویں صدی میں علامہ بدرالدین زرکشی متوفی ۷۹۴ھ نے بھی ایک کتاب ''البرھان فی علوم القرآن'' کے نام سے تصنیف فرمائی۔

نویں صدی اس علم کے لئے انتہائی اہم اور بابرکت ثابت ہوئی، علامہ محمد بن سلیمان

کافیجیؒ متوفی ۸۷۳ھ نے ایک کتاب کا اضافہ فرمایا، علامہ جلال الدین بلقینیؒ متوفی نے بھی ''مواقع العلوم من مواقع النجوم'' کے نام سے اس موضوع پر ایک وقیع تصنیف فرمائی، جس کے اندر تقریباً علوم قرآن کی پچاس انواع کا تذکرہ فرمایا، پھر اسی صدی میں علامہ سیوطی متوفی ۹۱۱ھ اس علم کے آسمان پر ایک چمکتے دمکتے سورج بن کر طلوع ہوئے اور ''التحبیر فی علوم التفسیر'' تحریر فرمائی، اور علامہ بلقینیؒ کی ذکر کردہ انواع کو بھی لائے اور ساتھ ساتھ مزید ان سے دگنی انواع اور فوائد کو بھی ذکر فرمایا، اور یوں ایک مسودہ انواع علوم قرآن کو اپنی اس کتاب میں جگہ دی، لیکن اس عظیم خدمت کے باوجود ان کی طبیعت اس پر قناعت کرنے کیلئے آمادہ نہ ہوئی، اور مزید تبحر وتوسع اور حسن ترتیب کے متمنی رہے، اور بالآخر ''الاتقان فی علوم القرآن'' کی گراں قدر تصنیف امت کے سامنے لاکر اپنی دیرینہ خواہش کی تکمیل بھی فرمائی اور اس علم پر ایک نہ بھلایا جانے والا احسان بھی فرمایا، نہ تو اس سے پہلے اس موضوع پر اس جیسی تالیف کسی صاحب قلم نے تحریر فرمائی اور نہ ہی بعد میں آنے والے اہل علم اس تصنیف سے خوشہ چینی سے دور رہ سکے، علامہ سیوطیؒ اس علم کے وہ شہسوار ہیں نہ تو پہلے ہمیں کوئی ان کا ہم پلہ نظر آتا ہے اور نہ ہی اب تک کوئی ان کی ہمسری کا دعوی کر سکا، اللہ تعالی انہیں سب مسلمانوں کی طرف سے بہترین بدلہ عنایت فرمائیں۔ آمین

علوم قرآن زمانہ حاضر میں: اس سلسلہ میں ہمارے علمائے سلف نے متاخرین کیلئے کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑی تھی، انہوں نے قرآنی علوم کے کسی گوشہ کو تشنہ نہیں رہنے دیا ان میں سے ہر پہلو پر کھل کر بحث کی تھی، بعد میں آنے والے حضرات نے صرف منتشر اقوال کو یکجا کرنے یا مبہم باتوں کی وضاحت کرنے یا راجح رائے کو سامنے لانے تک اپنی محنت کو محدود رکھا، اور کافی عرصہ تک اس میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہ ہوسکا، البتہ ملحدانہ طرز فکر اور ادبی واجتماعی اسلوب وانداز اور نئی ترقی نے کئی نئی مباحث کو جنم دیا اور مستشرقین وملحدین کے وساوس وشکوک اور نام نہاد تحقیق کے پردے میں اسلام کی بیخ کنی کے جواب میں علمی وتحقیقی ابحاث بھی علوم قرآن کے دائرے میں داخل ہوگئیں۔

بیسویں صدی قرآنیات کے حوالہ سے بہت ممتاز اور نمایاں ہے، عرب وعجم کے علماء نے اس صدی میں علوم قرآن کے ذخیرے میں گراں قدر اضافہ فرمایا، عرب کے علماء میں

شیخ طاهر جزائری، علامہ محمود ابو دقیقہ، شیخ محمد علی سلامہ، شیخ محمد بخیت، علامہ طنطاوی جوھری، شیخ مصطفی المراغی، علامہ محمد عبید اللہ دراز وغیرہ کی تصنیفات قرآنیات کے میدان میں معروف ہیں، علامہ محمد عبید العظیم زرقانی رحمہ اللہ کی ''مناھل العرفان فی علوم القرآن'' اس صدی کی قرآنی علوم کے باب میں ایک وقیع اور شاندار تصنیف ہے، جو ہر لائبریری کی زینت اور ہر باحث قرآن اور قرآنی علوم کے متلاشی کی علمی سیرابی کے لئے ضروری اور کافی ووافی ہے، اور شیخ محمد علی صابونیؒ زید مجدہ کی تقاریر و دروس کا مجموعہ ''التبیان فی علوم القرآن'' بھی موجودہ ایام کا قابل ذکر سرمایہ ہے، جس میں علمی طرز و انداز بھی ہے، عرض قدیم وجدید قرآنی ابحاث کا سہل وشیریں اور تحققانہ مختصر وجامع مجموعہ ہے، اردو میں اس پر کافی کام لیا گیا ہے، مولانا شمس الحق افغانی اور مفتی تقی عثمانی زید مجدہ کی ''علوم القرآن'' قابل ذکر ہیں، مفتی صاحب زید مجدہ کی تصنیف محققانہ طرز کلام اور ادیبانہ اسلوب بیان کی بنا پر انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔

خلاصۂ کلام: علوم قرآن پہلی صدی تک سینہ بہ سینہ چلتے رہے اور تعلیم وتلقین کی حد تک محدود تھے، دوسری صدی سے صدور اکابر سے نکل کر کاغذ پر نقوش بن کر ابھر کر شروع ہوئے، یہ علوم قرآن کی (معنی اضافی کے اعتبار سے یعنی ہر وہ علم جس پر قرآن دال پر اور وہ قرآن کا خادم اور اس کی طرف منسوب ہو خواہ مدون ہو یا غیر مدون علوم قرآن بالمعنی میں داخل ہے) تدویں کا ابتدائی زمانہ تھا، چوتھی صدی کے اواخر اور پانچواں صدی کے اوائل میں علامہ حوفیؒ کے ہاتھوں علوم قرآن ایک فن (اس سے مراد وہ مباحث قرآنیہ ہیں جن کا تعلق قرآن کریم سے نزول وترتیب، جمع وکتابت، قراءات وتفسیر، ناسخ ومنسوخ، اعجاز واسباب نزول اور دفع شبہات وغیرہ کے اعتبار سے ہو) مدوّن کی حیثیت سے ظاہر وآشکارا ہوا، چھٹی اور ساتویں صدی میں علامہ ابن جوزیؒ، علامہ سخاویؒ اور شیخ ابوشامہؒ کی گود میں اس نے تربیت پائی، آٹھویں صدی میں علامہ زرکشیؒ کی رعایت سے لہلہانا شروع ہو، نویں صدی میں علامہ کافیجیؒ اور بلقینیؒ کی خصوصی عنایت سے وہ اپنے دور شباب میں داخل ہوا اور اس نے قوت ومضبوطی پائی، اور نویں صدی کے آخر اور دسویں صدی کے آغاز میں اس میدان سے یہ علم خوب پھلا پھولا، ابھرا، چمکا اور ایک تناور درخت کی صورت اختیار کی، اور ان کے جانے

کے بعد پھر اس کی نشوونمارک گئی، اور اب بیسویں صدی سے دوبارہ اس کی تروتازگی لوٹنے لگی ہے، اور پھلنے پھولنے لگا ہے، امید ہے کہ اللہ تبارک وتعالی دوبارہ اس کو اپنی حالت حسنہ پر لے آئیں اور امت کو اس سے بھرپور استفادہ کا موقع عنایت فرمائیں۔آمین

سید عطاء الرحمن
(استاذ) جامعہ فاروقیہ کراچی

کلماتِ بخاری

یہ ۱۴۲۶ھ کی بات ہے، شوال کا مہینہ تھا، مدارس کا تعلیمی سال شروع ہو چکا تھا، میں درجہ سابعہ کا طالبعلم تھا، ''التبیان فی علوم القرآن'' کا سبق ہمارا استاذ محترم مبلغ عربیت استاذ ادب وسنت حضرت مولانا ولی خان المظفر زید مجدہم کے پاس تھا، سبق کے لئے آتے ہوئے ملاقات ہوئی تو نہوں نے ''التبیان'' کا ترجمہ ضبط کرنے کا حکم دیا، علم وادب کے میدان میں شد بد نہ ہونے کے باوجود (حضرت کی شفقت ومحبت اور حوصلہ افزائی سے بھر پور حکم ٹالنے کی ہمت نہ ہوئی اور اس کام کو کرنے کا مضبوط داعیہ دل میں پیدا ہوا اور پھر ڈرتے جھجکتے اس کا عزم مصمم بھی کرلیا، اور اللہ تعالی کا نام لے کر استاذ محترم کے دروس کو سامنے رکھتے ہوئے اس کا ترجمہ کرنا شروع کردیا، اور اسی سال اللہ تعالی کے فضل وکرم سے ترجمے کا کام مکمل بھی ہوگیا، اور الفاروق اردو کے اس سال کے دو شماروں ربیع الاول اور ربیع الثانی میں اس کی تیسری فصل (قرآن کریم کے تدریجی نزول کی حکمتیں) کا قسط وار مکمل ترجمہ بھی شائع ہوا۔ پھر استاذ محترم نے یہ کام کمپوزنگ کے لئے مولانا بشیر صاحب کے سپرد فرمایا، اور اللہ تعالی ان کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے انتہائی اہتمام سے اس کی بعض فصول کی کمپوزنگ فرما کر میرے حوالہ کردی، اور میں نے اسے اپنے پاس کمپیوٹر میں محفوظ کردیا لیکن وائرس کی کرم نوازی سے وہ سارا کام غائب ہوگیا تو میں نے پھر خود اس کی کمپوزنگ کرنا شروع کی، لیکن وہ بھی وائرس کی نذر ہوگئی، اور یوں کبھی ہمت ٹوٹ جاتی اور کبھی دوبارہ جذبہ پیدا ہوتا، اور کام کرنے لگتا، اور کمپیوٹر سے ناواقفیت بھی آڑے آتی رہی اور کام روز بروز تاخیر کی طرف گامزن رہا، لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور آہستہ آہستہ گرتے پڑتے اسی آنکھ مچولی میں بالآخر کام مکمل کردیا، اس کے بعد یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ اگر کہیں عبارت مبہم ہے یا ناقص ہے یا اختصار کی بناء پر مخل بالفہم ہے تو اس کی وضاحت ہو جائے اور اگر کسی شبہ کا باعث ہوسکتی ہے تو اسے دور کردیا جائے، اس لئے تشریحی نوٹ حواشی کی صورت میں لکھنا شروع کیے، اور یہ کام بھی انتہائی دھیمی رفتار سے جاری رہا، اور ساتھ

ساتھ انہیں کمپوز بھی کرتا رہا، اور اللہ تعالی کی مددو توفیق یہ کام بھی انجام کار تکمیل تک پہنچ گیا۔

ترجمہ میں الفاظ کی رعایت کے ساتھ ساتھ اسے بامحاورہ بنانے کی بھی اپنی طرف سے پوری کوشش کی ہے، عبارت کی توضیح و تکمیل کے لئے بریکٹ میں مختصر اضافے بھی کئے گئے ہیں، اور جہاں مناسب سمجھا وہاں مفید حواشی بھی نقل کئے ہیں، اور جس کتاب سے حواشی لکھنے میں استفادہ کیا ہے، اس کا نام بھی آخر میں عموماً ذکر کیا ہے تاکہ بوقت ضرورت اس کی طرف مراجعت کی جاسکے، قرآنی آیات ترتیب اور نئی ترتیب میں فرق ہے، پرانی ترتیب میں کچھ سقم تھا جس کی وجہ سے استاذ محترم کے مشورہ سے اور مصنف مدظلہ کی اجازت کے بعد مکتبۃ البشری نے اسے نئی ترتیب کے ساتھ شائع فرمایا ہے، اور ترجمہ میں بھی اسی نئی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، لہذا اب نئی ترتیب میں فصول کی ترتیب کچھ یوں ہے:

پہلی فصل: علوم قرآن۔

دوسری فصل: قرآن کریم کے تدریجی نزول کی حکمتیں۔

تیسری فصل: اسباب نزول۔

چوتھی فصل پانچویں فصل: سات حروف پر نزول قرآن اور مشہور قرائتیں۔

پانچویں فصل: قرآن کریم میں نسخ اور اس کی تشریعی حکمت۔

چھٹی فصل: جمع قرآن۔

ساتویں فصل: تفسیر اور مفسرین۔

آٹھویں فصل: مفسریں تابعین۔

نویں فصل: اعجاز قرآن۔

دسویں فصل: قرآن کریم کے سائنسی معجزات۔

راقم کو اس سے پہلے تالیف و ترتیب کا کوئی تجربہ نہیں رہا، یہ تو استاذ محترم کی حوصلہ افزائی اور بھرپور تعاون کا نتیجہ ہے کہ نو آموز اور طفل مکتب ہونے کے باوجود ایک ناتواں قلم لے کر بندہ اس میدان میں کود پڑا ہے۔

تشجیع کی صفت رجال سازی کے لئے ایک اہم عامل اور سبب ہے، اسی وصف کے استعمال پر دوسرے کو اپنی اصطلاحیات اجاگر کرنے کا موقع ملتا ہے، اور کچھ کر گزرنے

کا داعیہ اور جذبہ پیدا ہوتا ہے، اور ہمارے علماء میں یہ صفت خال خال ہی نظر آتی ہے، لیکن استاذ محترم میں اس صفت کا مشاہدہ میں نے بدرجہ اتم کیا، آج اگر استاذ محترم کے بہت سے شاگرد و متعلقین شہسواران قلم ہیں تو وہ انہی کی حوصلہ افزائی کی مرہون منت ہیں، میرے ہاتھوں میں چلتا قلم بھی حضرت ہی کی نظر کرم کا اثر ہے، اگرچہ اپنی نادانی کی وجہ سے نہ تو ادب کے موتی چن سکا اور نہ ہی علمی رفعتوں کو حاصل کر سکا، جزی اللہ استاذ نا الموقر عنا و عن جمیع المسلمین!

ترجمہ کا میرا مقصد عربی سے ناواقف اردو داں طبقے کے سامنے ایک علمی ذخیرے اور گوہر بے بہا کی نقاب کشائی کرنی ہے جو عربی لبادہ کی وجہ سے ان حضرات کی نظروں سے اوجھل ہے، اور قرآنیات میں عصر حاضر کے مزاج کے مطابق ایک وقیع کام ہونے کے باوجود ان کے لئے اس سے استفادہ ناممکن ہے۔

ترجمہ و تسہیل درحقیقت تو استاذ محترم کے افادات و دروس ہی کا مجموعہ ہے، بندہ کی حیثیت تو صرف ایک جامع اور ناقل کی سی ہے، لیکن چونکہ قلم اس میں بندہ کا استعمال ہوا ہے اور احقر کی حیثیت بلکہ حقیقت ایک ادنی طالب علم سے زیادہ کچھ نہیں ہے اس لئے یہ آپ کے ایک ناتجربہ کار اور نووارد طالب علم بھائی کی ابتدائی کاوش ہے، اگر کسی بھی نوعیت کی کمی بیشی یا نقص نظر آئے تو بندہ کی کم علمی و بے مائیگی اور کم فہمی کی دلیل ہوگی، استاذ محترم کی قد آور شخصیت اس سے بالکل مبرا ہے۔

تصنیفی میدان میں غلطی کا واقع ہونا ایک امر واقعی ہے، یہ اللہ تعالی کی کتاب ہی کی صفت ہے کہ ہر غلطی سے پاک ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے یہ کتب تصنیف کی ہیں اور ان میں کوئی تقصیر و کوتاہی نہیں کی، لیکن ضروری ہے کہ ان میں غلطی پائی جائے کیونکہ فرمان باری تعالی ہے" (**ولو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافا کثیرا**) (سورۃ النساء: ۸۲) تو آپ میری کتابوں میں کوئی ایسی چیز پاؤ جو قرآن و سنت کے مخالف ہو تو میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔

ہم ان قارئین کا تہہ دل سے شکر گزار رہوں گے جو قابل اصلاح مقامات کی نشاندہی فرمائیں گے اور غلطی کی تصحیح میں ہماری مدد کریں گے۔

میں ان تمام حضرات کا نہایت ممنون ہوں جنہوں نے اس ترجمہ کے سلسلہ میں مجھ سے کسی بھی قسم کا تعاون اور حوصلہ فرمائی، اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو اپنی شان کے مطابق اجر عطا فرمائیں۔آمین

ترجمہ کے حسن وقبح کا فیصلہ اب ہم قارئین کے ہاتھ میں دیتے ہیں کہ وہ اس ترجمہ کو کس حد تک قبول کرتے ہیں؟ اور اسے ان کے ہاں کس قدر پذیرائی ملتی ہے! اور اس مجموعہ کو ان کے سامنے تقریظ کے لئے پیش کرتے ہوئے اللہ تعالی سے دعا گو ہے کہ وہ اس دینی خدمت کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما کر مقبولیت عامہ سے نوازے اور تمام مسلمانوں کے لئے فائدے اور مؤلف ومترجم ومرتب کے لئے ذخیرۂ آخرت بنائے۔آمین

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم والحمد لله الذی بنعمته الصالحات وصلی اللّی تعالی علی صفوة خیر البریة وعلی حملة اهم الذین ینفون عنه تحریف الغالین وانتحال المبطلین وتاویل الجاهلین، آمین یارب العالمین!

سید عطاء الرحمن بخاری
استاذ جامعہ فارقیہ کراچی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پہلی فصل

علومِ قرآن

تمہید: علم تفسیر ہم سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ہم علوم قرآن کے بارے میں کچھ واقفیت حاصل کریں اور اس بزرگ و برتر کتاب کے بارے میں عظیم الشان اہتمام، وسیع کوششوں اور وافر مقدار میں پائی جانے والی اُن ابحاث کو جانیں جو کہ اس کی خدمت کے سلسلہ میں اُن نابغۂ روزگار مشائخ اور جلیل القدر علماء نے سرانجام دی ہیں جنہوں نے نزول قرآن سے لیکر آج تک اس قیمتی خزانے اور مقدس ورثے کی حفاظت کے راستے میں اپنی زندگیاں خرچ کردیں، یہاں تک کہ وہ اللہ کے جوارِ رحمت کی طرف کوچ کر گئے، لیکن ہمارے لئے ایک ایسی بڑی علمی دولت وثروت چھوڑ گئے کہ رہتی دنیا تک اس کا (رواں دواں) چشمہ خشک ہونے والا نہیں اور نہ ہی اس کے (حِکَم و نصائح کے) موتی ختم ہونے والے ہیں، ان قدیم وحدیث تمام تر کوششوں کے باوجود قرآن حکیم اب بھی ایک بحرِ ناپیدا کنار کی طرح باقی ہے، اور اہلِ علم وبصیرت کو دعوت دے رہا ہے، اور ان کا متلاشی ہے کہ وہ اس کی (معانی ومفاہیم کی) گہرائیوں میں غوطہ زن ہوکر (حکم ونصائح کے) موتی نکالیں۔

اگرچہ قرآن مجید کی تعریف اور اس کے محاسن وفضائل کو فصحاء، بلغاء، حکماء اور شعراء نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر بیان کیا ہے مگر ہم رسالت مآب حضرت محمد بن عبداللہ ﷺ کی کی گئی تعریف سے زیادہ بلیغ اور اعلیٰ تعریف کسی کی نہیں پاتے۔

آپ ﷺ نے فرمایا: ''کتابُ اللّٰہِ فیه نبأُ مَن قَبلَکُم، وخبرُ مابعدَ کم، وحُکمُ ما بینکم۔ هو الفصلُ لیس بالهَزلِ، مَن ترَکَهُ مِن جُبَّارٍ قَصمَه اللّٰه، ومَنِ ابتغی الهُدیٰ في غیرِہ أَضلَّهُ اللّٰهُ، هو حَبْلُ اللّٰہِ المَتِینُ، وهو الذِکرُ الحکیم، وهو الصِراطُ المستقیمُ، وهو الذي لا تزیغُ به الأهواءُ، ولا تلتبِسُ به الألسنةُ، ولا یشبَعُ منه العلماءُ، ولا یخلَقُ علی کثرۃ الردِّ، ولا تنقضي عجائبُهُ، وهو الذي لم تَنتَهِ الجنُّ اِذْ سمعتْه حتی قالوا: ﴿انّا سمِعنا قُرانًا عَجَبًا یَهْدِيْ اِلی الرُّشد فامَنّا به﴾، مَن قال به صَدَقَ، ومَن عمِل به أجِرَ،

ومَن حکمَ به عَدَلَ، ومَن دعا الیه هَدٰی الی صراطٍ مستقیم"۔ ترجمہ: یہ اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب ہے، جس میں تم سے پہلے لوگوں کی خبریں اور بعد میں آنے والوں کے متعلق پیش گوئیاں ہیں، تمہارے مابین کے فیصلے ہیں، یہ دوٹوک ہے، مزاح نہیں ہے، جو متکبر اس کو چھوڑ دے گا، اللہ اس کی کمر توڑ دیں گے، جو اس کو چھوڑ کر کسی اور کتاب میں رہنمائی تلاش کرے گا، اللہ اس کو گمراہ کر دیں گے، یہی اللہ کی مضبوط رسی ہے، حکمتوں والی نصیحت ہے، یہی سیدھا راستہ ہے، یہی ہے جس کے ذریعے سے خواہشات نہیں بھٹکتیں، جس سے زبانوں میں اشتباہ پیدا نہیں ہوتا، اہل علم اس سے سیراب نہیں ہوتے، بہت پڑھے جانے پہ پرانی نہیں ہوتی، نہ ہی اس کے عجائب ختم موتے ہیں، یہ وہی کتاب ہے، جسے جنات سن کر یہ کہنے پر مجبور ہو گئے، ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے، جو ہدایت کی طرف بلاتا ہے، تو ہم اس پر ایمان لے آئے، جو قرآن کو مدنظر رکھ کر بولے گا، سچ بولے گا، جو اس پر عمل کرے گا اجر پائے گا، جو اس کے ذریعے فیصلے کرے گا، انصاف کرے گا، جس نے قرآن کی طرف بلایا اس نے صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کی۔

علومِ قرآن سے کیا مراد ہے؟ علوم قرآن سے مراد وہ مباحث ہیں جو کہ اس ابدی کتاب کے نزول وجمع، ترتیب وتدوین، اسبابِ نزول، سور قرآن کے مکی ومدنی ہونے، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ کی معرفت سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ دیگر وہ تحقیقات ہیں جو کہ قرآن پاک سے بلاواسطہ یا بالواسطہ متعلق ہیں۔

ان تمام مباحث وتحقیقات کا مقصد حضور اکرم ﷺ کی طرف سے کی گئی توضیح وبیان اور حضرات صحابہ وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آیات قرآنیہ سے متعلق تفسیری اقوال کی روشنی میں اللہ عزوجل کے کلام کی فہم ومعرفت، مفسرین کے تفسیری انداز واسلوب کے ساتھ ساتھ مشہور مفسرین کا بیان، ہر مفسر کی خصوصیات، تفسیر کی شرائط اور اس کے علاوہ علم تفسیر کے دیگر مسائل کو جاننا ہے۔

قرآن کی تعریف: "هو كلام الله المعجز، المنزل على خاتم الأنبياء والمرسلين، بواسطة الأمين جبريل عليه السلام المكتوب في المصاحف، المنقول الينا بالتواتر، المتعبد بتلاوته، المبدوء بسورة الفاتحة، المختتم بسورة الناس"۔

ترجمہ: "قرآن پاک مخلوق کو (معارضہ سے) عاجز کر دینے والا اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو کہ روح الامین حضرت جبریل علیہ السلام کے ذریعے حضور اکرم ﷺ پر

اتارا گیا ہے، مصاحف میں لکھا ہوا اور ہماری طرف تواتر کے ساتھ منقول ہے جس کی تلاوت عبادت ہے وہ سورۂ فاتحہ سے شروع ہو کر سورۂ ناس پر ختم ہوتا ہے"۔

یہ تعریف انتہائی جامع اور مانع ہے، اس پر تمام علماءِ اصول کا اتفاق ہے، قرآن پاک کو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول ﷺ پر اتارا، تاکہ یہ لوگوں کے لئے ایک دستورِ حیات، مخلوق کی راہنمائی کا ذریعہ، حضور اکرم ﷺ کی سچائی کی علامت، آپ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایک روشن دلیل اور قیامت تک رہنے والی ایک ایسی حجت ہو جو اس بات کی گواہی دے کہ یہ ایک حکیم ذات کی طرف سے اتری ہوئی کتاب ہے، بلکہ یہ ہمیشہ رہنے والا ایک ایسا معجزہ ہے جو رہتی دنیا تک آنے والی نسلوں اور قوموں کو معارضے کا چیلنج کرتا رہے گا۔ مصری شاعر احمد شوقی نے قرآن کی ابدیت کو کیا ہی خوب انداز میں بیان کیا ہے۔

جَاءَ النَّبِيُّوْنَ بِالْاٰيَاتِ فَانْصَرَمَتْ وَجِئْتَنا بِكِتَابٍ غَيْرِ مُنْصَرِم

"تمام انبیاء معجزات لے کر آئے مگر (ان کے آثار) مٹ گئے اور آپ ہمارے پاس ایک ایسی کتاب لے کر آئے جس کے آثار مٹنے والے نہیں"۔

اٰياتُهُ كُلَّمَا طَالَ الْمَدَى جُدُدٌ يُزَيِّنُهُنَّ جَمَالُ الْعِتْقِ وَالْقِدَمِ

"اس کی آیات طویل زمانہ گزرنے کے باوجود نئی اور تروتازہ ہیں قدامت و نفاست کا جمال ان کو زینت بخشتا ہے"۔

فضائلِ قرآن: قرآن اور اس کے علوم کے فضائل کے بارے میں بکثرت آثار مروی ہیں، ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جو قرآن کی تعلیم و تعلّم کی فضیلت سے متعلق ہیں اور کچھ اس کی تلاوت و ترتیل سے متعلق ہیں اور کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کا تعلق اس کے حفظ اور دہرانے سے ہے، اسی طرح کتاب اللہ میں بھی ایسی بہت سی آیات ہیں جو مؤمنین کو اس مقدس کتاب میں غور و فکر کرنے، اس کے (بیان کئے ہوئے) احکام کو نافذ کرنے، اس کو توجہ سے سننے اور اس کو پڑھے جانے کے وقت خاموش رہنے کی دعوت دیتی ہیں۔ ہم ان آیات و احادیث میں سے چند ذیل میں درج کرتے ہیں:

آیاتِ مبارکہ: ۱- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً يَّرْجُوْنَ تِجَارَةً لَّنْ تَبُوْرَ﴾ [الفاطر: ۲۹](۱)

---

(۱) قتادہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مطرف بن عبداللہ رحمہ اللہ جب اس آیت کی تلاوت کرتے تو فرماتے: "هٰذه آية =

"جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت (مع العمل) کرتے رہتے ہیں، اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں، اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماند نہ ہوگی"۔

۲-اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ [الأعراف: ۲۰۴]

"اور جب ہم نے قرآن پڑھا جایا کرے تو اس کی طرف کان لگا دیا کرو اور خاموش رہا کرو امید ہے کہ تم پر رحمت ہو (جلد یا مزید)"۔

۳-اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ [محمد: ۲۴]

"تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر تالے لگ رہے ہیں"۔

احادیث مبارکہ: ۱-حضور ﷺ نے فرمایا: "خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ" "تم میں سے سب سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے"۔ (۱)

۲-آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "اَلْمَاهِرُ بِالْقُرْآنِ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَرَةِ (۲)

= القراء" یہ قراء کی آیت ہے۔

(۱) جب قاری قرآن قرآنی آداب واعمال سے آراستہ ہوگا تب وہ ان لوگوں میں شمار ہوگا جن کو حضور اقدس ﷺ: "خیر کم من تعلم القران وعلمه" فرمارہے ہیں، ورنہ وہ ہرگز ہرگز اس فرمانِ عالی کے مصداق میں داخل نہیں۔

ابو عبدالرحمن عبداللہ بن حبیب سلمی رحمہ اللہ نے خلافتِ عثمان کے آخری ایام سے لے کر حجاج کے شروع کے دور تک قرآن مجید پڑھایا ہے، اور آپ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اسی حدیث نے (جامع مسجد کوفہ کے) اس مقام پر قرآن کریم کی تعلیم کے لئے بٹھا رکھا ہے۔ (صحیح بخاری، فضائل قرآن)

جس طرح یہ حدیث قراء و مُقرئین کو شامل ہے اسی طرح علماء، فقہاء اور محدثین بھی اس کے مصداق میں داخل ہیں، کیونکہ وہ حضرات بھی علوم قرآن ہی کے پڑھنے پڑھانے میں مشغول ہیں، لہٰذا یہ سبھی حضرات افضل الخلق وخیر الناس ہیں۔

(۲) الماهر: ماہر ایسے حاذق وکامل الحفظ کے معنی میں ہے جو اٹکتا نہ ہو، اور حفظ و اتقان کی عمدگی کی وجہ سے اس کو قرآن شریف کے پڑھنے میں ذرا بھی دقت ومشقت پیش نہ آتی ہو۔

السفرة: "سافر" "سفر" کی جمع ہے، اس سے پیغامبر فرشتے مراد ہیں، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے پیغامات لے کر اس کے بندوں کی طرف سفر کرتے ہیں، یا "سفرة" بمعنی "کاتبین" کے ہے۔

البررة: "برّ" کی جمع ہے، بمعنی "مطیعین" (فرمانبردار)۔

وَالَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَيَتَعْتَعُ فِيْهِ۔ أَيْ: تَصْعُبُ قِرَاءَتُه عَلَيْهِ لِعِيِّ لِسَانِه۔ وَهُوَ عَلَيْهِ شَاقٌّ لَهُ أَجْرَانِ"

''ماہرِ قرآن ان فرشتوں کی ہمراہی میں ہے[1] جو لکھنے والے اور بزرگ ونیکوکار ہیں، اور وہ شخص جو قرآن کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے (یعنی زبان کی عدمِ قدرت کی بنا پر تلاوتِ قرآن دشوار رہتی ہے) اور تلاوت میں دقت ہوتی ہے تو اس کے لئے دو ثواب ہیں''۔[2]

۳- آپ ﷺ نے فرمایا: "أَشْرَافُ أُمَّتِيْ حَمَلَةُ الْقُرْآنِ"[3]

''میری امت کے سربرآوردہ لوگ حاملینِ قرآن ہیں''۔

۴- حضور اکرم ﷺ کا ارشاد ہے: "اِقْرَأُوا الْقُرْآنَ فَإِنه يَأْتِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيْعاً لِأَصْحَابِه" (رواہ مسلم)[4]

''قرآن کریم پڑھا کرو؛ کیونکہ وہ قیامت کے دن اپنے پڑھنے والوں کی سفارش کرے گا''۔

---

(۱) فرشتوں کے ہمراہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ ماہر حافظِ قرآن کو آخرت میں ایسے مقامات سے نوازا جائے گا کہ وہ ان مین میر منشی فرشتوں کا رفیق ہوگا، کیونکہ وہ انہیں کے مسلک وطریقۂ کار پر گامزن ہوتے ہوئے انہیں جیسا عمل کرتا تھا کہ وہ کتاب اللہ کا حامل تھا۔

(۲) اس کے معنی یہ نہیں کہ اٹک اٹک کر پڑھنے والے کا اجر ومقام ماہرِ قرآن کے اجر ومقام سے اعلیٰ وارفع ہے، بلکہ یہ محض تسلی کے لئے ہے، ورنہ ماہرِ قرآن یقیناً اس سے افضل ہے، کیونکہ وہ فرشتوں کی ہمراہی میں ہوگا۔
علاوہ ازیں اس کو بھی کئی اجور ومقامات حاصل ہونگے، اور یہ دونوں اجر مل کر بھی ماہرِ قرآن کے اس اجر کے برابر ہرگز نہ ہونگے، کیونکہ اس ماہرِ قرآن نے اٹکنے والے کے مقابلے میں زیادہ محنت، انتہائی توجہ وانہماک اور کثرتِ تلاوت کا مظاہرہ کیا ہے۔ (شرح مسلم النووی)۔
یا یہ ممکن ہے کہ باوجود کمتر ہونے کے جزوی لحاظ سے قابلِ رشک ہوں، کیونکہ بعض مرتبہ کم درجہ کے آدمی میں کوئی ایسی خاص بات ہوتی ہے جو بڑوں کے لئے بھی قابلِ رشک ہوتی ہے۔ (مناتح الحجاز فی فضائل الحفاظ)۔

(۳) أخرجہ البیہقی فی شعب الایمان، کتاب الصلاۃ، فصل تحسین الصلاۃ، الرقم: ۲۹۷۷۔

(۴) أخرجہ مسلم فی صحیحہ فی باب فضل قراءۃ القرآن، الرقم: ۱۸۷۴۔

۵-ارشادِ گرامی ﷺ ہے: "مَثَلُ الْمُؤْمِنِ الَّذِيْ يَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ كَمَثَلِ الْأُتْرُجَّةِ، رِيْحُهَا طَيِّبٌ وَطَعْمُهَا طَيِّبٌ" (متفق علیہ)

''وہ مؤمن جو قرآن کریم پڑھتا ہے اس کی مثال سنگترے کی سی ہے، اس کی خوشبو بھی بہت لطیف اور اس کا مزہ بھی بہت اچھا''۔(۱)

۶- نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَأْدُبَةُ اللّٰهِ، فَتَعَلَّمُوْا مِنْ مَأْدُبَتِهِ مَا اسْتَطَعْتُمْ"

''یہ قرآن (خیر و بھلائی کا) خوانِ الٰہی ہے؛ لہٰذا اس سے جس قدر فائدہ حاصل کر سکتے ہو کر لو''۔

حاملِ قرآن کے لئے چند مفید باتیں: علومِ قرآن کے طالب علم کے لئے مناسب ہے کہ:

☆-وہ قرآن کے آداب واخلاق سے اپنے آپ کو آراستہ کرے۔

☆-علم کے حصول سے اس کا مقصد رضائے الٰہی ہو نہ کہ دنیا کا خس وخاشاک۔

☆-اور قرآن پر عمل پیرا رہے تاکہ قیامت کے دن قرآن اس کیلئے حجت ودلیل بن سکے؛ حدیث شریف میں آتا ہے کہ: "اَلْقُرْاٰنُ حُجَّةٌ لَكَ أَوْ عَلَيْكَ" ''قرآن حجت ودلیل ہے؛ آپ کے حق میں یا آپ کے خلاف''۔

شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''جس شخص نے قرآن کریم نہیں پڑھا تو گویا کہ اس نے اسے چھوڑ دیا، اور جس نے پڑھا لیکن اس کے معانی میں غور نہیں کیا تو اس نے بھی اسے چھوڑ دیا، اور جس نے پڑھا اور غور وفکر بھی کیا لیکن اس پر عمل نہیں کیا تو اس نے بھی گویا کہ اس کو چھوڑ دیا''۔

شیخ الاسلام رحمہ اللہ کے اس قول میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی طرف اشارہ ہے:

﴿وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا﴾ [الفرقان: ۳۰]

---

(۱) یعنی جس طرح خوشبو والے کے پاس بیٹھنے سے ہمنشینوں کا دماغ معطر ہو جاتا ہے اسی طرح قاری کے پاس بیٹھنے والے قرآن مجید سن کر ثواب سے مالا مال ہوتے ہیں، اور جس طرح نارنگی کا مزہ عمدہ ہے اسی طرح مومن کا باطن بھی ایمان کی وجہ سے نورانی ہے۔ (مفاتیح الحجاز في فضائل الحفاظ)۔

''اور (اس دن) رسول کہیں گے اے میرے پروردگار! میری (اس) قوم نے اس قرآن کو (جو کہ واجب العمل تھا) بالکل نظر انداز کر رکھا تھا''۔

قرآن کے ذاتی اور صفاتی نام: قرآن کریم[1] کے متعدد نام ہیں، ان میں سے ہر ایک اس کے رفیع الشان، عظیم المرتبت اور علی الاطلاق تمام آسمانی کتابوں سے افضل ہونے پر دلالت کرتا ہے؛ اسے: (۱) ''قرآن'' (۲) ''فرقان'' (۳) ''تنزیل'' (۴) ''ذکر'' (۵) اور ''کتاب'' وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اسی طرح اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کے متعدد اوصافِ جمیلہ بیان کئے ہیں؛ جن میں سے بعض یہ ہیں: (۱) ''نور'' (۲) ''ھدیٰ'' (۳) ''رحمۃ'' (۴) ''شفائ'' (۵) ''موعظۃ'' (۶) ''عزیز'' (۷) ''مبارک'' (۸) ''بشیر'' (۹) ''نذیر'' وغیرہ، اور اس کے علاوہ بھی ایسے بہت سے اوصاف ہیں جو اس کی عظمت وبزرگی پر دلالت کرتے ہیں۔

وجہِ تسمیہ: بہت ساری آیات میں اسے قرآن (۱) کا نام دیا گیا ہے، ان میں سے بعض یہ ہیں:

(الف: ۱) ارشادِ ربانی ہے: ﴿قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ ۱﴾ [ق: ۱]

''قٓ، قسم ہے قرآن مجید کی''۔

(الف: ۲) اور ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ﴾ [الأسراء: ۹]

''بلاشبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام)''

(ب) اور اس کا نام ''فرقان'' رکھنے کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا﴾ [الفرقان: ۱]

ترجمہ: ''بڑی عالی شان ذات ہے جس نے یہ فیصلہ کی کتاب (یعنی اچھے

---

(۱) علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جاحظ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ عرب کلام کے مجموعہ کا اور اس کے بعض بعض حصوں کا جو نام رکھتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کا نام اس کے برخلاف مقرّر فرمایا، سو مجموعی پر اس کتاب کا نام قرآن رکھا جیسا کہ اہل عرب ''دیوان'' نام رکھتے تھے، اور قرآن کے بعض حصہ کا نام ''سورت'' رکھا، جیسا کہ عرب ''دیوان'' کے بعض حصہ کا نام ''قصیدہ'' رکھتے تھے، اور ''سورت'' کے بعض حصہ کا نام ''آیت'' رکھا، جیسا کہ عرب ''قصیدہ'' کے بعض حصہ کا نام ''بیت'' رکھتے تھے، اور ''آیت'' کے آخری حصہ کا نام ''فاصلہ'' رکھا، جیسا کہ عرب ''بیت'' کے آخری حصہ کا نام ''قافیہ'' رکھتے تھے۔ (اتقان)۔

برے، بہتر وبدتر، اخلاق واقدار اور حق وباطل میں ہمیشہ کے لئے تفریق وامتیاز کردینے والی کتاب الٰہی) اپنے بندۂ خاص (محمد ﷺ) پر نازل فرمائی تا کہ وہ (بندہ) تمام دنیا جہاں والوں کو ڈرانے والا ہو"۔

(ج) اور اس کا نام "تنزیل" رکھنے کی وجہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ○ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ﴾ [الشعراء: ۱۹۳،۱۹۲]

"اور یہ قرآن ربّ العالمین کا (بتدریج) بھیجا ہوا (کلام) ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے"۔

(د) اور اسکا نام "ذکر" رکھنے کا سبب اللہ تعالیٰ کا یہ قول ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَٰفِظُونَ﴾ [الحجر: ۹]

"ہم نے ذکر (یعنی قرآن جو کہ ناقابلِ فراموش اور ذہن میں محفوظ نصیحت) کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں"۔

(ھ) اور "کتاب" کے نام سے موسوم ہونے کا باعث باری تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿حمٓ ○ وَالْكِتَٰبِ الْمُبِينِ ○ إِنَّآ أَنزَلْنَٰهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَٰرَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ﴾ [الدخان: ۱،۲،۳]

"حٰم، قسم ہے اس واضح کتاب کی (جو کہ مرتب ومنظم سورتوں اور آیتوں کی شکل میں تلاوت، احکام وقوانین کا مجموعہ ہے) کہ ہم نے اس کو (لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شبِ قدر) میں اتارا ہے"۔

صفاتی ناموں کی وجہِ تسمیہ: باقی رہی بات اوصاف کی تو اس کے بارے میں بھی قرآنِ کریم میں کئی آیات مذکور ہیں اور بہت کم ہی قرآن کریم کی سورتوں میں سے کوئی سورت ایسی ہوگی جو اس کتاب کے بہترین اور عالی شان وصف سے خالی ہوگی جسے ربّ العزت نے اس لئے نازل کیا کہ وہ خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کے لئے ابدی معجزہ ہو، ان میں سے چند ایک کا ہم ذکر کر دیتے ہیں:

۱- ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُم بُرْهَٰنٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَأَنزَلْنَآ إِلَيْكُمْ نُورًا مُّبِينًا﴾ [النساء: ۱۷۴]

ترجمہ: "اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک

دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف نور بھیجا ہے۔''

۲- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ [الاسراء: ۸۲]

''اور ہم قرآن میں سے ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفاء اور رحمت ہے اور ناانصافوں کو اس سے اور نقصان بڑھتا ہے۔''

۳- اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَاءٌ﴾ [فصلت: ۴۴]

''اور آپ کہہ دیجیئے کہ یہ ایمان والوں کیلئے تو ہدایت ہے اور شفاء ہے۔''

۴- فرمان خداوندی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَاۗءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ ۙ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ [یونس: ۵۷]

''اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو (برے کاموں سے روکنے کے لئے) نصیحت ہے اور دلوں میں جو (برے کاموں سے) روگ (ہوجاتے ہیں) ان کے لئے شفاء ہے اور رہنمائی کرنے والی ہے اور رحمت (ذریعہ ثواب) ہے (اور یہ سب برکات) ایمان والوں کے لئے ہیں۔''

قرآن مشتق ہے یا اسمِ علم؟ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ''قرآن''، ''قراءۃ'' کی طرح ''قرأ'' کا مصدر ہے، وہ حضرات اس پر اللہ تعالیٰ کے اس قول سے استدلال کرتے ہیں: ﴿اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ﴾ أی: قِرَاءَ تَهٗ۔ [القیامۃ: ۱۷، ۱۸]

''ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کردینا (اور آپ کی زبان سے) اس کا پڑھوا دینا، تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھنے لگا کرے) تو آپ اس کے تابع ہوجایا کیجیے۔''

قرآن اس رائے کی بناء پر مشتق ہوگا۔ اور دوسرے بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ ''قرء'' سے مشتق نہیں بلکہ یہ تورات وانجیل کی طرح اس کتاب مجید کا اسمِ علم ہے اور یہی رائے امام شافعی رحمہ اللہ کی بھی ہے، تفصیل کے لئے دیکھئے: شیخ ''مَنّاع القطّان'' کی کتاب:

''مباحث القرآن''۔

نزولِ قرآن کی ابتداء کب ہوئی؟ قرآن کریم کے نزول کی ابتداء ۱۷/رمضان المبارک ۱۱ کو ہوئی جبکہ نبی کریم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کے ۴۰ سال گزر چکے تھے، رسول اللہ ﷺ غارِ حرا میں مصروفِ عبادت تھے کہ جبریل امین پُرحکمت کتاب کی آیات لے کر نازل ہوئے، انہوں نے آپ ﷺ کو اپنے سینے سے بھینچ کر پھر چھوڑ دیا، اسی طرح تین مرتبہ کیا اور ہر مرتبہ آپ سے فرماتے: ''اقرأ'' ''پڑھیے'' جبکہ رسول کریم ﷺ اسے جواب میں فرماتے: ''ما أنا بقارئ'' ''میں پڑھ نہیں سکتا'' تیسری بار حضرت جبریل امین نے آپ ﷺ سے فرمایا:

﴿اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾ [العلق:۱۔۵]

ترجمہ: ''(اے پیغمبر ﷺ) آپ (پر جو قرآن نازل ہوا کریگا) اپنے رب کا نام لیکر پڑھا کیجئے (یعنی جب پڑھیے، ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کہہ کر پڑھا کیجئے) وہ جس نے (مخلوق کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا، آپ (قرآن) پڑھا کیجئے، اور آپ کا رب بڑا کریم ہے (جو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے) جس نے (لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو) قلم سے تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہ جانتا تھا''۔

اشارات ودلائلِ نبوت: چنانچہ یہ وحی کے نزول کی ابتدا تھی، نیز نزولِ قرآن سے کچھ پہلے بعض ارھاصات (اشارات ودلائل) ایسے بھی رونما ہوئے جو نبی کریم ﷺ کے لئے قربِ وحی اور تحققِ نبوت پر دلالت کرتے تھے[1]۔

اس کی ایک مثال سچے خوابوں کا دیکھنا تھا، آپ ﷺ نبوت سے کچھ پہلے جو خواب بھی

---

(۱) مصنف رحمہ اللہ نے قرآن کریم کے پانچ ناموں کا ذکر کیا ہے، ان میں ''قرآن'' ہی کلامِ الٰہی کے ساتھ خاص ہے، پھر کلام اللہ میں سے بھی اب اس کا اطلاق صرف آنحضرت ﷺ پر نازل کردہ کتاب پر ہی ہوتا ہے۔

قرآن کریم کو جب پہلی مرتبہ خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں منظم ومرتب صورت میں ترتیب دیا گیا تو اس کا نام (مختلف اوراق اور صحیفوں میں جمع کرنے کی وجہ سے) ''مصحف'' رکھا گیا۔ (اتقان)۔

دیکھتے وہ اسی طرح وقوع پذیر ہوتا جیسا کہ نیند میں دیکھا تھا، اسی طرح ان اشارات میں سے ایک خلوت وتنہائی کو پسند کرنا بھی تھا کہ آپ ﷺ غارِ حرا میں تنہائی ویکسوئی کے ساتھ اپنے رب کی عبادت میں مشغول رہتے۔

بخاری کی روایت: امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''صحیح بخاری'' کے باب ''بدء الوحی'' میں اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے اپنی سند سے ایک روایت ذکر کی ہے جو کہ اس قصہ اور نزول کی کیفیت کی خبر دیتی ہے؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت ﷺ پر وحی کی ابتدا ہوئی ''رؤیا صالحہ'' (سچے خواب) تھے جنہیں آپ نیند میں دیکھتے تھے، آپ ﷺ جو خواب بھی دیکھتے وہ سپیدۂ صبح کی سامنے آجاتا، پھر خلوت گزینی آپ ﷺ کو محبوب کردی گئی، آپ ﷺ غارِ حرا میں خلوت گزینی فرماتے اور اپنے اہل کی طرف اشتیاق سے پہلے کئی کئی راتوں تک اس میں مصروفِ عبادت رہتے، اور اس کے لئے سامانِ خورد ونوش بھی ساتھ لے جاتے پھر (جب توشہ ختم ہو جاتا تو) حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس واپس تشریف لاتے اور اتنی ہی راتوں کے لئے پھر توشہ لے لیتے، یہاں تک کہ حق (وحی) آگیا اور آپ ﷺ غارِ حرا میں تھے، فرشتہ پہنچا اور اس نے کہا: ﴿اقرأ﴾ ''پڑھیے''۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''ما أنا بقارئ'' ''میں پڑھ نہیں سکتا''۔

آپ ﷺ فرماتے ہیں: فرشہ نے مجھے پکڑ کر دبایا یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا، پھر اس نے چھوڑ دیا اور کہا: ﴿اقرأ﴾ ''پڑھیے''۔ میں نے کہا: ''ما أنا بقارئ'' ''میں پڑھ نہیں سکتا''۔

پھر اس نے مجھے پکڑ کر دوسری مرتبہ دبوچا یہاں تک کہ اس کا دبوچنا میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا اور مجھے چھوڑ دیا اور کہا: ﴿اقرأ﴾ ''پڑھیے''۔ میں نے جواب دیا: ''ما أنا بقارئ'' ''میں پڑھ نہیں سکتا''۔

پھر اس نے مجھے پکڑ کر تیسری مرتبہ دبوچا یہاں تک کہ اس کا دبوچنا میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا پھر مجھے چھوڑ دیا اور کہنے لگے: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ﴾

[العلق: ۱۔۵] یہ آیات لیکر رسولِ اکرم ﷺ واپس ہوئے اور آپ ﷺ کا دل کانپ رہا تھا۔

ماہِ رمضان میں نزولِ قرآن: ماہِ رمضان میں نزولِ قرآن کے بارے میں کتاب اللہ میں واضح اور صریح نص موجود ہے، عالی شان ذات کا فرمان ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ [البقرة: ۱۸۵]

''ماہِ رمضان وہ ہے جس میں قرآن مجید بھیجا گیا ہے (جس کا ایک وصف یہ ہے کہ) وہ لوگوں کے لئے (ذریعۂ) ہدایت ہے اور (دوسرا وصف) واضح الدلالت ہے منجملہ ان کتب کے جو کہ (ذریعۂ) ہدایت (بھی) ہیں اور (حق و باطل) میں فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں۔

قرآن لے کر آنے والا فرشتہ کون تھا؟ اس کو لے کر آنے والے فرشتے جبرئیل تھے، اُن کے بارے میں بھی قرآن میں واضح نص موجود ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ○ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ○ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ○﴾ [الشعراء: ۱۹۳۔۱۹۵]

''اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں''۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ [النحل: ۱۰۲، ۱۰۳]

''آپ فرما دیجیے کہ اس کو روح القدس آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں؛ تاکہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہو جائے''۔

''الروح الامین'' یا ''روح القدس'' سے بہ اتفاقِ مفسرین جبرئیل علیہ السلام مراد ہیں، وہ وحی الٰہی پر اللہ کے امین ہیں اور وہ ہی ہیں جو تمام نبیوں اور رسولوں پر وحی لے کر نازل ہوئے [۱]۔

---

(۱) یہی قول صحیح ہے، ربیع الاوّل میں جو نبوت کا ملنا مشہور ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ربیع الاوّل میں سچے خواب آنا شروع ہو چکے تھے۔ (اتقان)۔

ہجرت سے تیرہ سال قبل ۱۷/ رمضان کو پہلی پانچ آیات کا نزول ہوا، عیسوی سال کے اعتبار سے یہ ۶۱۰ء=

سب سے پہلے اور آخر میں نازل ہونے والی آیات: قرآن کریم میں سب سے پہلی جو آیتیں اتریں وہ سورۂ علق کی ابتدائی آیات ہیں:

﴿اقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ﴾ [العلق: ۱۔۵]

جیسا کہ حدیثِ بخاری میں اس کا ذکر ہو چکا ہے۔

سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ [البقرۃ: ۲۸۱]

''اور اس دن سے ڈرو جس میں تم اللہ تعالیٰ کی پیشی میں لائے جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا''۔

اور یہی صحیح اور راجح قول ہے جسے علماء نے اختیار کیا ہے، اُن میں سب سے نمایاں نام علّامہ سیوطی رحمہ اللہ کا ہے اور یہی قول حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی منقول ہے، امامِ نسائی رحمہ اللہ عکرمہؒ کے واسطے سے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کرتے ہیں کہ آپ رضی اللہ عنہما نے فرمایا: ''قرآن میں سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت: ﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے نزول کے بعد ۹ / راتیں بقیدِ حیات رہے اور تین ربیع الاول پیر کی رات کو وفات پائی۔

اور بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ آخر میں نازل ہونے آیت اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ [المائدۃ: ۳]

''آج کے دن میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کر لیا''۔

= کا مہینہ بنتا ہے۔

ٹھیک اسی تاریخ کو چودہ قمری سالوں کے بعد جنگِ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ (نور الیقین)۔

لیکن یہ قول صحیح نہیں؛ اس لئے کہ یہ آیتِ کریمہ آپ ﷺ پر حجۃ الوداع کے موقع پر اس وقت نازل ہوئی جب آپ عرفہ میں کھڑے تھے، آپ ﷺ اس آیت کے نزول کے بعد اکیاسی (۸۱) دن زندہ رہے اور آیتِ بقرہ: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ إِلَى اللهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ وفات سے نو (۹) راتیں قبل نازل ہوئی تو یہی آیت آخر میں نازل ہونے والی ہوگی نہ کہ آیتِ مائدہ، یہی رائے ہی صحیح اور صواب ہے۔

اس آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہوگیا، یہ زمین سے آخری آسمانی رابطہ تھا، نبی کریم ﷺ نے جب امانت ادا کردی، پیغامِ الٰہی پہنچادیا اور لوگوں کی دینِ حق کی جانب رہنمائی کردی تو نزولِ قرآن کے اختتام کے بعد رفیقِ اعلیٰ سے جاملے۔

آیتِ مائدہ نزول میں متأخر ہے: آیتِ مائدہ کے حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہونے پر صحیح بخاری کی درج ذیل روایت صراحۃً دلالت کرتی ہے:

''ایک یہودی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور کہا کہ: ''امیر المؤمنین! تمہاری کتاب میں ایک آیت ہے، اگر ہم (یعنی قومِ یہود) پر نازل ہوتی تو ہم اس دن کو عید منالیتے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''تمہاری مراد کونسی آیت ہے؟'' تو یہودی نے کہا کہ: ''اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا: اللہ کی قسم، میں اس مقام کو جانتا ہوں جہاں یہ نازل ہوئی اور اس دن کو بھی جانتا ہوں جس میں اس کا نزول ہوا، یہ آیت رسول اللہ ﷺ پر مقامِ عرفہ میں جمعہ کے دن عصر کے بعد نازل ہوئی، یعنی یہ آیت ایسے دن نازل ہوئی جو اسلامی عیدوں میں سب سے عظیم اور بڑھ کر ہے، تو یہ عید در عید ہوئی''(۱)۔

---

(۱) ارہاصات: ''ارہاص'' کی جمع ہے، ''رہص'' ''سنگِ بنیاد کو کہا جاتا ہے، دعوائے نبوت سے پہلے بلکہ نبی کی ولادت سے بھی پہلے حق تعالیٰ دنیا میں ایسے واقعات اور نشانیاں ظاہر فرماتے ہیں جو کہ خرقِ عادت ہونے میں مثلِ معجزہ ہوتی ہیں، محدثین کی اصطلاح میں انہیں ''ارہاص'' کہا جاتا ہے جو کہ ''تاسیس وتمہید'' کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ (قاموس)۔

تنبیہ: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "الاتقان في علوم القرأن" میں قرآن میں سب سے پہلے اور آخر میں نازل ہونے والی آیت پر بعض اشکالات اور ان کے معقول جوابات ذکر کئے ہیں، ہم ان کا خلاصہ ذیل میں بیان کرتے ہیں:

پہلا اشکال: صحیحین میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ: "ان سے پوچھا گیا کہ سب سے پہلے کون سی آیات نازل ہوئیں؟ تو آپ نے فرمایا: ﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ اُن سے کہا گیا کہ نہیں بلکہ یہ آیت پہلے نازل ہوئی: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ تو آپ نے فرمایا کہ میں تم سے وہ بات بیان کرتا ہوں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: "میں غارِ حرا میں گوشہ نشین تھا، جب میں گوشہ نشینی ختم کر چکا تو وہاں سے اترا، اور وادی کے درمیان پہنچا تھا کہ مجھے پکارا گیا، میں نے آگے پیچھے، دائیں بائیں دیکھا، پھر آسمان کی طرف نگاہ اٹھائی تو جبرئیل نظر آئے، اس سے مجھ پر رعشہ طاری ہو گیا، میں خدیجہ کے پاس آیا اور انہیں حکم دیا (کہ مجھے کمبل اوڑھا دو) تو انہوں نے مجھے کمبل اوڑھا دیا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے: ﴿يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ کی آیت نازل فرمائی"(۱)۔

یہ حدیث "سورۂ مدثر" کے قرآن میں سب سے پہلے نازل ہونے پر دلالت کرتی ہے، علّامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس کے جواب میں یوں کہا ہے کہ: "اسکے کئی جوابات دیئے گئے ہیں، ایک جواب یہ ہے کہ: سوال پوری سورت کے نزول کے متعلق تھا تو حضرت جابرؓ نے بیان کر دیا کہ پوری "سورۂ مدثر" "سورۂ اقرأ" کے اترنے سے پہلے نازل ہوئی، کیونکہ "سورۂ اقرأ" کا ابتدائی حصہ سب سے پہلے نازل ہوا (نہ کہ مکمل سورت) اس کی تائید صحیحین ہی میں مروی حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی اس حدیث سے ہوتی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا جبکہ آپ انقطاعِ وحی کے بارے میں بتا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: اس دوران کہ میں چل رہا تھا کہ میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، سر اٹھایا تو یکا یک وہ فرشتہ نظر آیا جو میرے پاس غارِ حرا میں آیا تھا، وہ آسمان اور زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، میں لوٹ آیا اور میں نے کہا کہ مجھے

(۱) مروی ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ۲۶ ہزار بار نزول فرمایا۔ (اثمار التکمیل) اس حساب سے روزانہ تین مرتبہ نزول ثابت ہوتا ہے۔

کمبل اڑھادو، تو اللہ تعالیٰ نے: ﴿يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ﴾ کی آیت نازل فرمائی''۔

پس آپ ﷺ کا قول: ''اَلْمَلِکُ الَّذِیْ جَاءَنِیْ بِحِرَاءَ'' دلالت کرتا ہے کہ یہ اُس قصے اور واقعے سے متأخر ہے جس میں: ﴿اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ﴾ کا نزول ہوا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے دیگر کئی جوابات بھی دیئے ہیں جن کے ذکر کرنے کی زیادہ ضرورت نہیں۔

دوسرا اشکال: وہ یہ ہے کہ آیت مائدہ یعنی اللہ تعالیٰ کا فرمان: ﴿الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ دین کے کامل اور تمام ہونے پر دال ہے تو پھر اس کے بعد آیات کا نزول اور انہیں ہمارا اختتام القرآن (باعتبارِ نزول کے آخری آیات) کہنا کیونکر ممکن ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ بے شک اللہ تبارک وتعالیٰ نے، فرائض واحکام اور حلال وحرام کے بیان کے اعتبار سے دین کو مکمل کردیا اور امت کو جس چیز کی ضرورت تھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کو بیان کردیا اور اس کے احکام کو واضح کردیا یہاں تک کہ امت روشن اور سیدھے راستے پر چل پڑی اور یہ چند ایسی آیات مبارکہ کے نزول کے منافی نہیں جن میں وعظ و نصیحت، اللہ کے عذاب سے ڈرانا اور قیامت کے ہولناک دن میں احکم الحاکمین کے سامنے کھڑے ہونے کی لوگوں کو یاددہانی کرائی گئی ہو، کہ جس میں (نجات کے لئے) نہ مال فائدہ دے گا اور نہ ہی اولاد مگر ہاں (اس کی نجات ہوگی) جو اللہ کے پاس (کفر وشرک سے) پاک دل لیکر آوے گا۔ اس بات کی علماء کی ایک بڑی جماعت نے تصریح کی ہے حتی کے علامہ سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد کوئی حلال یا حرم (کا حکم) نازل نہیں ہوا[1]۔

جہاد، شراب اور مطعومات کے بارے میں نازل ہونے والی سب سے پہلی آیات: ۱-قتال کے متعلق متعدد آیات نازل ہوئیں، لیکن یہ تمام آیات مدنی ہیں، اس لئے کہ مسلمان مکہ میں ناتواں تھے، لہٰذا دشمنوں سے ان کا جہاد اسلحہ کے بجائے زبان کے ذریعے تھا، دشمنوں سے قتال کی اجازت انہیں ہجرت کے بعد ہی ملی یعنی مسلمان جب

(۱) اس روایت سے معلوم ہوا کہ آیتِ مائدہ اگرچہ نزول میں متأخر ہے، لیکن مذکورۃ الصدر آیت بقرہ سے متقدم ہے، کیونکہ آیتِ بقرہ حجۃ الوداع کے کافی بعد نازل ہوئی۔ (از مرتب عفا اللہ عنہ)

طاقتور اور زیادہ ہوگئے، مدینہ منورہ میں ان کی ایک عظیم مملکت قائم ہوگئی، تو اس وقت قتال کی اجازت کا حکم نازل ہوا، پہلی آیت جو قتال کے بارے میں نازل ہوئی وہ سورۂ حج میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۭ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ [الحج: ۳۹،۴۰]

ترجمہ: ”(اب) لڑنے کی اُن لوگوں کو اجازت دی گئی جن سے (کافروں کی طرف سے) لڑائی کیجاتی ہے، اس وجہ سے کہ ان پر (بہت) ظلم کیا گیا ہے اور بلا شبہ اللہ تعالیٰ ان کے غالب کردینے کی پوری قدرت رکھتا ہے، (آگے ان کی مظلومیت کا بیان ہے) جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے، محض اتنی سی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ (ہمیشہ سے) لوگوں کا ایک دوسرے (کے ہاتھ) سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو (اپنے اپنے زمانوں میں) نصاریٰ کے خلوت خانے اور عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے سب منہدم ہوگئے ہوتے اور بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ (کے دین) کی مدد کریگا، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا (اور) غلبہ والا ہے (وہ جس کو چاہے غلبہ اور قوت دے سکتا ہے)“۔

چنانچہ آپ اس آیتِ کریمہ میں دیکھ رہے ہیں کہ اس میں صراحۃً اذن بالقتال کی مشروعیت کی حکمت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ قتال کا حکم صرف ظلم وزیادتی کی روک تھام اور اس کی مشروعیت فقط مظلوموں کے دفاع اور ظالموں کو ظلم سے باز رکھنے کے لئے تھی جیسا کہ یہ بات اس آیتِ کریمہ میں بالکل ہویدا ہے۔

۲- اور شراب کے متعلق بھی کئی آیات کا نزول ہوا، سورۂ بقرہ میں موجود اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان سب سے پہلے نازل ہوا: ﴿يَسْــَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۡ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ [البقرۃ: ۲۱۹]۔

''لوگ آپ سے شراب اور جوے کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں بھی ہیں اور لوگوں کو (بعضے) فائدہ بھی ہیں اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں''۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: ''شراب کے بارے مین تین آیتیں نازل ہوئیں؛ پہلی آیت یہ تھی: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾

۳- اور مکہ میں مطعومات کے بارے میں سب سے پہلے سورۂ انعام میں موجود اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا:

﴿قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ [الأنعام: ۱۴۵]

''آپ کہ دیجیے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اسکو کھاوے، مگر یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو یا کہ بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو (جانور وغیرہ) شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو (قدر ضرورت سے) تو واقعی آپ کا رب غفور رحیم ہے۔''

یہ بعض احکام شریعہ کے مخصوص چند دلائل ہیں جن کے ذریعے سے قرآنی احکام نازل ہوئے، ان کا جاننا ہر شخص کے لئے نہایت ضروری ہے تا کہ وہ اسلام کی ایسی لطیف قانون سازی کے راز سے واقف ہو جائے جسنے لوگوں کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو ملحوظِ نظر رکھا ہے۔

نیز یہ دلائل اُن پُر حکمت اصولوں میں سے ایک ہیں جسے اسلام نے معاشرتی حالات کو سنوارنے اور دورِ جاہلیت کی اُن اخلاقی بیماریوں کے علاج کے لئے اختیار کیا جو لوگوں کے رگ و پے میں رچ بس گئی تھیں، جیسا کہ ہم دوسری بحث میں اس کی مزید وضاحت کریں گے۔ (ان شاء اللہ تعالیٰ)

دوسری فصل

قرآن کریم کے تدریجی نزول کی حکمتیں

اللہ تعالیٰ نے اس امتِ محمدیہ پر اپنی آخری آسمانی معجز کتاب نازل فرما کر اسے عزت بخشی، تاکہ یہ اُس کے لیے دستورِ حیات، اُس کے مسائل کا حل، اُس کی بیماریوں اور امراض کے لیے شفا بخش مرھم اور اس امت کو مقدّس ترین پیغاماتِ خداوندی کے تحمل کے لیے چننے اور منتخب کرنے پر عظمت اور افتخار کی علامت ہو، جہاں اللہ نے سب سے افضل کتاب نازل کر کے ان کو عزت بخشی اور مخلوقات میں سے سب سے معزز ہستی (محمد بن عبداللہ ﷺ) کے ساتھ انہیں وابستہ کر کے ممتاز مقام عطا کیا۔

قرآن کے نزول کے ساتھ ہی پیغاماتِ سماویہ کی لڑی مکمل ہوئی، نورالٰہی نے پوری کائنات پر ضوافشانی کی، عالَم پر اس کی روشنی چمکنے لگی اور اللہ کی ہدایت مخلوق تک جا پہنچی اور یہ نزول امین السماء جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے ہوا، جو اسے لے کر آپ ﷺ کے قلب مبارک پر اترتے، تاکہ آپ ﷺ پیغامِ خداوندی پہنچادیں اور اسی کے متعلق اللہ جل جلالہ کا فرمان ہے: ﴿نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾ (الشعراء: ۱۹۳_۱۹۵)

''اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں''۔

نزول قرآن کی کیفیت: قرآن کریم کے دو نزول ہیں[1]:

---

(۱) قرآن کریم کا دو بار یکبارگی نزول ہوا، اوّل بارگاہِ خداوندی سے لوحِ محفوظ میں، دوم لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کے مقام بیتِ عزّت میں، اور تیسری بار تدریجی نزول بیتِ عزّت سے حضورِ اکرم ﷺ پر تیئس سال کے عرصہ میں ہوا برخلاف دوسری کتبِ سماویہ کے کہ ان کا نزول صرف ایک بار کتابی شکل میں ہوا، قرآن کے لئے دو نزول جمع =

۱-لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کی طرف (یکبارگی) شبِ قدر میں نازل ہونا۔

۲-آسمانِ دنیا سے زمین کی طرف تیئیس سال[1] کے عرصہ میں بتدریج نازل ہونا۔

پہلا نزول: پہلی مرتبہ اس کا نزول زمانہ کی تمام راتوں میں سب سے مبارک رات شبِ قدر میں ہوا، اس رات میں پورا قرآن آسمانِ دنیا میں "بیتُ العزة"[2] کی طرف نازل کیا گیا، جس پر مندرجہ ذیل متعدد نصوص قرآنیہ دلالت کرتے ہیں:

الف- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿حٰمٓ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ﴾ (الدخان: ۱،۲،۳)

"حٰم، قسم ہے اس واضح کتاب کی (جو کہ مرتب و منظم سورتوں اور آیتوں کی شکل میں تلاوت، احکام وقوانین کا مجموعہ ہے) کہ ہم نے اس کو (لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) ایک برکت والی رات (یعنی شبِ قدر) میں اتارا ہے، ہم آگاہ کرنے والے ہیں"

ب- اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ﴾ (القدر: ۱-۲)

= ہوئے، اس کی حکمت یہ ہے کہ آخری کتاب ہونے کی وجہ سے اس کتاب کی حفاظت کا مکمل انتظام مقصود تھا، ایک بار انتظامِ عمومی کی صورت میں قرآن کو لوحِ محفوظ میں محفوظ کیا گیا جو حکومتِ الٰہیہ کا مرکزی محافظ خانہ ہے، دوسری مرتبہ بیت عزّت میں سماوی حفاظت کا انتظام کیا گیا، تیسری مرتبہ اس کے آگے پیچھے پہریدار فرشتے چلا کر شیطانی تصرف سے محفوظ کر کے طریقی حفاظت کا انتظام کیا گیا، چوتھی مرتبہ حضور اقدس ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل فرما کر ارضی حفاظت کا انتظام کیا گیا، پانچویں مرتبہ حضور اقدس ﷺ کے ذریعے بغیر کمی وزیادتی کے لوگوں تک پہنچا کر تبلیغی حفاظت کا انتظام کیا گیا، چھٹی مرتبہ امتِ محمدیہ ﷺ کے قلوب کو قرآن کی طرف مائل کر کے "انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحفظون" کے وعدہ کے مطابق صدری حفاظت کا انتظام ہوا، بعدہ ابوبکر صدیق، وعمر فاروق، عثمان غنی رضی اللہ عنہم کو آمادہ کر کے ساتویں مرتبہ تحریری صورت میں حافظتی انتظام عمل میں لایا گیا، اس طرح کمالِ حفاظتِ قرآن کی شان کا ظہور ہوا (مفاتح الحجاز ملخصاً بتغییر)۔

(۱) تقریباً ۲۲ سال ۵ ماہ اور ۱۴ دن میں نازل ہوا (مفاتیح)۔

(۲) "بیت العزة" آسمانِ دنیا پر موجود فرشتوں کا کعبہ ومعبد ہے، جو کہ بالکل کعبۂ دنیا کے اوپر سیدھ میں ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)۔

''بے شک ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا (شوق بڑھانے کے لیے فرمایا) اور آپ کو کچھ معلوم ہے کہ شبِ قدر کیسی چیز ہے؟''۔

(ج) اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيٓ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۵)

''ماہِ رمضان وہ جس میں قرآن بھیجا گیا ہے، جس کا (ایک) وصف یہ ہے کہ لوگوں کے لئے (ذریعۂ) ہدایت ہے، اور (دوسرا وصف) واضح الدلالۃ ہے، منجملہ ان کُتب کے جو کہ (ذریعۂ) ہدایت (بھی) ہیں، اور (حق و باطل میں) فیصلہ کرنے والی (بھی) ہیں''۔

یہ تینوں آیات دلالت کرتی ہیں کہ قرآن ماہِ رمضان کی راتوں میں سے ایک ہی رات میں نازل ہوا، جس کی صفت مبارک اور نام شبِ قدر ہے، اور اس سے یہ بھی متعین ہو جاتا ہے کہ یہ نزول وہ پہلا نزول ہے جو آسمانِ دنیا میں موجود ''بیت العزۃ'' کی طرف ہوا، کیونکہ اگر اس سے دوسرا نزول مراد ہو جو کہ آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر ہوا، تو اس کا ایک ہی رات اور ایک ہی ماہ (یعنی ماہِ رمضان) میں نازل ہونا ٹھیک نہیں ہوگا، کیونکہ (آپ ﷺ پر) قرآن بعثتِ نبوی ﷺ کی تیئیس سالہ ایک طویل مدّت تک نازل ہوتا رہا، نیز یہ نزول رمضان کے علاوہ دیگر تمام مہینوں میں بھی ہوا۔

لہٰذا ثابت ہو گیا کہ مذکورہ آیات میں نزول سے مراد پہلا نزول ہے، اور صحیح احادیث بھی اس معنی کی تائید کرتی ہیں، مثلاً:

(الف) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: ''فُصِلَ القرآنُ مِنَ الذِّكرِ فَوُضِعَ فِيْ بَيْتِ الْعِزَّةِ مِنَ السَّمَاءِ الدنيا فَجَعَلَ جِبْرِيْلَ يَنْزِلُ بِهِ عَلَى النبي صلى الله عليه وآله وسلم''

''قرآن کو ذکر (لوحِ محفوظ) سے جدا کر کے آسمانِ دنیا کے ''بیت العزۃ'' میں رکھا گیا، پھر جبرئیل امین اسے لے کر نبی کریم ﷺ پر نازل کرتے رہے''۔

(ب) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی روایت ہے: ''أُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَاحِدَةً إِلَى سَمَاءِ الدُّنْيَا وَكَانَ بِمَوَاقِعِ النُّجُوْمِ وَكَانَ اللّٰهُ يُنَزِّلُهُ عَلَى رَسُوْلِهِ صلى الله عليه وآله وسلم بَعْضَهُ إِثْرَ بَعْضٍ''

''قرآن یکبارگی آسمانِ دنیا کی طرف اتارا گیا، اور یہ مواقع نجوم میں تھا اور اللہ تعالیٰ

اس کے بعض حصہ کو دوسرے بعض کے بعد اپنے رسول ﷺ پر نازل فرماتے رہے"۔

(ج) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: "أُنْزِلَ القُرآنُ فِيْ لَيْلَةِ القَدْرِ فِيْ شَهْرِ رَمَضَانَ اِلٰى سَمَاءِ الدُّنْيَا جُمْلَةً وَاحِدَةً ثُمَّ أُنْزِلَ نُجُوْماً"[1]

"قرآن ماہِ رمضان کو شبِ قدر میں یکبارگی آسمانِ دنیا کی طرف نازل کیا گیا، پھر بتدریج تھوڑا تھوڑا اترتا رہا"۔

ان تینوں روایتوں کو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاتقان فی علوم القرآن" میں ذکر کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ تمام روایات صحیح ہیں، اسی طرح علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ روایت بھی نقل کی ہے کہ عطیہ بن اسودؒ نے ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سوال کیا اور کہا کہ باری تعالیٰ کے اِن ارشادات: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ﴾ اور ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ نے میرے دل میں شک سا ڈال دیا ہے، اس لیے کہ قرآن تو شوال، ذی القعدہ، ذی الحجہ، محرم، صفر، ربیع الاول کے مہینوں میں بھی نازل ہوتا رہا ہے، (تو ایک ہی رات اور ایک ہی ماہ میں نزولِ قرآن چہ معنی دارد؟)۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: "اِنَّهُ أُنْزِلَ فِيْ رَمَضَانَ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ جُمْلَةً وَاحِدَةً ثُمَّ أُنْزِلَ عَلٰى مَوَاقِعِ النُّجُوْمِ رِسْلاً[2] فِي الشُّهُوْرِ وَالْأَيَّامِ"

"اسے رمضان المبارک میں شبِ قدر میں یکبارگی اتارا گیا، پھر بتدریج حسبِ موقع نرم روی کے ساتھ مختلف دنوں اور مہینوں میں نازل کیا گیا"۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ذکر کیا ہے کہ علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے قرآن کے لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا کے "بیت العزۃ" کی طرف یکبارگی نازل ہونے پر علماء کا اجماع نقل کیا ہے۔

قرآن کے اس نزول کی حکمت شاید قرآن کریم کی رفعتِ قدر اور مُنَزَّل علیہ (رسول اللہ ﷺ) کی عظمتِ شان کا اظہار مقصود ہے، تاکہ ساتوں آسمانوں کے مکینوں پر یہ واضح

---

(۱) نجوماً: بمعنی متفرق حصے (از مصنف)۔

(۲) "مواقع النجوم" اور "رسلاً" سے مراد یہ ہے کہ اسے متفرق طور پر تھوڑا تھوڑا کر کے اتارا گیا، یکے بعد دیگرے بعض حصہ بعض کے بعد آہستگی اور نرمی کے ساتھ نازل ہوتا رہا" (از مصنف)۔

کردیا جائے کہ بہترین امت کے واسطے آخری نبی پر نازل ہونے والی آخری آسمانی کتاب کو ہم نے نزول کے لئے ان کے قریب کردیا ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: اگر حکمتِ الٰہیہ یہ تقاضہ نہ کرتی کہ اس کتاب کو لوگوں تک رفتہ رفتہ حوادث وواقعات کے مطابق اتارا جائے تو اسے بھی پہلے نازل کی گئی کتابوں کی طرح ایک ہی مرتبہ اتار دیا جاتا، لیکن اللہ نے اس کے اور پہلی آسمانی کتابوں کے نزول کے درمیان فرق کردیا، اور اس کے نزول کو مُنزّل علیہ (محمد ﷺ) کے اعزاز واکرام کی بناء پر دو حصّوں میں تقسیم کردیا: یکبارگی نزول اور پھر متفرق طور پر بتدریج نزول۔

دوسرا نزول: دوسری مرتبہ اس کا نزول آسمان دنیا سے نبی کریم ﷺ کے قلب مبارک پر تئیس سال کے عرصہ میں بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے ہوا، اور یہ مدت بعثتِ نبویہ ﷺ سے لے کر آپ ﷺ کے وصال تک کے زمانے پر مشتمل ہے، اور اس نزول اور اس کے قسطوار ہونے پر دلیل سورۂ اسراء میں موجود اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: **﴿وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۶)**

''اور قرآن کریم میں ہم نے جا بجا فصل رکھا، تا کہ آپ اس کو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں اور ہم نے اس کو اتارنے میں بھی تدریجاً اتارا۔''

اسی طرح سورۂ فرقان میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (الفرقان: ۳۲)**

''اور کافر لوگ یوں کہتے ہیں کہ ان (پیغمبر) پر یہ قرآن یکبارگی کیوں نہیں نازل کیا گیا، (جواب یہ ہے کہ) اس طرح (تدریجاً) اس لیے (ہم نے نازل کیا) ہے تا کہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لیے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر پڑھ سنایا ہے۔''

روایت میں آتا ہے کہ یہود اور مشرکین نے جب قرآن کے متفرق طور پر نازل ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ پر نکتہ چینی کی، اور یکبارگی نزول کا مطالبہ کیا، یہاں تک کہ یہود نے کہا: اے ابوالقاسم! اس قرآن کو ایک ہی مرتبہ کیوں نازل نہیں کیا گیا جیسا کہ موسیٰ

(علیہ السلام) پر تورات کو نازل کیا گیا تھا؟ تو اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب اور رد میں مذکورۃ الصدر یہ دو آیتیں نازل کیں، اور یہ رد امام زرقانی رحمہ اللہ کے قول کے مطابق دو امور پر دلالت کرتا ہے:

۱-قرآن پاک آپ ﷺ پر بتدریج تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا ہے۔

۲-اس سے پہلے آسمانی کتابیں پوری کی پوری یکبارگی نازل کی گئیں، جیسا کہ جمہور علماء کے درمیان اجماع کی حد تک یہ بات مشہور و معروف ہے۔

ان دو امور پر دلالت بایں طور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے میں اُن کی تکذیب نہیں فرمائی کہ کتبِ سماویہ یکبارگی پوری نازل کی گئی ہیں، بلکہ انہیں قرآن کی بتدریج نازل ہونے کی حکمت بیان فرما کر جواب دیا ہے، اگر آسمانی کتابوں کا نزول قرآن کی طرح متفرق طور پر ہوتا تو اللہ تعالیٰ جواب میں ان کی تکذیب فرماتے اور واضح فرما دیتے کہ بتدریج نزول اللہ تعالیٰ کی پہلے انبیاء پر نازل کی گئی کتابوں میں بھی عادت رہی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید فرمائی تھی جبکہ انہوں نے یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ پر نکتہ چینی کی تھی:

﴿مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۷)

''اس رسول کو کیا ہوا کہ وہ (ہماری طرح) کھانا کھاتا ہے، اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟''۔

تو اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دے کر اُن کی تردید فرمائی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ﴾ (الفرقان:۲۰)

''اور ہم نے آپ سے پہلے جتنے پیغمبر بھیجے سب کھانا بھی کھاتے تھے اور بازاروں میں بھی چلتے پھرتے تھے''۔

قرآن کریم کے قسط وار نازل کرنے کی حکمت: قرآن کریم کے قسط وار نازل ہونے کی بڑی بڑی حکمتیں اور متعدد سربستہ راز ہیں جنہیں اہل علم جانتے ہیں اور اہل جہل ان سے تہی دامن ہیں، ہم ان کا خلاصہ اور نچوڑ درج ذیل الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں، اور وہ یہ ہے:

۱-مشرکین کی تکالیف کے سامنے آپ ﷺ کے قلب مبارک کو مضبوط کرنا۔

۲-وحی کے نزول کے وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمانا۔

۳-احکامِ سماویہ کی قانون سازی میں بتدریج آگے بڑھنا۔
۴-مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کیحفظ اورفہم میں آسانی پیدا کرنا۔
۵-حادثات وواقعات کے ساتھ ساتھ چلنا، اوران کے وقوع کے وقت ہی ان پر متنبہ اور آگاہ کرنا۔
۶-قرآن کے سرچشمہ کی طرف رہنمائی کرنا اور بتانا کہ وہ حکیم اورقابل تعریف ذات کا نازل کردہ ہے۔

آیئے! ہم بعونہ تعالیٰ ان چند حکمتوں کو کچھ تفصیل سے بیان کرتے ہیں جن کو ہم نے مذکورہ بالا سطور میں اجمالاً ذکر کیا ہے:

۱-پہلی حکمت: پہلی حکمت (آپ ﷺ کے قلب مبارک کو مضبوطی) کو درج ذیل آیتِ کریمہ میں مشرکین کے رد میں بیان کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے گذشتہ آسمانی کتابوں کے نزول کی طرح قرآن کے یکبارگی نزول کا مطالبہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی تردید ان الفاظ میں فرمائی: ﴿كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا﴾ (الفرقان: ۳۲)

''اس طرح (تدریجاً) اس لیے (ہم نے نازل کیا) ہے تاکہ ہم اس کے ذریعے سے آپ کے دل کو قوی رکھیں اور (اسی لیے) ہم نے اس کو بہت ٹھہرا ٹھہرا کر پڑھ سنایا ہے۔''

دشمنوں کی طرف سے تکذیب اور آپ ﷺ اور آپ ﷺ کے متبعین کو شدید اذیتیں پہنچانے کے وقت نبی کریم ﷺ کیقلب مبارک کیمضبوطی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے پیغمبر کی خصوصی رعایت وحوصلہ افزائی اور تائید تھی، جب بھی مصیبتیں اور تکالیف پیش آتیں تو آپ ﷺ کی تسلی، دعوت کے راستے میں چلتے رہنے کے لئے آپ ﷺ کی ہمت بڑھانے اور آپ ﷺ کے قلب مبارک کو مضبوط کرنے کے لئے رسولِ خدا ﷺ پر آیاتِ کریمہ نازل کی جاتیں، اللہ تعالیٰ نے اس چیز کے ذریعہ آپ ﷺ کی نگرانی اور حفاظت فرمائی جو آپ ﷺ کے مصائب وآلام کو ہلکا کردیتی، چنانچہ جب کبھی آپ ﷺ کی پریشانیمیں اضافہ ہوجاتا تو آپ ﷺ کی تسلی اور غم کو ہلکا کرنے کے لئے آیات اتر جاتیں۔

اور تسلی کبھی رسولوں اور نبیوں کے واقعات کو ذکر کر کے دی جاتی، تا کہ آپ ﷺ ان کے صبر اور مجاہدے میں ان کی پیروی کریں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَاُوْذُوْا حَتّٰى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا﴾ (الأنعام: ۳۴)

''اور بہت سے پیغمبر جو آپ سے پہلے ہوئے ہیں ان کی بھی تکذیب کی جا چکی ہے، سو انہوں نے اس پر صبر ہی کیا کہ ان کی تکذیب کی گئی اور ان کو ایذائیں پہنچائی گئیں یہاں تک ہماری امداد ان کو پہنچی''۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ﴾ (الأحقاف: ۳۵)

''تو آپ صبر کیجئے جیسے اور ہمت والے پیغمبروں نے کیا''۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا﴾ (الطور: ۴۸)

''اور آپ اپنے رب کی تجویز پر صبر سے بیٹھے رہیئے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں''۔

اور خود اصدق القائلین باری تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو بیان کرنے کی حکمت کی وضاحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَاۗءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَاۗءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (هود: ۱۲۰)

''اور پیغمبروں کے قصوں میں سے ہم یہ سارے قصے آپ سے بیان کرتے ہیں جن کے ذریعے سے ہم آپ کے دل کو تقویت دیتے ہیں، اور ان قصوں میں آپ کے پاس ایسا مضمون پہنچا ہے جو خود بھی راست ہے اور مسلمانوں کے لیے نصیحت ہے اور یاد دہانی ہے''۔

اور تسلی کبھی مدد کے وعدے اور نبی کریم ﷺ کی تائید سے دی گئی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا﴾ (الفتح: ۳)

''اور اللہ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی عزت ہو''۔

اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۚ اِنَّهُمْ لَهُمُ

الْمَنْصُوْرُوْنَ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ﴾ (الصّافات: ۷۱۔۷۳)

''اور ہمارے خاص بندوں یعنی پیغمبروں کے لیے ہمارا یہ قول پہلے ہی سے مقرر ہو چکا ہے کہ بے شک وہی غالب کیے جائیں گے، اور (ہمارا تو قاعدہ عام ہے کہ) ہمارا ہی لشکر غالب رہتا ہے''۔

اور کبھی تسلی نبی کریم ﷺ کے دشمنوں کی شکست اور ناکامی نامرادی کی خبر دے کر ہوتی، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ (القمر: ۴۵)

''عنقریب (ان کی) یہ جماعت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے''۔

اور فرمانِ خداوندی ہے: ﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ﴾ (اٰلِ عمران: ۱۳)

''آپ ان کفر کرنے والوں سے فرما دیجئے کہ عنقریب تم (مسلمانوں کے ہاتھ سے) مغلوب کیے جاؤ گے اور (آخرت میں) جہنم کی طرف جمع کر کے لے جائے جاؤ گے اور وہ (جہنم) ہے برا ٹھکانہ''۔

اس کے علاوہ بھی رسول کریم ﷺ کے قلب مبارک کے غموں کو ہلکا کرنے اور دل جوئی کے مختلف انداز اور طریقے اختیار کئے گئے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ نزول وحی کی تجدّد و تکرار اور جبرئیل امین علیہ السلام کا آپ ﷺ کے لیے تسلی، مدد، حفاظت اور تائید کی واضح آیات لے کر بار بار اترنا آپ ﷺ کے قلب مبارک کو پیغامِ خداوندی کی دعوت و تبلیغ کو جاری رکھنے کے لیے مضبوط کرنے میں بہت ہی مؤثر تھا، کیونکہ اللہ جل جلالہ کی ذات آپ کے ساتھ تھی، پھر کیا وہ شخص ناکامی اور گراوٹ کا تصوّر کر سکتا ہے جس کا اللہ کے لطف و کرم نے احاطہ کر لیا ہو اور اس کی چشمہائے کرم اس کی نگہداشت کر رہی ہوں؟!

۲- دوسری حکمت: دوسری حکمت نزول وحی کے وقت نبی کریم ﷺ کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ فرمانا ہے اور یہ لطف و کرم قرآن کے جلال اور ہیبت کی بناء پر تھا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا﴾ (المزّمّل: ۵)

''ہم تم پر ایک بھاری کلام (مراد قرآن مجید ہے) ڈالنے کو ہیں''۔

پس قرآن یقیناً اللہ کا ایک معجز کلام ہے، اس کا جلال ووقار اور رعب ودبدبہ ہے، اور یہ وہ کتاب ہے اگر اسے پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو وہ اس کی ہیبت اور جلال کی وجہ سے پھٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ﴾ (الحشر: ۲۱)

''اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو (اے مخاطب) تو اس کو دیکھتا کہ خوفِ خدا سے دب جاتا اور پھٹ جاتا''۔

تو پھر کیا حال ہوگا آپ ﷺ کے نرم دل کا؟! کیا اُن کے لیے تمام قرآن کا لینا بغیر کسی تاثر، اضطراب اور قرآن کی ہیبت وجلال کے احساس کے ممکن تھا؟!!

سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا رسول کریم ﷺ کی نزولِ قرآن کے وقت وحی سے پیدا ہونے والی خوف اور گھبراہٹ کی حالت کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتی ہیں: ''وَلَقَدْ رَأَیْتُهٗ حِیْنَ یَنْزِلُ عَلَیْهِ الْوَحْیُ فِي الْیَوْمِ الشَّدِیْدِ الْبَرْدِ فَیَفْصِمُ عَنْهُ۔ أَيْ: یَنْفَصِلُ۔ وَاِنَّ جَبِیْنَهٗ لَیَتَفَصَّدُ [1] عَرَقًا''

''میں نے سخت جاڑے کے موسم میں نزولِ وحی کے آپ ﷺ کی حالت کا مشاہدہ کیا ہے، ایسی سردی میں بھی جب وحی کا سلسلہ ختم ہو جاتا تو آپ ﷺ کی پیشانی مبارک پسینے میں شرابور ہو چکی ہوتی تھی''۔

۳- تیسری حکمت: تیسری حکمت احکامِ سماویہ کی قانون سازی میں بتدریج آگے بڑھنا ہے، اور یہ ایک ظاہر اور بدیہیات ہے، اس لیے کہ قرآن کریم انسانیت اور بالخصوص عربوں کو حکمت کے ساتھ لے کر چلا ہے، پہلے انہیں شرک سے دور کیا، ان کے دلوں کو ایمان کی روشنی کے ذریعے زندہ کیا، اور ان کے سینوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت، بعث بعد الموت اور یوم جزاء پر ایمان کے بیج کو بویا، پھر انہیں اس مرحلہ (یعنی ایمان کی بنیادوں کو ان کے دلوں میں راسخ کرنے کے مرحلہ) کے بعد عبادات کی طرف منتقل کیا، قبل از ہجرت ان سے نماز کا آغاز کروایا، پھر دوسری ہجری میں روزہ اور زکوٰۃ کو بھی ملا دیا،

(۱) ''یتفصّدُ عرقا'' کا معنی ہے پسینہ کا چھوٹ جانا، اور یہ وحی کی شدت اور سخت دباؤ کی وجہ سے ہوتا تھا (از محشی)۔

پھر چھٹی ہجری میں حج کا حکم دے کر یہ مرحلہ بھی مکمل کرلیا، اور اسی طرح موروثی رسم رواج میں بھی یہی طریقہ اپنایا، پہلے انہیں کبائر کے ارتکاب سے روکا، پھر صغائر سے کچھ نرمی کے ساتھ منع کیا، اور اُن کے رگ وریشے میں پیوست ہوجانے والی شراب نوشی، سودخوری اور جوابازی وغیرہ جیسی عادات کو قرآن نے انتہائی حکیمانہ انداز میں بتدریج حرام کیا، اور یوں قرآن کے لیے شر وفساد کی مکمل بیخ کنی ممکن ہوئی۔

اور ہم ایک مثال اس حکیمانہ قانون سازی پر ذکر کرتے ہیں جس کے اختیار کرنے سے معاشرتی امراض کے علاج میں قرآن کو کامیابی حاصل ہوئی، مثلاً تحریم خمر ہے، شراب نوشی عربوں میں ایک لاعلاج اور سنگین بیماری تھی، اس کی بیخ کنی اور مکمل خاتمہ اسلام کے لیے کیسے ممکن ہوا؟!

قرآن کریم نے اس کی تحریم کے سفر کو چار مراحل میں طے کیا، جیسا کہ یہی طریقہ اس نے سود کے حرام کرنے میں بھی اپنایا، قرآن نے شراب کو ایک ہی مرحلہ میں حرام نہیں کیا، کیونکہ ان کے ہاں شراب نوشی کا معاملہ ایسا ہی تھا جیسا کہ ہم میں سے کوئی شخص صاف پانی پیتا ہے، تو حکمت اسی میں تھی کہ اسے ایک ہی مرتبہ میں حرام نہ کیا جائے، لہٰذا قرآن نے اسے بتدریج حرام کیا، پہلے قرآن نے اس سے غیر محسوس انداز میں بالواسطہ نفرت دلائی اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان اترا: ﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾ (النحل: ٦٧)

”اور کھجور اور انگور کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی چیزیں بناتے ہو“۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ اس نے کھجور اور انگور کے ان دو درختوں کو پیدا کر کے لوگوں پر انعام کیا ہے کہ وہ ان دونوں سے ”سکرا“ یعنی نشہ آور شراب اور ”رزقِ حسن“ یعنی لوگوں کے لئے مفید ماکولات ومشروبات حاصل کرتے ہیں، یہاں اللہ تعالیٰ نے دوسری شئی کی مدح بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ”رزقِ حسن“ ہے اور پہلے کے بارے میں فرمایا کہ وہ ”سکر“ ہے یعنی ایسی چیز ہے جو نشہ آور اور انسان کی عقل وشعور کو ختم کردینے والی

ہے، اور اسی وصفی تضاد کے بیان سے ہر عقلمند شخص کے سامنے ان دونوں چیزوں کے درمیان ایک بہت بڑا فرق واضح ہو جاتا ہے۔

دوسرا مرحلہ: پھر بلاواسطہ دو چیزوں کے درمیان عملی موازنہ کے ذریعے نفرت دلائی گئی، ایک چیز جس میں حقیر سا مادّی نفع ہے اور ایک شئ جس میں جسم، صحت اور عقل کا بہت بڑا نقصان ہے اور اس میں ان عظیم نقصانات کے ساتھ ساتھ مزید انسان کا گناہ کبیرہ میں پڑ کر ہلاک ہونا ہے، اللہ کے اس ارشاد کو غور سے سنیے: ﴿يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۭ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ (البقرۃ: ۲۱۹)

''لوگ آپ سے شراب اور جوے کی نسبت دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں (کے استعمال) میں گناہ کی بڑی بڑی باتیں ہیں، اور لوگوں کے (بعضے) فائدے بھی ہیں، اور (وہ) گناہ کی باتیں ان فائدوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہیں''۔

آیت میں منافع سے مراد وہ مادی منافع ہیں جو لوگ شراب فروشی اور اس کی تجارت سے حاصل کرتے تھے کہ وہ تجارت نفع بخش رہتی جیسا کہ وہ جوے کے ذریعے نفع کماتے، قرآن نے اس آیت میں شراب اور جوے کو جمع کیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جوے میں نفع صرف مادی اور دنیوی تھا کہ بعض جواری اس سے نفع پاتے اور یہی بات شراب میں بھی تھی۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ کی تفسیر کے ذیل میں ذکر کیا ہے کہ:

''شراب میں تجارت کا نفع تھا، اس لیے کہ وہ لوگ شراب کو شام سے سستے داموں لے کر آتے اور پھر حجاز میں اسے نفع کے ساتھ بیچتے''۔

اور یہ قول شراب کے نفع کی تعیین کے بارے میں سب سے صحیح ہے، ان دو چیزوں کے درمیان موازنہ سے ظاہر ہوا کہ اسلام نے شراب سے اس کے جسمانی نقصانات بیان کر کے نفرت دلائی، لیکن اسے حرام نہیں کیا۔

اس آیت کے سببِ نزول کے متعلق منقول ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت جس میں

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمیں شراب کے حکم کے بارے میں بتایئے، کیونکہ وہ عقل کو لے جانے والی، مال کو ضائع کرنے والی، جسم کو کمزور ولاغر کرنے والی ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۖ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾

تیسرا مرحلہ: تیسرا مرحلہ شراب کی تحریم کا تھا، لیکن یہ تحریم جزوی تھی، بایں طور کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان نازل ہوا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ﴾ (النساء: ۴۳)

''اے ایمان والو! تم نماز کے پاس بھی ایسی حالت میں مت جاؤ کہ تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہتے ہو''۔

اللہ نے مسلمانوں پر شراب کو صرف نماز کے وقت میں حرام کر دیا تا کہ وہ نشہ میں مدہوش نہ ہوں اور نماز کے اوقات میں بیدار رہیں، اس کے بعد مسلمان رات کو اور نمازوں کے اوقات کے علاوہ میں شراب پیتے تھے، اس آیت کے سببِ نزول کے متعلق روایت ہے کہ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ولیمہ کی دعوت کی اور اس میں چند صحابہ کرام کو مدعو کیا، علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عبد الرحمن نے ہماری دعوت کی اور اس میں ہمیں شراب بھی پلائی، جس نے ہمیں مدہوش کر دیا، نماز کا وقت ہوا تو انہوں نے مجھے امامت کے لئے آگے کر دیا، تو میں نے سورۂ کافرون کی یوں تلاوت کی: ﴿قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ﴾ (الکافرون: ۱-۵)۔ یعنی انہوں نے نشہ کی وجہ سے آیت میں تبدیلی کر دی (اور نفی کو اثبات میں بدل دیا) تو مذکورۃ الصدر آیت نازل ہوئی۔

چوتھا مرحلہ: یہ مرحلہ تحریمِ خمر کا آخری مرحلہ تھا، اس میں شراب کلی طور پر حرام قرار دی گئی، اس نے شراب سے ہر قسم کے تعلق کو کاٹ کر رکھ دیا اور اس کے ہر استعمال کو منع فرما دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

ترجمہ: ''اے ایمان والو! بات یہی ہے کہ شراب، جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم کو فلاح

حاصل ہو، شیطان تو یوں چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور اللہ تعالیٰ کی یاد سے اور نماز سے تم کو باز رکھے، سو اب بھی باز آؤ گے؟!''۔(المائدۃ:۹۰۔۹۱)

ان آیاتِ مبارکہ کا سببِ نزول مفسرین نے یہ بیان کیا ہے کہ بعض صحابہ رضوان اللہ عنہم اجمعین نے نماز عشاء پڑھنے کے بعد ایک مرتبہ شراب پی اور بیٹھ کر قصہ گوئی کرنے لگے، ادھر شراب نے ان کے سروں میں اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا اور نشہ ان کے دماغوں کو چڑھ گیا، اس مجلس میں آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے اور ایک چھوٹی بچی انہیں اشعار اور غزلیں سنا رہی تھی، اس لڑکی نے اپنے ترانے کے درمیان ایک شعر کہا:(۱)

---

(۱) گانے والی لڑکی نے جو اشعار پڑھے جن سے متاثر ہو کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اونٹنیوں کو ذبح کر ڈالا وہ مکمل یہ ہیں:

أَلَا يَا حَمْزُ لِلشُّرُفِ النِّوَاءِ وَهُنَّ مُعَقَّلَاتٌ بِالْفِنَاءِ

ارے حمزہ! ان موٹی موٹی اونٹنیوں کی طرف اٹھئے جو کہ گھر کے سامنے میدان مین بندھی ہوئی ہیں

ضَعِ السِّكِّينَ فِي اللَّبَّاتِ مِنْهَا وَعَجِّلْ مِنْ أَطَايِبِهَا لِشُرْبٍ

ان کے گلے پر چھری رکھ دے اور ان کا اچھا اچھا گوشت شراب پینے والے رفقاء کے لئے جلدی سے لے آ

وضَرِّجْهُنَّ حَمْزَةُ بِالدِّمَاءِ قَدِيداً مِنْ طَبْخٍ أَوْ شِوَاءِ

اور اے! حمزہ انہیں خون میں لت پت کر ڈال بوٹیاں پکائی گئی ہوں یا بھونا ہوا ہو

جس نے یہ شعر منظوم کر کے گانے والی لڑکی کو دیئے اس کا مطلب یہ تھا کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اندر اونٹنیوں کے ذبح کرنے کا جوش پیدا ہو، تا کہ سب حاضرین ان کا گوشت نوش فرمائیں، اور اس کی وجہ یہ تھی حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی سخاوت پہلے سے معلوم و معروف تھی، ان کو ان اشعار میں خطاب کر کے اس کی طرف متوجہ کیا گیا کہ وہ اونٹنیاں کاٹ ڈالیں۔

فائدہ: یاحمز: منادی مرخم ہے، الشرف: شارف کی جمع ہے پانچ سالہ اونٹنی کو کہتے ہیں، النواء: ناویة کی جمع ہے جس کا معنی ہے موٹی ہونا، یہ شرف کی صفت ہے، اللبات: لبة کی جمع ہے گلے کو کہتے ہیں، أطائب: أطيب کی جمع ہے عمدہ گوشت کے معنی میں ہے، اہلِ عرب کے ہاں اونٹ میں کوہان کا اور جگر کا گوشت مرغوب اور عمدہ ہوتا ہے، الشرب: شراب نوشی کرنے والی جماعت، قدید: گوشت کے ٹکڑوں کو کہتے ہیں۔

أَلَا يَا حَمْزُ لِلشُّرُفِ النِّوَاءِ وَهُنَّ معقَّلاتٌ بالفِناءِ(۱)

ترجمہ: ''ارے! حمزہ ان موٹی موٹی اونٹنیوں کی طرف اٹھئے جو کہ گھر کے سامنے میدان میں بندھی ہوئی ہیں''۔

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ان اشعار سے متاثر ہو کر گھر کے سامنے بندھی ہوئی اونٹنیوں پر افروختہ ہو کر اٹھے، اور نشہ کی حالت میں علی رضی اللہ عنہ کی دو اونٹنیوں کی کوہانوں کو کاٹ ڈالا اور ان کے کولھوں کو چیر دیا، علی رضی اللہ عنہ کو اس بات کی خبر دی گئی تو انہیں اس سے بہت دکھ ہوا، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے اس فعل کی شکایت کی، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پاس تشریف لے گئے، اور اس فعل پر انہیں ملامت کی اور غصہ ہوئے، جبکہ حمزہ رضی اللہ عنہ آپ کی طرف ناموس نگاہوں سے دیکھنے لگے، کبھی نگاہ اوپر کرتے اور کبھی نیچے کرتے، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے رفقاء سے مخاطب ہوئے اور کہا: ''وهل أنتم الا عبيدي'' کیا تم سب میرے باپ کے غلام نہیں ہو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ گئے کہ چچا نشہ میں مدہوش ہیں، اس لئے ان کی اس بات پر گرفت نہیں فرمائی، عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت کہا: ''اَللّٰهُمَّ بَيِّن لَنَا فِي الْخَمْرِ بيانا شَافِيا'' یا اللہ! ہمارے لیے شراب کے بارے میں واضح حکم بیان فرمادیں؟ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمادی: ﴿إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ

(۱) غزوۂ بدر میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو غیر معمولی فتح عطا فرمائی، اور کفار کے بڑے بڑے ستر سردار مسلمانوں نے گرفتار کر لئے، قیدیوں کے متعلق بظاہر مسلمانوں کو دو چیزوں میں اختیار دیا گیا، ایک یہ کہ ان کو قتل کر کے دشمن کی شوکت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر لیں، اور دوسرے یہ کہ ان سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے، لیکن اس صورت میں آئندہ سال مسلمانوں کے ستر آدمی شہید ہونگے، ستر مسلمانوں کی شہادت کی خبر میں ایک خفیف سا اشارہ یہ موجود تھا کہ یہ صورت اللہ کے ہاں پسندیدہ نہیں۔

اکثر صحابہ رضی اللہ عنھم نے مسلمان ہونے کی امید پر دوسری صورت کو پسند کیا کہ ان کو فدیہ دے کر آزاد کر لیا جائے، صرف حضرت عمر اور سعد رضی اللہ عنھما وغیرہ چند حضرات نے ان سب کے قتل کی رائے دی، تاکہ کفار کی قوت و شوکت ٹوٹ کر ختم ہو جائے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلافِ رائے کے وقت رحمت و شفقت علی الخلق کی بناء پر قیدیوں کے معاملہ میں آسانی کو اختیار کرتے ہوئے فدیہ لے کر چھوڑنے کی رائے کو قبول کر لیا جس پر یہ عتاب نازل ہوا۔ (معارف القرآن)

وَالْأَنْصَابُ وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ﴾ (المائدة:۹۰)

اوراس طرح بتدریج شراب مکمل طور پر حرام ہوگئی، اسطرح مرحلہ وار شراب کو حرام کرنے میں ایک عظیم الشان حکمت تھی کہ جس پر چل کر اسلام نے ان معاشرتی بیماریوں کا علاج کیا۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مناہل العرفان'' میں صراحت کے ساتھ ذکر کیا ہے: ''اسلام نے شراب جیسی اہلِ عرب کی نس نس میں رچ بس جانے والی برائیوں کی تحریم میں بتدریج حکیمانہ اسلوب اختیار کیا، اورآخر کار شراب نوشی کے بھوت سے انہیں نجات دلا ہی دی، اسلام اس شاندار پالیسی کے اپنانے میں انتہائی دور اندیش، سیدھے راستے پرگامزن، اورقانون سازی اورحکمتِ عملی میں کامیاب رہا بنسبتاً ان متمدن اورمہذّب قوموں کے جواپنی عوام پرشراب کی پابندی میں بری طرح نامراد ہوئیں ہیں، بدترین ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، اورشکست کے کڑوے گھونٹ پینا پڑے ہیں، امریکا کاشراب پر پابندی کا غیر سنجیدہ طریقہ زیادہ دور کی بات نہیں ہے، کیا یہ شراب کی حرمت کا فیصلہ قومی سیاست اورمعاشرتی تہذیب وتمدّن میں اسلام کا معجزہ نہیں؟!!!! کیوں نہیں، تاریخ اس کی گواہی دے رہی ہے۔

۴۔ چوتھی حکمت: چوتھی حکمت مسلمانوں کے لئے قرآن کریم کے حفظوفہم اورغوروفکر میں آسانی پیدا کرنا ہے، جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ عرب اُمی تھے یعنی لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اورقرآن کریم نے ان کے متعلق اس بات کو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں محفوظ کردیا ہے:

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے (عرب کے) ناخواندہ لوگوں میں ان ہی (کی قوم) میں سے (یعنی عرب میں سے) ایک پیغمبر بھیجا جوان کواللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں''۔ (الجمعۃ:۲)

اسی طرح آپ علیہ السلام بھی اُمی تھے، ارشادِ پاک ہے:

ترجمہ: ''جولوگ ایسے رسول کااتباع کرتے ہیں جو کہ اُمی (ناخواندہ) نبی ہیں''۔ (الاعراف:۱۵۷)

پس اللہ کی حکمت متقاضی تھی کہ ان پراپنی بزرگ وبرتر کتاب کوبتدریج نازل

کیا جائے، تاکہ مسلمانوں کے لئے اس کا یاد کرنا آسان اور سہل ہو، کیونکہ اہلِ عرب اپنے حافظہ پر اعتماد کرتے تھے، ان کے سینے ان کے صحیفے تھے (یعنی جو بات سنتے وہ دل میں منقش ہو جاتی تحریری صورت میں ضبط کی ضرورت پیش نہ آتی تھی) جیسا کہ امت محمدیہ ﷺ کی مدح میں بھی یہ وارد ہوا ہے، اور کاتبوں کے کمیاب ہونے کے ساتھ ساتھ کتابت کے آلات بھی انہیں میسر نہ تھے، اگر قرآن یکبارگی اتار دیا جاتا تو وہ لوگ اس کے یاد کرنے سے عاجز آجاتے، اور پھر اس میں غور وفکر کرنے اور سمجھنے میں بھی بے بس ہو کر رہ جاتے۔

۵- پانچویں حکمت: پانچویں حکمت حادثات وواقعات کے ساتھ ساتھ چلنا، اور ان کے وقوع پذیر ہونے کے زمانے میں ان کی غلطیوں پر بروقت آگاہ کرنا ہے، اس لیے کہ بروقت تنبیہ نفسِ انسانی کے لئے زیادہ مؤثر اور اس سے عبرت اور نصیحت حاصل کرنے میں بطور درسِ عملی زیادہ داعی ہے، پس جب بھی کوئی نیا معاملہ پیش آتا تو اس کے موافق قرآن کی آیات اتر جاتیں، اور جب بھی ان سے کوئی غلطی یا کجی صادر ہوتی تو قرآن نازل ہو جاتا جو انہیں بتاتا اور آگاہ کرتا کہ کس چیز سے بچنا مناسب اور کس کام کو طلب کرنا ضروری ہے، اور اس وقت اور زمانے کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا اور ان پر متنبہ کرتا۔

آپ غزوۂ حنین کی مثال لے لیجئے! (اس غزوہ میں مسلمانوں کی کثرت کی وجہ سے) مسلمانوں کے دلوں میں کچھ تکبر آ گیا تھا اور جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی تعداد مشرکین سے بہت زیادہ ہے تو غرور اور تکبر والی باتیں کرنے لگے، اور خود پسندی کے سرایت کرنے کی وجہ سے یہ کہہ بیٹھے: ''لن نغلب الیوم من قلۃ'' ''آج ہم تعداد کی کمی کی وجہ سے ہرگز مغلوب نہ ہوں گے''۔ پھر نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر لی اور شکست وہزیمت سے دوچار ہوئے، اسی کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

ترجمہ: ''(تم کو بہت موقعوں میں غلبہ دیا) اور حنین کے دن بھی جبکہ تم کو اپنے مجمع کی کثرت کی وجہ سے غرّہ ہو گیا تھا، پھر وہ کثرت تمہارے کچھ کارآمد نہ ہوئی تم پر زمین باوجود اپنی فراخی کے تنگی کرنے لگی پھر (آخر) تم پیٹھ دے کر بھاگ کھڑے ہوئے''۔ (التوبہ: ۲۵)

اور اگر قرآن یکبارگی پورا نازل ہو جاتا تو غلطی پر اس کے وقت میں تنبیہ ممکن نہ ہوتی،

اس لیے کہ مؤمنین اوران کی اتراہٹ کے متعلق آیات کے نزول کا تصور کیسے ممکن ہوسکتا ہے، جبکہ وہ واقعہ یا غزوہ ابھی تک رونما نہ ہوا ہو؟!

یہی صورت جنگِ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینے کے بارے میں بھی پیش آئی کہ ان کے بارے میں یہ بہترین آسمانی نصیحت اتری:

ترجمہ: ''نبی کی شان کے لائق نہیں کہ ان کے قیدی باقی رہیں (بلکہ قتل کر دیئے جائیں) جب تک کہ وہ زمین میں اچھی طرح (کفار کی) خونریزی نہ کرلیں''۔ (الانفال: ۶۷)(۷)

۶- **چھٹی حکمت:** چھٹی حکمت قرآن کریم کے سرچشمہ کی طرف رہنمائی کرنا، اور بتانا کہ وہ حکیم اور قابلِ ستائش ہستی کی طرف سے نازل کیا گیا ہے، اس جلیل القدر حکمت کے متعلق علامہ محمد عبدالعظیم زرقانی رحمہ اللہ نے جو عمدہ اور شاندار کلام اپنی کتاب ''مناہل العرفان'' میں کیا ہے، اس کا نقل کرنا ہمارے لیے انتہائی مناسب ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''قرآن کی تدریجاً نازل ہونے کی حکمت قرآن کی سرچشمہ کی رہنمائی کرنا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ یہ اللہ وحدہ لاشریک کا کلام ہے، نہ تو اس کا محمد ﷺ کا کلام ہونا ممکن ہے اور نہ ہی ان کے علاوہ مخلوق میں سے کسی اور فرد کا، اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہم قرآن کریم کو از اول تا آخر پڑھتے ہیں تو وہ مستحکم اندازِ بیان، گہرا اور سلیس کلام، پختہ طرزِ نگارش، وابستگی میں مضبوط، اور اپنی سورتوں، آیتوں اور جملوں میں ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط نظر آتا ہے، الف سے یا تک مکمل قرآن میں اعجاز کا خون رواں ہے، گویا کہ وہ ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا ہے اور اس کے اجزا کے درمیان پھوٹ اور رخنہ نہیں پایا جاتا، گویا کہ وہ موتیوں کی یکتا لڑی اور منفرد ہار ہے جو نگاہوں کو خیرہ کر رہا ہے، اس کے حروف وکلمات منظم اور جملے اور آیتیں باہم مربوط ہیں، یہاں ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن کی یہ معجز تالیف کیسے مرتب ہوگئی؟ اور یہ حیرت انگیز یکسانیت کیونکر ممکن ہوئی؟ حالانکہ اس کا نزول یکبارگی نہیں ہوا، بلکہ بیس سال سے زائد عرصہ میں متفرق واقعات اور حوادث کے مطابق علیحدہ علیحدہ اور متفرق طور پر نازل ہوا؟!

جواب یہ ہے کہ ہم یہاں اعجاز کے رازوں میں سے لے کر ایک نیا راز دیکھتے ہیں

اور ربوبیت کی نشانیوں میں سے ایک نادر نشانی کا مشاہدہ کرتے ہیں، اور قرآن کے سرچشمہ اور جزا و سزا کے مالک اور اللہ وحدہ لاشریک کے کلام ہونے پر روشن دلیل پڑھتے ہیں:

﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا﴾ (النساء: ۸۲)

ترجمہ: ''اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے''۔

اگر یہ بات نہیں ہے تو خدارا! مجھے بتائیے کہ آپ میں اتنی سکت ہے؟ یا تمام مخلوق میں اتنی طاقت ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب لے کر آجائیں جو باہمی ربط و وابستگی میں مستحکم، ترتیب و آراستگی میں مضبوط، ابتداء و انتہاء میں متناسب ہو، حالانکہ وہ اپنی تالیف میں مقدورِ بشری سے ماوراء خارجی عوامل و اسباب کے ماتحت و پابند ہو، (خارجی عوامل سے مراد زمانہ کے وہ واقعات و حوادثات ہیں جن کے مطابق اس کتاب کا ہر ہر جز نازل ہوتا ہے، اور ان کی خبر دیتا ہے، اور وہ یکے بعد دیگرے اور آگے پیچھے وجود میں آتے ہے) باوجودیکہ ان عوامل واسباب کے درمیان اختلاف و تغایر پایا جاتا ہے، اس تالیف کی تکمیل کا زمانہ اور ان بتدریج نازل ہونے والے اجزاء کا عرصہ بھی بیس سال کی زائد برسوں کی لمبی اور طویل مدت پر مشتمل ہے؟!!!

بلاشبہ یہ انفصالِ زمانی اور ان دواعی کے درمیان موجود اختلاف عادۃً رخنہ اور پھوٹ کو مستلزم ہوتے ہیں، جس سے کلام کے اجزا کے درمیان کوئی ربط و اتصال نہیں رہتا (اور ترتیب و تسلسل ٹوٹ جاتا ہے)۔

لیکن قرآن کریم نے یہاں بھی خرقِ عادت کام کیا کہ جدا جدا قسطوں میں نازل ہوتا رہا، لیکن اس کی تکمیل ایک مضبوط و مربوط کلام کی صورت میں ہوئی، کیا یہ روشن دلیل نہیں ہے کہ یہ قرآن قوتوں اور قدرتوں کے خالق، اسباب اور مسببات کے مالک، خلق و کائنات کے منتظم، زمین و آسمان کو تھامنے والے، ماضی و مستقبل کے عالم، اور زمانے اور اس میں رونما ہونے والے واقعات سے باخبر ذات کا کلام ہے؟!!!!

مزید برآں غور کریں کہ رسول اللہ ﷺ پر جب کوئی ایک یا زیادہ آیتیں نازل ہوتیں تو آپ ﷺ فرماتے کہ: ''ضَعُوْهَا فِيْ مَكَانِ كَذَا مِنْ سُوْرَةِ كَذَا'' ''اسے فلاں سورت میں فلاں مقام پر رکھ دو'' حالانکہ آپ ﷺ طبعی طور پر بشر تھے، اس بات سے واقف

نہیں تھے کہ زمانہ آئندہ چل کر کیا لے کر آتا ہے؟ اور نہیں جانتے تھے کہ زمانہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے؟ اور کیا حوادث و واقعات رونما ہوں گے؟ چہ جائیکہ آپ ﷺ کو اس بات کا علم ہو کہ ان واقعات کے بارے میں اللہ کیا نازل فرمائیں گے؟ اسی طرح ایک لمبا عرصہ گذر گیا اور رسول اللہ ﷺ اسی روش پر کاربند رہے، بتدریج تھوڑی تھوڑی وحیٔ قرآنی آپ ﷺ پر نازل ہوتی رہی یہاں تک کہ اس طویل عرصے کے بعد پورا قرآن مکمل و تمام ہوجاتا ہے تو وہ منظوم و مربوط، متناسب اور ملا ہوا ہوتا ہے، اس میں تھوڑا سا بھی رخنہ اور تفاوت نظر نہیں آتا، بلکہ ساری کی ساری مخلوق اپنی ہم آہنگی، یکسانیت اور تال میل کی وجہ سے عاجز کردیتا ہے۔

جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ﴾ (هود: ۱)

"یہ (قرآن) ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں (دلائل سے) محکم کی گئی ہیں، پھر (اس کے ساتھ) صاف صاف بیان (بھی) کی گئی ہیں، ایک حکیم باخبر کی طرف سے"۔

جب آپ جان لیں گے کہ اس طرح کی ترتیب و یکسانیت کی کوئی بھی کوشش قرآن کے نازل کردہ اسلوب انداز کے مطابق کسی کے کلام میں ممکن نہیں ہے، بلکہ اس کے قریب پہنچنا بھی ممکن نہیں، خواہ وہ رسول اللہ ﷺ کا کلام ہو یا دیگر بلغاء یا غیر بلغاء کا کلام ہو کسی کے کلام کی قرآن کے اسلوب تک رسائی ممکن نہیں تو اس اعجاز کا راز آپ پر منکشف ہوجائے گا۔

مثال کے طور پر آپ نبی کریم ﷺ کے اقوال کو لے لیجئے کہ جو رسول اللہ ﷺ سے مختلف مواقع میں متباین اسباب کی وجہ سے طویل عرصہ میں صادر ہوئے ہیں، ان کا اپنے حسن و بلاغت اور پاکیزگی و بلندی میں کیا مقام ہے، لیکن کیا آپ اور سارے کے سارے انسان مل کر اتنی استطاعت رکھتے ہیں کہ ٹکڑوں میں بٹے ہوئے اس منفرد کلام و بیان کو اس میں نقصان و زیادتی اور تصرف کے بغیر ایک ایسی کتاب کی صورت میں مرتب کرسکیں جو سلاست وحدت اور ہم آہنگی سے آراستہ ہو؟!

نہیں، ہرگز نہیں ہوسکتا اور نہ ہی ایسا ہونا ممکن ہے، جو اس کا ارادہ کرے گا تو یقیناً ایک

بیکار مشغلہ میں جان کھپائے گا اور لوگوں کے لیے پیوندزدہ لباس کی طرح ٹوٹا پھوٹا اور ایسا من گھڑت کلام لائے گا جسکا باہم ربط و یگانگت معیوب، وحدت و تسلسل ناپید اور کانوں اور ذہنوں پر وہ ناگوار گزرے گا، تو پھر قرآن پاک کا بتدریج نازل ہونا اس بات کی خبر دے رہا ہے کہ وہ تنہا اللہ کا کلام ہے اور اس کی یہی وہ جلیل القدر حکمت ہے جو قرآن کے منبع کے بارے میں مخلوق کی صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کر رہی ہے:

''آپ کہہ دیجئے کہ اس (قرآن) کو تو ایسی ذات نے اتارا ہے جس کو چھپی باتوں کی کواہ وہ آسمانوں میں ہوں یا زمین میں خبر ہے، واقعی اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے''۔(الفرقان:٦)

نبی کریم ﷺ نے قرآن کو کیسے حاصل کیا؟ نبی اکرم ﷺ نے قرآن کو امین الوحی جبرئیل علیہ السلام کے توسط سے حاصل کیا اور جبرئیل علیہ السلام نے اسے رب العزۃ جل جلالہ سے حاصل کیا، جبرئیل امین علیہ السلام کا کام صرف کلامِ الٰہی کو رسولِ کریم ﷺ تک پہنچانا اور ان کی طرف وحی کرنا تھا۔

پس اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کو اپنے آخری نبی محمد ﷺ پر امین الوحی جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے نازل کیا جبرائیل علیہ السلام نے رسول کریم ﷺ کو اس کی تعلیم دی اور رسول اللہ ﷺ نے اسے اپنی امت تک پہنچایا، اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کیتعریف کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ وحی پر امین ہیں، جس طرح کہ اللہ تعالیٰ سے سنتے ہیں اسی طرح رسول اللہ ﷺ تک پہنچا دیتے ہیں:

''یہ قرآن (اللہ کا) کلام ہے معزز فرشتہ (یعنی جبرئیل علیہ السلام) کا لایا ہوا، جو قوت والا ہے، (اور) مالکِ عرش کے نزدیک ذی رتبہ ہے، (اور) وہاں (یعنی آسمانوں میں) اس کا کہنا مانا جاتا ہے، (اور) امانت دار ہیں (کہ وحی صحیح صحیح پہنچا دیتے ہیں)''۔(التکویر:١٩۔٢١)

اور ان کے بارے میں یہ بھی فرمایا:

''اس کو امانت دار فرشتہ لے کر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تاکہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں''۔(الشعراء:١٩٣۔١٩٥)

بہر حال کلامِ پاک اور کے نازل کرنے والی ذات کی حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ کا کلام اور رب العالمین کا نازل کردہ ہے، جیسا کہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

"اور آپ کو بالیقین ایک بڑے حکمت والے، علم والے کی جانب سے قرآن دیا جارہا ہے"۔ (النمل:٦)

آپ ﷺ نزولِ قرآن کے وقت بہت تکلیف اٹھاتے، اور اپنی جان کو قرآن کو یاد کرنے کے لیے مشقت میں ڈال لیتے تھے، جبرئیل علیہ السلام جب قرآن سناتے تو بھول جانے یا اس میں سے کچھ ضائع ہو جانے کے خوف سے ان کے ساتھ ساتھ دہراتے رہتے، تو اللہ نے آپ ﷺ کو حکم فرمایا کہ جبرئیلؑ کے پڑھنے کے وقت خاموش رہیں اور غور سے سنتے رہیں، اور یہ اطمینان دلایا کہ اللہ تعالیٰ اس قرآن کو آپ کے سینے میں محفوظ فرمادے گا، لہٰذا آپ وحی کے معاملہ میں جلدی نہ فرمائیں اور اس کے حصول میں اپنی جان کو تنگی میں نہ ڈالیں:

"اور قرآن (پڑھنے) میں قبل اس کے کہ آپ پر اس کی وحی پوری نازل ہو چکے عجلت نہ کیجئے، اور آپ یہ دعا کیجئے کہ اے میرے رب! میرا علم بڑھا دیجئے (یعنی تدبیرِ حفظ میں سے تدبیرِ تعجیل کو ترک کریں اور تدبیرِ دعا کو اختیار کریں)"۔ (طٰہٰ:١١٤)

اور حفظ پر کفالت کی دلیل اللہ تعالیٰ کے اس ارشادِ ربّانی میں آئی ہے:

"(اور اے پیغمبر آپ اختتامِ وحیٔ قرآنی سے قبل) اپنی زبان نہ ہلایا کیجئے تاکہ آپ اس کو جلدی لیں، ہمارے ذمہ ہے (آپ کے قلب میں) اس کا جمع کر دینا اور پڑھوا دینا، جب ہم اسے پڑھیں (یعنی ہمارا فرشتہ پڑھے) تو آپ اس کی پیروی کریں، پھر (تبلیغ کے وقت) اس کا بیان کرا دینا ہمارے ذمہ ہے"۔ (القیامۃ:١٦۔١٩)

جبرئیل علیہ السلام رمضان میں آپ ﷺ سے قرآن کا دور فرماتے تھے، بایں طور کہ جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس تشریف لاتے اور غور سے آپ ﷺ کا قرآن سنتے کہ آپ ﷺ ان کے سامنے تلاوت فرماتے اور وہ سنتے، پھر جبرئیل علیہ السلام پڑھتے اور آپ ﷺ سماعت فرماتے، اسی طرح ہر رمضان میں جس قدر قرآن نازل ہو چکا ہوتا ایک مرتبہ آپ علیہ السلام کے ساتھ دور کرتے، آپ ﷺ کے وصال سے پہلے جبرئیل علیہ السلام دو بار تشریف لائے اور دور

فرمایا، ان کے اس دو مرتبہ کے نزول سے آپ ﷺ کو اندازہ ہوگیا کہ میرے وصال کا وقت قریب آچکا ہے، آپ ﷺ نے عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ: ''جبرائیلؑ رمضان میں ہمیشہ ایک بار دور کے لئے میرے پاس تشریف لایا کرتے تھے، اور اس سال دو مرتبہ آچکے ہیں، مجھے یوں لگتا ہے کہ میرے وصال کا وقت قریب ہے''۔

اور یہی ہوا، اسی سال آپ ﷺ اپنے رب کے جوارِ رحمت کی طرف کوچ کر گئے، اور وحی کا سلسلہ بھی آپ ﷺ کی وفات سے منقطع ہوگیا۔

جبرئیل امینؑ نے قرآن کیسے حاصل کیا؟ رہا یہ کہ جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے قرآن کو کیسے حاصل کیا؟ تو ماقبل میں ہمارے سامنے یہ آچکا ہے کہ یہ سَماعاً تھا کہ جبرئیل علیہ السلام نے اللہ تبارک وتعالیٰ سے ان آیات کو سنا پھر اسے لے کر رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئے۔

علامہ بیہقی رحمہ اللہ اللہ کے ارشاد: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ کی تفسیر کے تحت فرماتے ہیں کہ:

''مراد یہ ہے کہ (واللہ اعلم) ہم نے فرشتہ کو سنایا اور اسے اس کا مفہوم بھی سمجھایا اور پھر ہم سماعت کردہ آیات کے ساتھ اسے اتارا''۔

یعنی اس کا مطلب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے قرآن کا حصول اللہ سے سن کر کیا، اور اس کی تائید اس روایتِ حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''اذا تکلّم اللہ بالوحي'' الخ

''جب اللہ تعالیٰ وحی پر تکلم فرماتے ہیں تو خوفِ الٰہی سے آسمان پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے، جس سے آسمان کے باسی بے ہوش سے ہوکر سجدے میں گر پڑتے ہیں، پھر سب سے پہلے جبرئیلؑ اپنا سر اٹھاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ وحی میں سے جو چاہتے ہیں اس سے تکلم فرماتے ہیں پھر وہ اس کلام کو لے کر فرشتوں کی طرف چلے جاتے ہیں، جب ان کا کسی آسمان سے گزر ہوتا ہے تو وہاں کی مکین سوال کرتے ہیں کہ ہمارے رب نے کیا فرمایا ہے؟ جبرئیل کہتے ہیں سچ فرمایا، پھر وحی کو بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ جاتے ہیں''۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''مناہل العرفان'' میں رقم طراز ہیں:

''کہ بعض لوگوں نے بزعمِ خود یہ احمقانہ بات کہی ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نبی اکرم ﷺ پر قرآن کیمفہوم کو لے کر اترتے تھے، اور رسول اللہ ﷺ اسے عربی زبان

میں منتقل کر کے بیان فرماتے، اور بعض دوسروں کا یہ خیال ہیکہ الفاظ تو جبرئیل علیہ السلام کے ہوتے تھے اور اللہ تعالیٰ صرف معانی کی وحی فرماتے، یہ دونوں قول باطل، سراسر گناہ ہیں اور قرآن وسنت اور اجماعِ امت کے نصوص سے متصادم ہیں، اور اس سیاہی جیسی وقعت بھی نہیں رکھتے جو لکھنے کے کام آتی ہے، اور میرا عقیدہ یہ ہے کہ یہ بات مسلمانوں کی کتابوں میں ایک سازش کے تحت داخل کی گئی ہے، ورنہ قرآن اس وقت کیسے معجز ہوسکتا ہے جبکہ اس کے الفاظ محمد ﷺ یا جبرئیل علیہ السلام کے القاء کردہ ہوں، پھر ان کی نسبت اللہ کی جانب کیسے صحیح ہوسکتی ہے جبکہ لفظ اللہ کا بیان کردہ نہیں ہو؟! حالانکہ اللہ کا فرمان ہے: ﴿حتی یسمع کلام الله﴾ (التوبة: ٦)" تاکہ کلام الٰہی سن لے"۔ اس کے علاوہ بھی یہاں بات کی بہت گنجائش ہے جو ہم سے ایک لمبی تفصیل کا تقاضا کرتی ہے"۔

کیا سنتِ نبویہ بھی وحیٔ الٰہی ہے؟ ماقبل میں ہمارے سامنے یہ بات وضاحت سے آگئی کہ قرآن کریم اللہ کا کلام ہے، اور اس کا معنی یہ ہے کہ الفاظ اور معانی دونوں اللہ کی جانب سے ہیں، اس میں جبرئیل علیہ السلام یا محمد ﷺ کا سوائے اللہ کے کلام کی تبلیغ کے اور کوئی دخل نہیں، اور احادیثِ نبویہ بھی اسی طرح وحیٔ الٰہی میں سے ہیں، لیکن اس میں الفاظ رسول اللہ ﷺ کے اور معانی اللہ کی طرف سے ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ترجمہ: "اور نہ آپ اپنی خواہشاتِ نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے (خواہ الفاظ کی بھی وحی ہو، جیسے قرآن، یا صرف معانی کی وحی ہو، جیسے سنت، اور خواہ وحی جزئی ہو یا کسی قاعدۂ کلیہ کی وحی ہو جس سے اجتہاد فرماتے ہوں)"۔ (النجم: ۳۔۴)

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جوینی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

"اللہ کے نازل کردہ کلام کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے: "اس نبی سے کہہ دیجیے کہ جس کی جانب تمہیں بھیجا جا رہا ہے کہ اللہ فرماتے ہیں: "یہ یہ کام کرو اور فلاں فلاں حکم کرو"۔ تو جبرئیل علیہ السلام اللہ کے فرمان کو سمجھ لیتے، پھر اس نبی پر نازل ہو کر اللہ تعالیٰ کے فرمودات بیان کر دیتے لیکن الفاظ وہ نہ ہوتے۔

یہ اسی طرح ہے جیسا کہ ایک بادشاہ اپنے معتمدِ خاص سے کہتا ہے: "فلاں سے کہہ دو

کہ بادشاہ تمہیں کہتا ہے کہ: ''خدمت میں خوب محنت کرو اور اپنے لشکر کو جنگ کے لیے اکٹھا کرو''۔ پھر اگر قاصد اس سے کہے کہ: ''بادشاہ آپ سے کہتا ہے کہ ''میری خدمت میں سستی نہ کرو اور لشکر کو منتشر نہ ہونے دو اور انہیں قتال پر برانگیختہ کرتے رہو''۔ تو اس کی اس بات کو جھوٹ اور پیغام میں کوتاہی نہیں کہا جائے گا۔

دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جبرئیل علیہ السلام سے فرماتے: ''نبی پر یہ مکتوب پڑھ لو''۔ تو جبرئیل علیہ السلام اسے بغیر کسی تبدیلی کے اللہ کی طرف سے من وعن نازل کر دیتے، جیسا کہ بادشاہ ایک خط لکھتا ہے اور اسے با اعتماد امین کے حوالہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ: ''اسے فلاں کو جا کر سنا آؤ''۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں قرآن دوسری قسم سے ہے جبکہ پہلی قسم سنت کہلاتی ہے، اور اسی بناء پر قرآن کریم کے برعکس حدیث کی روایت بالمعنی جائز ہے۔

☆☆......☆☆
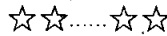
تیسری فصل

اسبابِ نزول

آیت کریمہ کا معنی سمجھنے میں اسباب نزول کی معرفت کا بہت بڑا اثر ہے، اسی بنا پر علماء کی ایک بڑی تعداد نے اسباب نزول کی معرفت کا بڑا اہتمام کیا، اور اس کے لیے بہت سارے علمائے کرام نے مستقل تصانیف لکھیں جن میں سب سے نمایاں اور سرِ فہرست امام بخاری رحمہ اللہ کے استاذ حضرت علی بن المدینی رحمہ اللہ ہیں، اس فن میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے مشہور علامہ واحدی کی کتاب ''أسباب النزول'' ہے، اسی طرح شیخ الاسلام علامہ ابن حجر رحمہ اللہ کی بھی اس فن میں گراں قدر تصنیف ہے، بعد از اں علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی اس پر ایک بڑی ضخیم کتاب تصنیف کی جس کا نام انہوں نے ''لبابُ النقول فی أسباب النزول'' رکھا۔

قرآنی علوم کی اس نوع (سببِ نزول) کی اہمیت کو جاننے اور آیاتِ مبارکہ کے معانی کو سمجھنے میں اس کی ضرورت کی تاکید کے پیشِ نظر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بعض آیات کے معانی کا سمجھنا، اس کے احکام کا جاننا اسبابِ نزول کی روشنی میں ہی ممکن ہے۔

مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ (البقرة: ۱۱۵)

ترجمہ: ''اور اللہ کی مملوک ہیں (سب جہتیں) مشرق بھی اور مغرب بھی، پس تم لوگ جس طرف منہ کرو (ادھر ہی) اللہ تعالیٰ کا رخ ہے''۔

اس آیت سے بظاہر نماز میں غیر قبلہ کی طرف منہ کرنے کا جواز سمجھ آتا ہے جبکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، کیونکہ استقبالِ قبلہ تو نماز کی صحت کے لیے شرط ہے، تاہم سببِ نزول کو جاننے سے آیت کا سمجھنا بالکل آسان اور واضح ہو جاتا ہے کہ یہ آیتِ مبارکہ ایسے شخص

کے بارے میں نازل ہوئی جو کہ مسافر ہو اور قبلہ گم کر دے، اس کی جہت و سمت کا اسے علم نہ ہو، تو وہ کوشش و تحرّی کر کے نماز پڑھ لے گا، لہٰذا جس سمت بھی اس نے رخ کر کے نماز پڑھی اس کی نماز صحیح ہوگی، اسے نماز کی تکمیل کے بعد اپنی سمت کی غلطی معلوم ہوگئی تو اس پر نماز کا اعادہ ضروری نہیں، معلوم ہوا کہ یہ آیت عام نہیں بلکہ یہ صرف اس شخص کے بارے میں ہے کہ جو قبلہ سے ناواقف ہو اور اسے اس کی سمت کا ادراک نہ ہو۔

آیت کے سمجھنے میں اسبابِ نزول کی اہمیت کی دوسری مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (المائدة: ۹۳)

ترجمہ: ''ایسے لوگوں پر جو کہ ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں اس چیز میں کوئی گناہ نہیں جس کو وہ کھاتے پیتے ہوں، جبکہ وہ لوگ پرہیز رکھتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں اور نیک کام کرتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور ایمان رکھتے ہوں پھر پرہیز کرنے لگتے ہوں اور خوب نیک عمل کرتے ہوں اور اللہ تعالیٰ ایسے نیکوں کاروں سے محبت رکھتے ہیں''۔

یہ آیت شراب کے متعلق نازل ہوئی، اور اس آیتِ مبارکہ سے بظاہر شراب پینے کا جواز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ بعض ناواقف لوگوں نے یہ گمان کیا اور کہنے لگے کہ شراب کا پینا جائز ہے اور دلیل میں یہ آیت پیش کرنے لگے، اگر وہ اس کے سببِ نزول سے واقف ہوتے تو یہ جھوٹ کبھی نہ گھڑتے۔

مروی ہے کہ جب شراب کی حرمت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا:

﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (المائدة: ۹۰)

ترجمہ: ''بات یہی ہے کہ شراب اور جوا اور بت وغیرہ، اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں، شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم فلاح پاؤ''۔

اس پر بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کہا کہ ان کا کیا ہوگا جو اللہ کے راستے

میں شہید کر دیئے گئے اور اللہ کو پیارے ہو گئے اور وہ شراب بھی پیا کرتے تھے جبکہ یہ گندی اور نجس ہے؟

تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی جس نے واضح کر دیا کہ وہ لوگ جنہوں نے شراب کی حرمت سے پہلے اسے پیا تھا اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے اور ان پر کوئی گناہ یا جرم نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ بندہ کی قبل از اسلام یا قبل از حکمِ تحریم صادر ہونے والی خطاؤں پر گرفت نہیں فرماتے، اور اسی (سببِ نزول) سے آیت کا معنی و مراد سمجھ میں آ جاتا ہے اور نص قطعی اسی طرح شربِ خمر کی حرمت پر باقی رہتا ہے۔

اسبابِ نزول کی معرفت کے فوائد: بعض حضرات کا خیال ہے کہ تاریخ و واقعات کے مرتبہ میں ہونے کی وجہ سے اس فن (سببِ نزول کی معرفت) کا کوئی معتد بہ فائدہ ہے اور نہ ہی اس کی کوئی نمایاں تاثیر ہے، کیونکہ اسبابِ نزول کی معرفت ان کے خیال میں کتاب اللہ کی تفسیر کے طالب کیلئے کوئی ضروری چیز نہیں؛ لیکن یہ گمان فاسد اور بات نا قابل اعتبار اور غلط ہے، عالمِ قرآن اور مفسرینِ کرام کے اقوال سے باخبر شخص سے ایسی بات کا صدور ممکن نہیں۔

آیئے ہم بعض علما کی کچھ آراء نقل کرتے ہیں، پھر اس کے بعد اسبابِ نزول کے فوائد کو بھی (انشاء اللہ) ذکر کریں گے۔

علّامہ واحدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''کسی آیت کی تفسیر کا جاننا اس کے واقعہ اور نزول کے بیان پر واقف ہوئے بغیر ممکن نہیں''۔

ابن دقیق العید رحمہ اللہ کا قول ہے:

''سببِ نزول کو بیان کرنا قرآن کے معانی کو سمجھنے کے لیے ایک مستحکم طریقہ ہے''۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''سببِ نزول کا جاننا آیت کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے، کیونکہ علم بالسبب مُفضی ہوتا ہے علم بالمسبب کی طرف''۔

اور اس طرح علومِ قرآن کی اس نوع کی اہمیت آشکارا ہو جاتی ہے، البتہ اس کے فوائد کی تلخیص درج ذیل امور میں ہمارے لیے بیان کرنا ممکن ہے:

۱-حکم کی مشروعیت پر باعث، حکمت کا پہچاننا۔

۲-حکم کا سبب کے ساتھ خاص کر دینا (اُن حضرات کے ہاں جو خصوصِ سبب کے معتبر ماننے کے قائل ہیں)

۳-ظاہرِ حصر کی صورت میں حصر کے وہم کو دور کرنا۔

۴-اس شخص کے نام کی معرفت جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی اور آیت میں مبہم کی تعیین۔

اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سارے عظیم فوائد ہیں (جو کہ مطولات میں مذکور ہیں)

اسباب نزول کی معرفت کے فائدہ کی چند مثالیں: ۱-مروان بن حکم پر اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کے مطلب کا سمجھنا مشکل ہو گیا: ﴿لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ﴾ (ال عمران: ۱۸۸)

ترجمہ: ''جو لوگ ایسے ہیں کہ اپنے کردار پر خوش ہوتے ہیں اور جو کام نہیں کیا اس پر چاہتے ہیں کہ ان کی تعریف ہو، سو ایسے شخصوں کو ہرگز ہرگز مت خیال کرو کہ وہ خاص طور کے عذاب سے بچاؤ میں رہیں گے''۔

مروان نے اپنے خادم سے کہا کہ ابن عباس (رضی اللہ عنہما) کے پاس چلے جاؤ اور انہیں کہو کہ اگر ہر اس شخص کو عذاب دیا جائے گا جو اپنی کسی عطا پر خوش ہو اور نا کردہ پر اپنی تعریف کو پسند کرے تو پھر تو ہم سب عذاب میں گرفتار ہو نگے؟

اس پر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے مروان سے اس آیت کا ایسا معنی بیان کیا جس نے اس کے اشکال کو رفع کر دیا، آپ نے اس سے فرمایا کہ یہ آیت اہلِ کتاب یعنی یہود کے متعلق نازل ہوئی، جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کسی چیز کے بارے میں دریافت فرمایا تو انہوں نے اس بات کو چھپا دیا اور اس کے بجائے دوسری بات کی خبر دی، اور تاثر یہ دیا کہ انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی بات کی خبر دی ہے جس کے بارے میں پوچھا تھا، پھر اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تعریف کے بھی خواہاں ہوئے تب یہ آیت نازل ہوئی۔

۲-اسی طرح حضرت عروہ بن زبیر رضی اللہ عنہما پر بھی اللہ تعالیٰ کے اِس ارشاد کا سمجھنا مشکل

ہو گیا: ﴿اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (البقرۃ: ۱۵۸)

ترجمہ: ''تحقیقاً صفا اور مروہ منجملہ یادگارِ (دینِ) خداوندی ہیں، سو جو شخص حج کرے بیت اللہ کا یا (اس کا) عمرہ کرے اس پر ذرا بھی گناہ نہیں ان دونوں کے درمیان آمدورفت کرنے میں (جس کا نام سعی ہے)''۔

کیونکہ آیتِ مبارکہ کے ظاہر سے سعی بین الصفا والمروہ کے عدمِ وجوب کا علم ہوتا ہے، اسی لئے حضرت عروہ بن زبیر نے اپنی خالہ ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ خالہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ اس لیے میرا خیال ہے کہ کوئی شخص اگر سعی بین الصفا والمروہ کو چھوڑ دے تو کوئی مضائقہ نہیں؟

اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: بھانجے! تیرا کہنا کیا ہی برا ہے!! اگر معاملہ ایسے ہی ہوتا جیسا کہ تو نے ذکر کیا تو اللہ یوں فرماتے: ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ لَّا يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ پھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بتایا کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ سعی بین الصفا والمروہ کرتے اور اپنی سعی کے درمیان دو بتوں کا بھی قصد وارادہ کرتے، جن میں سے ایک ''اساف نامی'' بت تھا جو کہ کوہِ صفا پر نصب تھا اور دوسرا ''نائلہ'' نامی جو کہ کوہِ مروہ پر نصب تھا۔

پھر جب لوگ اسلام میں داخل ہوئے تو بعض صحابہ نے زمانہ جاہلیت کی پرستش کے ساتھ اس معاملہ کے اشتباہ کے خوف سے سعی بین الصفا والمروہ میں حرج اور تنگی محسوس کی، اس پر یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس نے صحابہ کرام سے گناہ وحرج کے تصور کو دور کر دیا اور بتوں سے ہٹ کر خالص اللہ تعالیٰ کے لیے سعی کو ضروری قرار دیا۔

چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عروہ بن زبیر کی مراد (جو انہوں نے اس آیت سے سمجھی تھی) کو رد کر دیا اور یہ سببِ نزول ہی کی بنا پر ہوا۔

۳۔ بعض ائمہ کرام پر اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان میں شرط کے معنی کا سمجھنا بھی دشوار ہو گیا: ﴿وَالّٰٓـئِىْ يَئِسْنَ مِنَ الْمَحِيْضِ مِنْ نِّسَآئِكُمْ اِنِ ارْتَبْتُمْ فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ اَشْهُرٍ﴾ (الطلاق: ۴)

ترجمہ: ''اور تمہاری (مطلقہ) بیبیوں میں سے جو (بوجہِ زیادتِ عمر کے) حیض

آنے سے مایوس ہو چکی ہیں، اگر تم کو (ان کی عدت کی تعیین میں) شبہ ہو تو ان کی عدت تین مہینے ہے"۔

اسی بنا پر اصحابِ ظواہر نے کہہ دیا کہ آئسہ عورت (جس کا حیض آنا کبرِ سنی اور دیری کی وجہ سے بند ہو چکا ہو) کو اگر (اپنے آئسہ ہونے میں) کوئی شک نہ ہو تو اس پر کوئی عدت لازم نہیں، اور ان کے فہم کی یہ غلطی سببِ نزول ہی سے آشکارا ہوئی، کیونکہ آیت میں ان لوگوں سے خطاب ہے جو ان عورتوں کی عدت کے حکم سے ناواقف ہیں اور شک میں مبتلا ہیں کہ آیا ان پر عدت لازم ہے یا نہیں؟

تب ﴿إِنِ ارْتَبْتُمْ﴾ کا معنی ہوگا: "اگر تم پر ان کا حکم مشکل و دشوار ہو جائے اور تمہیں علم نہ ہو کہ ان کی عدت کیسے شمار کی جاتی ہے تو ان کا حکم یہ ہے: ﴿فَعِدَّتُهُنَّ ثَلٰثَةُ أَشْهُرٍ﴾ یعنی "اُنکی عدت تین مہینے ہے"۔

جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ بعض اُن عورتوں کی عدت کے بارے میں حکم قرآن میں مذکور نہیں جو کہ بچیاں اور ناامید عورتیں ہیں؟

پس یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی جس نے ان میں سے ہر ایک کا حکم صراحت کے ساتھ بیان فرما دیا۔ واللہ اعلم۔

۴- اسبابِ نزول کی معرفت کے فوائد کی مثالوں میں سے ایک مثال امام شافعی رحمہ اللہ سے مروی قول بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اِس فرمان میں حصر کے وہم کو دور کرنے کے لیے ذکر کیا گیا ہے: ﴿قُلْ لَّآ أَجِدُ فِيْ مَآ أُوْحِيَ إِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ إِلَّآ أَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً أَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا أَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَإِنَّهٗ رِجْسٌ أَوْ فِسْقًا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَإِنَّ رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴾ (الأنعام: ۱۴۵)

ترجمہ: "آپ کہہ دیجیے کہ جو کچھ احکام بذریعہ وحی میرے پاس آئے ہیں ان میں تو میں کوئی حرام غذا نہیں پاتا کسی کھانے والے کے لئے جو اسکو کھاوے، مگر یہ کہ وہ مردار (جانور) ہو یا کہ بہتا ہوا خون ہو، یا خنزیر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ بالکل ناپاک ہے یا جو (جانور وغیرہ) شرک کا ذریعہ ہو کہ غیر اللہ کے نامزد کر دیا گیا ہو، پھر جو شخص بیتاب ہو جاوے بشرطیکہ نہ تو طالبِ لذت ہو اور نہ تجاوز کرنے والا ہو

(قدرِ ضرورت سے) تو واقعی آپ کا رب غفور و رحیم ہے"۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں جس کا مفہوم یہ ہے کہ کفار نے اپنی اسلام سے ہر بات میں دشمنی اور مخالفت کرنے کی وجہ سے جب اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ ہر چیز کو اپنے نفسوں پر حرام اور حرام کردہ ہر چیز کو حلال قرار دیا تو یہ آیت اُن کی غرض کے مخالف نازل کی گئی۔

گویا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حلال وہی ہے جسے تم حرام کہتے ہو اور حرام بھی وہی ہے جسے تم حلال سمجھ رہے ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مراد یہ نہیں ہے کہ اِن مذکورہ اشیاء کے علاوہ تمام حلال ہیں، بلکہ مقصود ان اشیاء کی حرمت کا اثبات ہے نہ کہ ماسوا کے لیے حلت کو ثابت کرنا۔ (۱)

امام الحرمین رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

یہ انتہائی بہترین بات ہے اور اگر امام شافعی رحمہ اللہ اِس مفہوم کی طرف سبقت نہ کر چکے ہوتے تو ہم محرمات کو آیت میں ذکر کردہ اشیاء میں منحصر کرنے میں امام مالک رحمہ اللہ کے قول کی مخالفت نہ کر سکتے۔ (۲)

آیت مبارکہ کے معنی ومقصود کی وضاحت: اِس رائے کی وضاحت کے لیے میں کہتا ہوں کہ بے شک آیتِ مبارکہ کا ظاہر آیت میں مذکورہ اشیاء میں محرّمات کے منحصر ہونے پر دلالت کرتا ہے جبکہ حقیقت اس طرح نہیں، کیونکہ مذکورہ اشیا کے علاوہ بھی محرمات ہیں اور آیت کا حصر کی صورت میں نازل ہونا جبکہ اس سے مقصود حصر نہ تھا صرف مشرکین پر رد کے لیے تھا، کیونکہ انہوں نے اللہ کی حلال کردہ اشیاء کو حرام اور حرام کی گئی اشیاء کو حلال قرار دیا تھا۔

۵- اور سببِ نزول کے فوائد کی مثالوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم اس شخص کا نام جان لیں جس کے متعلق آیت نازل ہوئی ہے تاکہ التباس اور ابہام دور ہو جائے۔

جیسا کہ مروان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ﴿وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ...﴾ حضرت عبدالرحمن بن ابی بکر رضی اللہ عنہما کے بارے میں نازل ہوا ہے، لیکن حضرت

---

(۱) یعنی اس آیت میں کفار کی خودساختہ تحریم وتحلیل کی ضد کا اظہار مقصود ہے، کہ جو چیزیں حلال ہیں انہیں تو حرام قرار دیا اور جو حرام ہیں انہیں حلال سمجھتے ہیں، حقیقی نفی واثبات مقصود نہیں ہے۔

(۲) امام مالک رحمہ اللہ کے ایک قول کے مطابق محرمات آیت میں ذکر کردہ اشیاء میں منحصر ہیں۔

عائشہ رضی اللہ عنہا نے اس باطل خیال کو رد کر دیا اور اس کے سببِ نزول کی وضاحت فرما دی۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس قصہ کو تفصیلاً ذکر کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

''مروان مدینہ کا حاکم تھا، چنانچہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ وہ یزید کو خلیفہ بنا دیں، اس لیے انہوں نے مروان کی طرف یہ بات لکھی، تو مروان نے لوگوں کو جمع کیا اور تقریر کی جس میں یزید کا ذکر کیا اور اس کی بیعت کی طرف بلایا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے امیر المؤمنین کو یزید کے بارے میں اچھی رائے سجھائی ہے، وہ اگر اسے (اپنی زندگی میں) خلیفہ بناتے ہیں تو ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما نے بھی (اپنی زندگی میں) خلیفہ کا انتخاب کیا تھا۔

یہ سن کر حضرت عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے کہا یہ تو نری ہرقلیت ہے (یعنی یہ تو شاہانِ روم کی طرح مطلق العنان حکومت کا قیام ہے)۔

مروان نے کہا کہ یہ ابوبکر و عمر کی سنت ہے نہ کہ شاہانِ روم کی نقل۔

عبدالرحمن رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ نہیں ...... ہرقلیت ہی ہے، بخدا ابوبکرؓ نے خلافت کو اپنی اولاد میں رکھا اور نہ ہی گھر والوں میں، معاویہؓ کا اپنے لڑکے کو خلافت سے نوازنا صرف اس کی دلداری اور اعزاز کے لیے ہے۔

اس پر مروان نے حکم دیا کہ اسے پکڑ لو، تاہم عبدالرحمنؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں داخل ہو گئے اور وہ لوگ اسے پکڑ نہ سکے۔

تو مروان نے کہا کہ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے: ﴿وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَاۤ اَتَعِدٰنِنِیْۤ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ ۚ وَهُمَا یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰهَ وَیْلَكَ اٰمِنْ ۖۗ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚۖ فَیَقُوْلُ مَا هٰذَاۤ اِلَّاۤ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ﴾ (الأحقاف: ۱۷)

ترجمہ: ''اور جس نے اپنے ماں باپ سے کہا کہ تُف ہے تم پر، کیا تم مجھ کو یہ وعدہ (یعنی خبر) دیتے ہو کہ میں (قیامت میں دوبارہ زندہ ہو کر) قبر سے نکالا جاؤں گا، حالانکہ مجھ سے پہلے بہت سی امتیں گزر گئیں، اور وہ دونوں اللہ فریاد کر رہے ہیں، ارے تیرا ناس ہو! ایمان لا، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، تو یہ کہتا ہے کہ یہ بے سند باتیں اگلوں سے منقول چلی آ رہی ہیں''۔

اس پر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے پردے کے پیچھے سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی بات بھی قرآن میں ہمارے متعلق نازل نہیں فرمائی مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے میرے عذر (یعنی براءت) کو نازل فرمایا اور اگر میں اس شخص کا نام بتانا چاہوں جس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی ہے تو بتا سکتی ہوں۔

سببِ نزول کیا ہے؟ کبھی کوئی واقعہ یا حادثہ رونما ہوتا ہے تو اس واقعہ یا حادثہ کے سلسلہ میں کوئی ایک آیت یا چند آیاتِ مبارکہ نازل ہو جاتی ہیں، تو اسی واقعہ یا حادثہ کو سببِ نزول کہا جاتا ہے۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی معاملہ میں حکمِ شرعی کو دریافت کرنے کے لیے سوال کیا جاتا یا کوئی دین کی بات اور مسئلہ پوچھا جاتا تو بعض آیاتِ مبارکہ اس کے جواب میں نازل ہوتیں تو اس استفسار کو بھی سببِ نزول کہتے ہیں۔

حادثہ کی مثال وہ روایت ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:

''میں مکہ میں لوہے کا کام کیا کرتا تھا (یعنی لوہار تھا) اور عاص بن وائل پر میرا کچھ قرض تھا، میں اس کے پاس آیا اور اپنا قرضہ طلب کیا تو اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہیں تمہارا قرض ادا نہیں کروں گا جب تک تم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہ کرو گے اور لات اور عزی کی پرستش نہ کرو گے، تو میں نے کہا بخدا! میں کفر اختیار نہیں کرونگا یہاں تک کہ اللہ تمہیں مار کر پھر زندہ کرلے، (یعنی تا قیامت ایمان پر قائم رہوں گا) تو اس نے کہا تب تو میں مروں گا پھر اٹھایا جاؤں گا لہٰذا تم میرا اس دن تک انتظار کرو، پھر جب مجھ کو مال اور اولاد عطا کی جائیگی تو میں تیرا قرضہ ادا کردوں گا، اس پر اللہ نے اپنا یہ ارشاد نازل فرمایا: ﴿أَفَرَءَيْتَ الَّذِي كَفَرَ بِآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالًا وَوَلَدًا أَطَّلَعَ الْغَيْبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحْمَٰنِ عَهْدًا كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأْتِينَا فَرْدًا﴾ (مریم: ۷۷۔۸۰)

ترجمہ: ''بھلا آپ نے اس شخص (کی حالت) کو بھی دیکھا جو ہماری آیتوں کے ساتھ کفر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ مجھ کو (آخرت میں) مال اور اولاد ملیں گے! کیا یہ

شخص غیب پر مطلع ہو گیا ہے یا کیا اس نے اللہ تعالیٰ سے کوئی عہد (اس بات کا) لے لیا ہے؟ ہر گز نہیں (محض غلط کہتا ہے اور) ہم اس کا کہا ہوا ابھی لکھے لیتے ہیں، اس کے لیے عذاب بڑھاتے چلے جائیں گے اور اس کی کہی ہوئی چیزوں کے ہم وارث رہ جائیں گے اور وہ ہمارے پاس (مال و اولاد سے) تنہا ہو کر آئے گا''۔

سوال کی مثال وہ خبر ہے جو حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہود ہمیں مکمل آ لیتے ہیں اور چاندوں کی حالتوں کے بارے میں بہت زیادہ پوچھتے ہیں، پس کیا وجہ ہے کہ چاند (شروع میں) بالکل باریک نظر آتا ہے پھر بڑھنے لگتا ہے یہاں تک کہ وہ برابر گول ہو جاتا ہے اور دوبارہ گھٹنا شروع ہوتا ہے یہاں تک اپنی پہلی حالت پر لوٹ آتا ہے؟

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ﴾ (البقرۃ: ۱۸۹)

ترجمہ: ''وہ آپ سے چاندوں کے حالات کی تحقیقات کرتے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ وہ چاند آلۂ شناختِ اوقات ہیں لوگوں کے (اختیاری معاملات مثل عدت و مطالبۂ حقوق) کے لئے اور (غیر اختیاری عبادات مثلِ روزہ و) حج (و زکوٰۃ وغیرہ) کیلئے''۔

سببِ نزول کی پہچان کا طریقہ: ماقبل کی بحث سے ظاہر ہوا کہ اسبابِ نزول کی معرفت قیاس اور عقل کے ذریعے ممکن نہیں، بلکہ اس کے لئے ایسے حضرات سے صحیح روایت اور سماع کا ہونا ضروری ہے جنہوں نے نزولِ قرآن کا مشاہدہ کیا ہو یا اسبابِ نزول پر مطلع ہوئے ہوں اور ان کی تحقیق کی ہو، جیسے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین یا تابعین اور ان کے علاوہ وہ حضرات جنہوں نے معتبر اور مستند علماء کے ہاتھوں علم حاصل کیا۔

علامہ ابن سیرین رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت عَبِیدہؒ سے قرآن کی ایک آیت کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو اور درست بات کہو، وہ لوگ چلے گئے جو ان باتوں کو جانتے تھے جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے قرآنی آیات کو نازل کیا۔

اور یاد رہے کہ سببِ نزول کی معرفت میں صرف نقل صحیح ہی معتبر ہے، پس اگر راوی

لفظِ سبب کی تصریح کردے تو یہ سببِ نزول میں نص صریح ہوگا، جیسے کہ راوی کا یوں کہنا: "سببُ نزولِ ھٰذہ الآیۃ کذا و کذا" یعنی اس آیت کے نزول کا سبب یہ ہے۔

اسی طرح اگر راوی فاءِ تعقیبیہ کو لائے کہ وہ مادۂ نزول پر داخل ہو، جیسے کہ راوی کا یہ کہنا: "حَدَثَ کذا" (فلاں واقعہ ہوا) یا کہے کہ: "سُئِلَ النَّبِیُّ صلی اللّٰہ علیہ وسلم عَنْ کَذَا فنَزَلَتْ" (آپ ﷺ سے فلاں بات کے متعلق پوچھا گیا تو یہ آیت نازل ہوئی) تو یہ بھی سببِ نزول میں نص صریح ہے۔

اور کبھی نزول کے صیغہ میں سبب کا صراحۃً ذکر نہیں ہوتا، جیسے علماء کا یہ قول ہے: "نَزَلَتْ ھٰذہِ الآیَۃَ فِیْ کَذَا" (یعنی یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی)۔ کبھی تو اس جملہ سے مراد سببِ نزول ہوتا ہے اور کبھی وہ احکام مراد ہوتے ہیں جن پر آیت مشتمل ہوتی ہے، دوسری صورت میں یہ راوی کے قول: "عُنِیَ بِھٰذِہ الآیۃِ کَذَا" (یعنی اس آیت سے یہ مراد ہے) کی طرح ہوگا۔

علامہ زرکشی رحمہ اللہ اپنی کتاب "برھان" میں رقم طراز ہیں: "صحابہ و تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عادت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب ان میں سے کوئی "نزلت ھذہ الآیۃ فی کذا" کہتا ہے تو اس کی مراد یہ ہوتی ہے کہ یہ آیت اس حکم کو بھی شامل ہے، نہ کہ یہی اس کے نزول کا سبب ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "ان کے اس قول: "نزلت ھذہ الآیۃ فی کذا" سے مراد کبھی تو سببِ نزول ہوتا ہے[1] اور کبھی یہ مراد ہوتا ہے کہ یہ بات آیت کے حکم میں داخل ہے اگرچہ اس کا سبب نہ ہو۔

کیا سببِ نزول میں تعدّد ہوسکتا ہے؟ بسا اوقات مفسرین حضرات ایک آیت کے

(۱) یہاں جملۂ معترضہ کے طور پر یہ بات یاد رہے کہ آیتوں اور سورتوں کی مکی اور مدنی تقسیم زمانۂ نزول کے اعتبار سے ہے نہ کہ مقامات کے اعتبار سے، یعنی مکی آیت اور سورت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت یا سورت (پوری یا اکثر) آپ ﷺ کی مدینہ ہجرت سے قبل نازل ہوئی ہے، اور مدنی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ آیت یا سورت مدینہ ہجرت کے بعد نازل ہوئی ہے، خواہ آسمان پر نازل ہوئی ہو یا زمین وفضاء پر، خواہ مدینہ میں نازل ہوئی ہو یا مکہ میں، اور خواہ مکہ یا مدینہ کے راستے میں نازل ہوئی ہو یا اور کسی مقام پر۔ (اتقان)۔

نزول کے لیے متعدد اسباب بیان کرتے ہیں، تو اس جیسی صورت میں مستند اور معتمد بات یہ ہے کہ ہمیں ان کی ذکر کردہ عبارات میں غور کرنا چاہئے (کہ سببِ نزول ان میں سے کونسا ہوسکتا ہے؟)۔

ہم اس کا خلاصہ ذیل میں ان الفاظ کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں:

۱- دونوں مفسرین میں سے ہر ایک "نزلت هذه الآية في كذا" کی تعبیر لاتا ہے اور پہلے نے جو بات ذکر کی ہے دوسرا اس کے برعکس کہتا ہے، تو اسے اس بات پر محمول کیا جاتا ہے کہ وہ حکم کا استخراج اور آیت کے معنی کی تفسیر ہے، چنانچہ دونوں کے درمیان کوئی منافاۃ نہیں جیسا کہ ذکر ہو چکا، کیونکہ یہ سببِ نزول نہیں ہوسکتا۔

۲......ایک مفسر "نزلت هذه الآية في كذا" کہتا ہے جبکہ دوسرا "سببُ نزولِ هذه الآية كذا" کہکر سببِ نزول کی تصریح ذکر کرتا ہے، تو یہاں تصریح معتبر ہوگی، اس کی مثال وہ روایت ہے جو امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے، وہ فرماتے ہیں: آیت ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ...﴾ عورتوں کے پچھلے حصہ میں مباشرت کرنے کے بارے میں نازل کی گئی ہے[1]۔

اور امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح مسلم میں حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

> "یہود کہا کرتے تھے کہ جو شخص اپنی بیوی کے ساتھ اس کے پیچھے کی جانب سے اگلے حصہ میں مباشرت کرے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ...﴾"۔

تو یہاں حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت کا اعتبار ہوگا، کیونکہ وہ سببِ نزول میں نصِ صریح ہے (کیونکہ فاءِ تعقیبیہ کو یہاں مادۂ نزول پر داخل کیا گیا ہے جو کہ سببِ نزول میں نصِ صریح ہے) لہٰذا حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت سببِ نزول کے بارے میں منقولہ

---

(۱) اس کا مطلب یہ نہیں کہ عورتوں کے پچھلے حصے میں صحبت کرنا اس آیت کی رو سے جائز ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس آیت سے عورتوں کے ساتھ لواطت کرنے کی حرمت ثابت ہوتی ہے، کیونکہ اس آیت میں عورت کو کھیتی یعنی پیدائش اولاد کا ذریعہ قرار دیا ہے، اور وہ لواطت کے ذریعے ممکن نہیں۔ (مناھل العرفان)۔

روایت شمار ہوگی، جبکہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نص صریح نہیں تو اسے اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ وہ حکم کا استنباط اور اس کی تفسیر ہے۔

۳۔مفسرین میں سے ہر ایک دوسرے کے برعکس صریح سببِ نزول ذکر کرے تو اس میں صحیح روایت معتبر ہوگی نہ کہ ضعیف، اس کی مثال وہ روایت ہے جسے شیخین رحمہا اللہ نے حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک مرتبہ بیمار پڑ گئے جس کی وجہ سے ایک یا دو راتیں تہجد کے لیے نہ اٹھ سکے، تو ایک عورت آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور کہا کہ میں یہی سمجھتی ہوں کہ تمہارے شیطان نے تمہیں چھوڑ دیا ہے (نعوذ باللہ منہ)۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں: ﴿وَالضُّحٰی وَالَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی﴾ (الضحیٰ: ۱-۳)

ترجمہ: ''قسم ہے دن کی روشنی کی۔ اور رات کی جب وہ قرار پکڑے، (یعنی اس کی ظلمت کامل ہو جائے، یا سارے جاندار سو جائیں اور تمام آوازیں ساکت ہو جائیں) کہ آپ کے پروردگار نے نہ آپ کو چھوڑا اور نہ (آپ سے) دشمنی کی، (لہٰذا آپ کفار کی خرافات ولغویات سے غمگین نہ ہوں، آپ برابر نعمتِ وحی سے مشرف رہیں گے''۔

اور طبرانی رحمہ اللہ نے روایت نقل کی ہے کہ ''ایک کتے کا پلا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں داخل ہو کر چارپائی کے نیچے گھس گیا اور وہیں مر گیا، اس واقعہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم چار دن تک اس حال میں رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل نہیں ہوئی، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ خولہ! رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے گھر میں ایسی کیا بات ہوگئی ہے کہ جبرئیل میرے پاس نہیں آتے؟!

تو میں نے (یعنی حضرت خولہ رضی اللہ عنہا نے) اپنے دل میں سوچا کہ اگر میں گھر کی جھاڑ پونچھ کر لوں تو بہتر رہے گا، چنانچہ میں نے جھاڑو چارپائی کے نیچے مار کر صفائی کی تو کتے کا پلا نکال ڈالا۔

اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے کہ داڑھی مبارک پر رعشہ طاری تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن نازل ہوتا تو کپکپاہٹ طاری ہو جاتی، پس اللہ تعالیٰ نے ﴿وَالضُّحٰی

﴿وَالَّيْلِ اِذَا سَجٰى﴾ سے لے کر ﴿فترضیٰ﴾ تک آیات کا نزول فرمایا۔

تو یہاں پہلی روایت پر اعتماد کیا جائے گا کیونکہ وہ صحیحین کی روایت ہے۔

علاّمہ ابن حجر رحمہ اللہ بخاری شریف کی شرح میں فرماتے ہیں کہ پلے کی وجہ سے حضرت جبرئیل علیہ السلام کا وحی لیکر نہ آنے کا قصہ اگرچہ مشہور ہے لیکن اس کا آیت کے لیے سببِ نزول ہونا انوکھی بات ہے اور اس کی اسناد میں بعض مجہول راوی ہیں، لہٰذا اس بارے میں صحیح بخاری کی روایت ہی کا اعتبار ہوگا۔

۴-شانِ نزول کے بارے میں وارد ہونے والی دونوں روایتوں کی سند صحیح ہو تو ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر وجوہِ ترجیحات میں سے کسی وجہ کی بناء پر راجح قرار دیں گے، جیسا کہ راوی کا یوں کہنا کہ وہ قصہ میں موجود تھا وغیرہ وغیرہ۔

اس کی مثال وہ روایت ہے جو امامِ بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے وہ فرماتے ہیں:

''میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مدینہ کی گلیوں میں چل رہا تھا جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کھجور کی ایک صاف شاخ کا سہارا لئے ہوئے تھے، اتنے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر چند یہودیوں کے پاس سے ہوا تو ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر تم اس سے کچھ کہ لو تو بہتر رہے گا، چنانچہ انہوں نے کہا کہ آپ ہمیں روح کی حقیقت بتایئے؟ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کچھ دیر کے لیے ٹھہر گئے اور اپنا سر مبارک اٹھالیا، میں سمجھ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہو رہی ہے، وحی ختم ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵)

ترجمہ: ''آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہی ہے اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے''۔

جبکہ امام ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت نقل کی ہے اور اس کی تصحیح بھی فرمائی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ قریش نے یہود سے کہا کہ ہمیں کوئی ایسی بات بتاؤ جس کے بارے میں ہم اس شخص سے دریافت کر سکیں؟

تو یہود نے کہا کہ ان سے روح کے متعلق دریافت کرو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ

آیات نازل فرمائیں: ﴿وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ. قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸۵)

یہ روایت مذکورہ آیت کا مکہ میں نازل ہونے کا تقاضا کرتی ہے اور پہلی روایت اس کے مدینہ میں نازل ہونے کی متقاضی ہے، تو ہم پہلی روایت کو ترجیح دیں گے، کیونکہ اس کے راوی حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما قصہ میں موجود تھے، نیز بخاری کی روایت کو غیر کی روایت پر ترجیح اور برتری بھی حاصل ہے۔

۵- دونوں روایتوں کی سند صحیح ہوتی ہے، اور اُن کے واقعات کے درمیان نزول کا عرصہ بھی قریب قریب ہوتا ہے، اس کے بعد ایک آیت یا کئی آیتوں کا دو واقعات کے ایک ساتھ رونما ہونے کے سبب نزول ہوتا ہے، اس میں ہم دونوں روایتوں کے درمیان تطبیق کا راستہ اختیار کریں گے۔

اس کی مثال وہ روایت ہے کہ جو امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کی ہے کہ:

''ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شریک بن سحماء پر اپنی بیوی کے ساتھ زنا کرنے کی تہمت لگائی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "البينة أو حد في ظهرك" ''یعنی گواہ لاؤ یا تمہاری پیٹھ پر حد جاری ہوگی''۔

اس پر ہلال رضی اللہ عنہ نے کہا: یارسول اللہ! جب ہم میں سے کوئی اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو دیکھے گا تو وہ گواہ ڈھونڈتا پھرے گا!!

لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے رہے کہ ''گواہ لاؤ یا تمہاری پیٹھ پر حد جاری ہوگی''۔ اس پر ہلال رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق دے کر بھیجا ہے میں بالکل سچا ہوں اور اللہ تعالیٰ وہ بات ضرور نازل کریں گے جو میری پیٹھ پر حد لگانے سے مجھے بری کردے گی۔

اسی دوران جبرئیل علیہ السلام اتر آئے، اور اللہ تعالیٰ نے ﴿وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ﴾ سے لے کر ﴿اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ تک آیات نازل فرمادیں۔ جن کا ترجمہ یہ ہے:

''اور جو لوگ اپنی (منکوحہ) بیویوں کو (زنا کی) تہمت لگائیں اور ان کے بجز

اپنے (ہی دعوی کے) اور کوئی گواہ نہ ہوں (جن کو عدد میں چار ہونا چاہیے) تو ان کی شہادت (جو کہ دافع حبس یا حد قذف ہو) یہی ہے کہ چار بار اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ دے بیشک میں سچا ہوں، اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کی لعنت ہو اگر میں جھوٹا ہوں، اور (اس کے بعد) اس عورت سے (حبس یا حد زنا کی) سزا اس طرح ٹل سکتی ہے کہ وہ چار بار قسم کھا کر کہے کہ بیشک یہ مرد جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ مجھ پر خدا کا غضب ہو اگر یہ سچا ہو"۔

اور دوسری روایت وہ بھی ہے جو شیخین رحمہما اللہ نے سہل بن سعد رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ:

"عویمر بن نصر رضی اللہ عنہ عاصم بن عدی رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس شخص کے بارے میں دریافت کریں جو اپنی بیوی کے ساتھ کسی غیر مرد کو پائے تو کیا وہ اسے قتل کر دے جس کے بدلے میں اسے بھی (قصاصاً) قتل کیا جائے گا یا وہ مزید کیا کرے؟

حضرت عاصم رضی اللہ عنہ نے یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کی، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سائلکے سوال کو اچھا نہ سمجھا، یہ بات عاصم رضی اللہ عنہ نے عویمر رضی اللہ عنہ کو بتادی جس پر عویمر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخدا! میں خود رسول اللہ کے پاس جاؤں گا اور ان سے ضرور اس کے بارے میں پوچھوں گا، سو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے اور تمہاری اہلیہ کے بارے میں قرآن اتر چکا ہے، اور یہ آیاتِ کریمہ تلاوت فرمائیں: ﴿وَالَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ اَزْوَاجَھُمْ وَلَمْ یَکُنْ لَّھُمْ شُھَدَاءُ اِلَّآ اَنْفُسُھُمْ فَشَھَادَةُ اَحَدِھِمْ اَرْبَعُ شَھٰدٰتٍ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ لَمِنَ الصّٰدِقِیْنَ﴾ (النور: ٦)

دونوں روایتوں میں تطبیق کے لیے ہم کہیں گے کہ سب سے پہلے تو یہ واقعہ ہلال رضی اللہ عنہ کو پیش آیا اور عویمر رضی اللہ عنہ بھی اچانک آگئے تو دونوں کے متعلق آیاتِ مبارکہ نازل ہوگئیں۔

علامہ ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "کسی آیت کے متعدد اسبابِ نزول ہونے میں کوئی ممانعت نہیں"۔

٦- روایاتِ صحیحہ کے درمیان اگر تطبیق ممکن نہ ہو تو دونوں کے مابین مدت کے بُعد کی

بنا پر اسے نزول کے تعدد اور تکرار پر محمول کیا جائے گا۔

اس کی مثال وہ روایت ہے جو صحیحین میں حضرت مسیب رحمہ اللہ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''جب ابوطالب کا انتقال ہونے لگا تو آنحضرت ﷺ اس کے پاس تشریف لائے، اس وقت وہاں ان کے پاس ابوجہل اور عبداللہ بن امیہ بھی بیٹھے ہوئے تھے، تو آپ ﷺ نے فرمایا: اے میرے چچا! ''لا الہ الا اللہ'' کہہ دیجئے کہ جس کے ذریعے میں اللہ کے روبرو میں تمہارے لیے بات کرسکوں، اس پر ابوجہل اور عبداللہ نے کہا: کیا تو عبدالمطلب کے دین سے اعراض کرلے گا؟ پس وہ دونوں ابوطالب سے مسلسل گفتگو کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے کہہ دیا کہ وہ عبدالمطلب کے دین پر ہے۔

یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا: بخدا! میں اس وقت تک آپ کے لیے استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے اس سے منع نہ کیا جائے، چنانچہ یہ آیت نازل ہوگئی: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ (التوبۃ: ۱۱۳)

ترجمہ: ''پیغمبر (ﷺ) کو اور دوسرے مسلمانوں کو جائز نہیں کہ مشرکین کے لیے مغفرت کی دعا مانگیں، اگرچہ وہ رشتہ دار ہی (کیوں نہ) ہوں، اس امر کے ظاہر ہوجانے کے بعد کہ یہ لوگ دوزخی ہیں''۔

اور دوسری روایت وہ ہے جو ترمذی رحمہ اللہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''میں نے ایک شخص کو اپنے مشرک والدین کے لیے مغفرت طلب کرتے ہوئے سنا تو میں نے اس سے کہا کہ کیا تو اپنے مشرک والدین کے لیے مغفرت مانگتا ہے؟ اس پر اس شخص نے کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی تو اپنے مشرک والدین کے لیے مغفرت کی دعا مانگی تھی، یہ بات میں نے آنحضرت ﷺ سے بیان کی تو یہ آیت نازل ہوگئی: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ (التوبۃ: ۱۱۳)

اور یہ بھی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت ﷺ ایک دن قبرستان کی طرف تشریف لے گئے اور ایک قبر کے پاس بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے صاحب قبر کے لیے بہت لمبی چوڑی دعا مانگی اور پھر رونے لگے اور فرمایا کہ جس قبر کے پاس میں بیٹھا تھا وہ میری والدہ کی قبر ہے، میں نے اپنے پروردگار سے ان کے لیے دعا کی اجازت چاہی تو مجھے اللہ نے اجازت نہیں دی[1]، اور مجھ پر یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ﴾ **(التوبۃ: ۱۱۳)**

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ان احادیث کے درمیان تطبیق کے لیے انہیں تعددِ نزول پر محمول کیا جائے گا۔

عمومِ لفظ کا اعتبار ہوگا یا خصوص سبب کا؟ عمومِ لفظ کا اعتبار ہوگا یا خصوص سبب کا؟ اس دقیق مسئلہ کے بارے میں علمائے اصول کا اختلاف ہے کہ جب کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے تو اس کی شان میں کوئی آیت نازل ہوتی ہے تو آیا اس آیت کا حکم اسی حادثہ یا واقعہ یا اس شخص پر منحصر ہوگا جس کے متعلق یہ آیت اتری ہے یا تمام کی طرف اس کا حکم متعدی ہوگا؟[2]

پس جمہور علماء کا مسلک یہی ہے کہ عمومِ لفظ کا اعتبار ہوگا نہ کہ خصوصِ سبب کا، اور یہی

---

(۱) اس روایت کو نہ تو موضوع کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی عقیدہ کے کسی نازک مسئلہ کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، چنانچہ اہل سنت کی ایک بڑی جماعت بہت سے دلائل کی بنیاد پر اس بات کی قائل ہے کہ آنحضرت ﷺ کے والدین ملتِ ابراہیمی پر فوت ہونے کی بناء پر مؤمن تھے، خود علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے بھی اس موضوع پر ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ (حاشیۂ علوم القرآن)

(۲) یہ اختلاف اس صورت میں ہے جبکہ آیت کسی خاص واقعہ کے تحت نازل ہوئی ہو، لیکن الفاظ عام استعمال کئے گئے ہوں، اور آیت یا کسی خارجی دلیل سے یہ صراحت معلوم نہ ہوتی ہو کہ آیت کا حکم یا مضمون صرف اسی واقعہ کے ساتھ مخصوص ہے یا اس نوعیت کے ہر واقعہ کے لئے عام ہے۔

پھر یہ اختلاف بھی صرف نظریاتی نوعیت کا ہے، عملاً اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا، کیونکہ یہ حضرات بھی عملاً آیت کا حکم اس نوعیت کے دوسرے واقعات میں جاری کردیتے ہیں، فرق صرف اتنا ہے کہ جمہور علماء تو اس حکم کا ماٴخذ آیت کو قرار دیتے ہیں، جبکہ یہ حضرات اس کا ماٴخذ کسی دوسری دلیلِ شرعی مثلاً: حدیث، اجماع یا قیاس کو قرار دیتے ہیں۔ (علومُ القرآن)

صحیح قول ہے، اور دوسری رائے یہاں یہ ہے کہ خصوصِ سبب کا اعتبار ہوگا۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب ”الاتقان فی علوم القرآن“ میں رقم طراز ہیں:

”عمومِ لفظ کا اعتبار کرنے پر ایک دلیل صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اور دیگر بزرگانِ دین کا مختلف واقعات میں ان آیات کے عموم سے استدلال کرنا بھی ہے، اگرچہ ان آیات کا نزول مخصوص اسباب کی بنا پر تھا، جیسا کہ آیتِ ظہار کا نزول حضرت سلمہ بن صخر رضی اللہ عنہ کے متعلق ہوا، اور آیتِ لعان حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اور آیتِ حدِ قذف حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے والوں کے بارے میں نازل ہوئی، پھر عمومِ لفظ کا اعتبار کرتے ہوئے حکم کو ان کے علاوہ دوسرے حضرات کی طرف متعدی کر دیا گیا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی اثر بھی عمومِ لفظ کا اعتبار کرنے پر دال ہے، کیونکہ انہوں نے آیتِ سرقہ میں یہی بات کہی ہے، اگرچہ وہ آیت ایک چور عورت کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ نیز نجدہ حنفی رحمہ اللہ سے مروی ہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا﴾ (المائدة: ۳۸) کے متعلق دریافت کیا کہ یہ خاص ہے یا عام؟ تو فرمایا کہ عام ہے۔

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: علما کا قول: ”هٰذه الآية نزلت في كذا“ بالخصوص جب آدمی کا نام مذکور ہو اکثر اسی قبیل سے ہوتا ہے، جیسے کہ وہ فرماتے ہیں: آیتِ ظہار حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی کے بارے میں نازل ہوئی، اور آیتِ کلالہ حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہما کے متعلق اتری، اور اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان: ﴿وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ﴾ (المائدة: ۴۹) بنو قریظہ اور بنو نظیر کے بارے میں نازل ہوا، وغیرہ وغیرہ۔

پس جنہوں نے یہ بات کہی ہے اُن کی مراد یہ نہیں کہ آیت کا حکم انہیں اعیان کے ساتھ خاص ہے اور غیرِ مذکور اس میں داخل نہیں ہیں، کیونکہ ایسی بات کا صدور کسی عقل و خرد رکھنے والے مسلمان سے بالکل ممکن نہیں۔

علامہ زمخشری رحمہ اللہ سورۂ ہمزہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ”ممکن ہے یہاں سبب خاص اور وعید عام ہو، تاکہ جو بھی اس قبیح فعل کا ارتکاب کرے اسے یہ حکم شامل ہو جائے اور یہ آیت تعریض کے قائم مقام ہو جائے۔

چوتھی فصل

سات حروف پر نزولِ قرآن اور مشہور قراءتیں

تمہید: جب اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا تو ہر ایک کے لیے خاص شریعت اور خاص طریقہ تجویز فرمایا، عربوں کے کئی لہجے تھے جن میں سے بعض کو تو انہوں نے اپنی فطرت کے بدولت پایا تھا، اور بعض کو اپنے ہمسایوں سے لیا، اور قریش کی زبان کو کئی اسباب کی بنا پر اولین حیثیت اور شہرت حاصل تھی، جن میں سے بعض یہ ہیں:

ان کا تجارت میں مصروف عمل ہونا۔

بیت الحرام کے پاس موجود ہونا۔

خانہ کعبہ کی خدمت اور غریب حجاج کی ضیافت کی ذمہ داری اٹھانا وغیرہ۔

اور قریش دوسری اقوام کے بعض اُن لہجوں اور کلمات کو لے لیتے تھے جو انہیں بھلے لگتے تھے، لہٰذا یہ ایک فطرتی امر تھا کہ اللہ احکم الحاکمین قرآن کو اس زبان میں نازل کرتے جسے تمام عرب سمجھتے ہوں؛ کیوں کہ اس زبان کا سمجھنا ان کے لیے آسان ہوتا، نیز تاکہ اعجازِ قرآن ظاہر ہو اور فصحائے عرب کو ایک سورت یا آیت لانے کا چیلنج دیا جاسکے، پھر عربوں کی اپنی زبان میں نازل ہونے کی وجہ سے قرآن کا پڑھنا، سمجھنا اور یاد کرنا آسان ہو جائے گا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿إِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ ''ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تاکہ تم سمجھو''۔

قرآن کریم کے ساتھ حروف پر نازل ہونے کے دلائل

۱- پہلی دلیل: امام بخاری و مسلم رحمہما اللہ دونوں نے اپنی اپنی صحیح میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے جبرئیل نے قرآن کریم ایک حرف پر پڑھایا تو میں نے ان سے مراجعت کی اور میں حروف میں زیادتی طلب کرتا رہا اور وہ حروف میں اضافہ کرتے رہے، یہاں تک کہ وہ سات حروف تک پہنچ گئے''۔

امام مسلم رحمہ اللہ نے یہ الفاظ زیادہ نقل کیے ہیں:

''ابن شہاب کہتے ہیں کہ مجھ تک یہ بات پہنچی ہے کہ یہ سات حروف ایک ہی امر میں ہیں جو کہ حلال وحرام میں مختلف نہیں''۔

۲-**دوسری دلیل:** امام بخاری ومسلم رحمہما اللہ نے روایت نقل کی ہے (الفاظ یہاں بخاریؒ کے ہیں) کہ:

''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک دن ہشام بن حکیم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں سورۂ فرقان کی تلاوت کرتے ہوئے سنا، میں نے ان کی تلاوت کی طرف دھیان کیا تو وہ میں کیا دیکھتا ہوں کہ وہ اسے بہت سارے ایسے حروف پر پڑھ رہے تھے جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھائے تھے، قریب تھا کہ میں نماز ہی میں اس سے الجھ پڑتا، لیکن میں نے انتظار کیا یہاں تک کہ اس نے سلام پھیر دیا، پھر میں نے اس کی چادر اس کی گردن میں ڈال کر کھینچ کر کہا کہ کس نے تجھے یہ سورت پڑھائی ہے؟ تو اس نے کہا کہ مجھے یہ سورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی ہے۔ میں نے اُس سے کہا کہ تو نے جھوٹ بولا، بخدا! یہی سورت جس کی میں نے تمہیں تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے مجھے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی ہے، چنانچہ میں اسے کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور میں نے کہا: یا رسول اللہ! میں نے اس کو سورۂ فرقان کی ایسے حروف پر تلاوت کرتے ہوئے سنا ہے جو آپ نے مجھے نہیں پڑھائے، جبکہ آپ نے مجھے خود سورۂ فرقان پڑھائی ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے عمر! اسے چھوڑ دو، پھر ہشام سے کہا کہ تم پڑھو، چنانچہ اس نے اسی طرح پڑھا جس طرح میں نے اسے تلاوت کرتے ہوئے سنا تھا، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سورت اسی طرح نازل کی گئی ہے۔ پھر فرمایا کہ یہ قرآن سات حروف پر نازل کیا گیا ہے، پس جو تمہارے لیے آسان ہو اسی طریقہ پر پڑھو''۔

اور بعض روایات میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی قراءت بھی سنی

اور فرمایا کہ یہ اسی طرح نازل کی گئی ہے۔

۳-تیسری دلیل: امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''ایک دن میں مسجد میں تھا کہ ایک شخص آیا اور نماز پڑھنے لگا اور اس نے ایسی قرءات کی جسے میں نے درست نہیں سمجھا، پھر ایک دوسرا شخص آیا اور اس نے پہلے شخص کے علاوہ دوسرے طریقہ سے قراءت کی، پس جب ہم نے نماز ادا کرلی تو ہم سب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے، میں نے عرض کیا کہ اس شخص نے ایسی قراءت کی جسے میں نے درست نہ گردانا، پھر یہ دوسرا شخص داخل ہوا تو اس نے اپنے ساتھی کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے قراءت کی، یہ سن کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں کو اپنے سامنے پڑھنے کا حکم دیا تو دونوں نے پڑھا اور دونوں کی قرءات کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اچھا کہا، یہ دیکھ کر میرے دل میں تکذیب کا وسوسہ پیدا ہوگیا، ایسا وسوسہ اور شبہ کہ ایامِ جاہلیت میں بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ پس جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ پر طاری ہونے والی اس کیفیت کو بھانپا تو میرے سینہ پر اپنا دست مبارک مارا جس کی وجہ سے میں پسینہ سے شرابور ہوگیا اور خوف کی وجہ سے میری ایسی حالت ہوگئی کہ گویا میں خدا کو دیکھ رہا ہوں، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ: اے اُبی! میری طرف وحی بھیجی گئی کہ میں قرآن کو ایک حرف پر پڑھوں، تو میں نے بارگاہِ الٰہی میں درخواست پیش کی کہ میری امت پر آسانی کی جائے، چنانچہ دوسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ دو حرفوں پر قرآن پڑھوں، میں پھر درخواست کی کہ میری امت کو مزید آسانی عطا فرمائی جائے۔ چنانچہ تیسری مرتبہ مجھے یہ حکم دیا گیا کہ سات حرفوں پر قرآن پڑھوں، اور یہ بھی فرمایا کہ جتنی مرتبہ ہم نے آپ کو حکم دیا ہے اتنی ہی مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم سے دعا مانگیے ہم اسے قبول کریں گے، چنانچہ میں نے دو مرتبہ یہ دعا کی کہ: ''اے اللہ! میری امت کو بخش دے، اے اللہ! میری امت کو بخش دے''، اور تیسری دعا میں نے اس دن کیلئے رکھ چھوڑی ہے جس دن مخلوق مجھ سے سفارش کی خواہش کرے گی یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی مجھ سے شفاعت کی خواہش کریں گے''۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''یہ وسوسہ (علامہ کی مراد وہ وسوسہ ہے جو اُبی ﷜ کے دل میں آیا) اس قبیل سے ہے جس کے بارے میں جب صحابہ نے آپ ﷺ سے دریافت کیا کہ ہم اپنے دلوں میں وہ باتیں موجود پاتے ہیں جس کا بیان کرنا ہم میں سے ہر ایک کو گراں محسوس ہوتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم انہیں پاتے ہو؟ صحابہ نے عرض کیا: جی ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا: یہی صریح ایمان ہے۔

۴- **چوتھی دلیل:** حافظ اَبو یعلی رحمہ اللہ نے اپنی مسند کبیر میں ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمان ﷜ نے ایک دن جبکہ آپ منبر پر تشریف فرما تھے کہا کہ:

> ''میں اس شخص کو اللہ کے نام کا واسطہ دیتا ہوں جس نے نبی ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہو کہ: ''قرآن سات حرفوں پر اترا ہے جن میں سے ہر ایک شافی وکافی ہے''۔ تو وہ کھڑا ہو جائے تو اتنے لوگ کھڑے ہو گئے کہ شمار سے باہر تھے، اور انہوں نے گواہی دی کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''قرآن سات حرفوں پر اترا ہے جن میں سے ہر ایک شافی وکافی ہے''۔ چنانچہ حضرت عثمان ﷜ نے بھی فرمایا کہ میں بھی ان کے ساتھ اس بات کی گواہی دیتا ہوں''۔

۵- **پانچویں دلیل:** امام مسلم رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت اُبی بن کعب ﷜ سے روایت کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ نبی ﷺ ایک مرتبہ بنی غفار کے تالاب کے پاس تشریف فرما تھے:

> ''تب حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اپنی امت کو ایک حرف پر قرآن پڑھائیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت کا خواستگار ہوں، میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، پھر جبرئیل علیہ السلام دوبارہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ دو حرفوں پر اپنی امت کو قرآن پڑھائیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی اور مغفرت کا خواستگار ہوں، میری اُمت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی، پھر وہ تیسری بار آپ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ اپنی امت کو تین حرفوں پر قرآن پڑھائیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ سے معافی

اور مغفرت کا خواستگار ہوں، میری امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی، پھر وہ چوتھی مرتبہ آپ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ آپ اپنی امت کو سات حرفوں پر پڑھائیں، پس وہ جس حرف پر پڑھیں گے ان کی قراءت درست ہوگی"۔

۶- چھٹی دلیل: امام ترمذی رحمہ اللہ نے بھی حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ مروہ کے پتھروں کے پاس جبرئیل علیہ السلام سے ملاقات کی، اُبی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ: "مجھے ایک ناخواندہ قوم کی طرف بھیجا گیا ہے، جس میں لب گور بوڑھے بھی ہیں، سن رسیدہ بوڑھیاں بھی اور بچے بھی، حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ انہیں حکم دیجئے کہ وہ قرآن کو سات حرفوں پر پڑھیں"۔ امام ترمذی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن اور صحیح ہے۔

اور ایک روایت میں ہے کہ: "پس جس نے ان میں سے کسی حرف پر پڑھا تو وہ حقیقت میں اسی طرح ہے جیسا کہ اس نے پڑھا ہے"۔

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: "میں نے کہا کہ اے جبرئیل ! مجھے ایک ناخواندہ قوم کی طرف مبعوث فرمایا گیا ہے جس میں مرد، عورت، لڑکے، لڑکیاں اور وہ لب گور بوڑھے ہیں جنہوں نے کبھی کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں، حضرت جبرئیل نے فرمایا کہ بے شک قرآن کو سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے"۔

۷- ساتویں دلیل: امام احمد رحمہ اللہ نے اُبو قیس مولی عمرو بن العاص رحمہ اللہ سے اپنی سند کے ساتھ نقل کیا ہے، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ:

"ایک شخص نے قرآن کی ایک آیت پڑھی تو حضرت عمرو نے اس سے کہا: کہ یہ آیت تو اس اس طرح ہے، پھر انہوں نے نبی ﷺ کے سامنے اس بات کو ذکر کیا تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: "بے شک قرآن کو سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، پس جس حرف پر بھی تم پڑھو گے تو تمہاری قراءت درست ہوگی، لہٰذا باہم جھگڑا مت کرو"۔

۸- آٹھویں دلیل: طبری اور طبرانی رحمہما اللہ نے حضرت زید بن اَرقم رضی اللہ عنہ سے روایت

کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ:

''ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا کہ مجھے ابن مسعود نے ایک سورت پڑھائی جسے زید بن ثابت نے بھی مجھے پڑھایا تھا اور یہی سورت اُبی بن کعب نے بھی مجھے پڑھائی تھی، لیکن ان سب کی قراءتیں باہم مختلف رہیں، پس میں ان میں سے کن کی قراءت کو لوں؟ آپ ﷺ خاموش رہے، حضرت علی آپ ﷺ کے پہلو میں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے کہا کہ: تم میں سے ہر شخص اسی طرح پڑھے جیسا کہ اس نے جانا ہے؛ کیوں کہ یہی عمدہ اور اچھی بات ہے''۔

۹-نویں دلیل: ابن جریر طبری رحمہ اللہ نے اُبو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک یہ قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا ہے، سو اسے (جیسے چاہو) پڑھو اور اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن رحمت کے ذکر کو عذاب کے ساتھ اور عذاب کے ذکر کو رحمت کے ساتھ ختم مت کرو''۔

سات حروف پر نزول قرآن کی حکمت: ۱-ایک حکمت امت اسلامیہ اور خصوصاً امت عربیہ کہ جن پر قرآن نازل ہوا کے لیے آسانی پیدا کرنا تھی، اُن کے کئی لب و لہجے تھے مگر ان سب کو فصیح وخالص عربی کی صفات جامع وشامل تھیں، یہ تسہیل والی بات ہم آپ ﷺ کے ارشاد: ''أَنْ هَوِّنْ عَلَى أُمَّتِي'' اور ''أَنَّ أُمَّتِي لَا تُطِيقُ ذَلِكَ'' وغیرہ سے اخذ کرتے ہیں۔

محقق ابن جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور رہا اس قرآن کا سات حرفوں پر نازل ہونے کا سبب تو وہ اس امت پر تخفیف، اس کے ساتھ آسانی کا ارادہ اور اس کیلئے سہولت پیدا کرنا ہے، اور یہ سب اس امت کی شرافت، اس پر وسعت ورحمت، اس کی فضیلت کی خصوصیت، اور اس کے نبی کی آرزو پورا کرنے کی بنا پر تھا (جو کہ اُشرف المخلوقات اور اللہ تعالیٰ کے محبوب پیغمبر ہیں) بایں طور پر کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ ﷺ کے پاس آئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ

آپ اپنی امت کو ایک حرف پر قرآن پڑھائیں، اس پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اللہ سے عفو و مغفرت اور مدد کا خواستگار ہوں، میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، آپ ﷺ برابر یہی سوال دہراتے رہے، یہاں تک کہ وہ سات حرف تک پہنچ گئے''۔

پھر محقق موصوف آگے جا کر فرماتے ہیں:

''اور جیسا کہ یہ ثابت ہے کہ قرآن سات دروازوں سے سات حرفوں پر نازل ہوا، جبکہ اس سے پہلے ہر کتاب ایک دروازے سے ایک ہی حرف پر اترتی تھی، اور یہ اس لیے کہ پہلے انبیاء علیھم السلام اپنی مخصوص قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے، جبکہ نبی اکرم ﷺ تمام انسانوں کی طرف مبعوث فرمائے گئے خواہ اُن کی رنگت سرخ ہو یا وہ کالے رنگ کے ہوں، عربی ہوں یا عجمی۔ اور اہل عرب کہ جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا مختلف زبانوں والے تھے، اور ان کی کئی قسم کی بولیاں تھیں، اور ان میں سے ہر ایک کے لیے ایک زبان سے دوسری زبان یا ایک لہجہ سے دوسرے لہجہ کی طرف انتقال مشکل تھا، بلکہ بعض حضرات تو تعلیم و علاج کے ذریعے بھی اس بات پر قادر نہ تھے، خاص طور پر سن رسیدہ مرد، عورت اور وہ شخص جس نے کبھی کوئی کتاب نہ پڑھی تھی جیسا کہ آپ ﷺ نے بھی اس بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، پس اگر انہیں ان کی زبانوں سے عدول اور انکی بولیوں سے انتقال کرنے کا مکلف بنایا جاتا تو یہ تکلیف مالا یطاق کی قبیل سے ہوتا''۔

۲- دوسری حکمت امت اسلامیہ کا ایک ایسی زبان پر جمع کرنا تھا جو ان کے درمیان اتحاد کو پیدا کرے، اور یہ قریش ہی کی وہ زبان تھی کہ جو موسم حج وغیرہ میں مکہ میں آنے جانے والے قبائل عرب کی بہت ساری چیدہ چیدہ زبانوں کو شامل تھی، اسی وجہ سے قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا، تاکہ ہم قبائلِ عرب کی اُن لغات میں سے جس کو چاہیں اپنے (پڑھنے) کے لئے منتخب کرلیں جن کا نمونہ قریش کی زبان میں پایا جاتا ہے، یہ ایک عالی شان حکمت الٰہیہ ہے؛ کیوں کہ ایک جنرل زبان کی وحدت امت کی وحدت

کے اہم عوامل میں سے ایک عامل ہے، خاص طور پر امت کے ترقی ونشوونما کے ابتدائی دور میں یہ اہم سبب ہے۔

سات حروف پر نزولِ قرآن کا معنیٰ؟ "أَحْرُف" جمع ہے "حرف" کی، اس کے کئی معانی ہیں، صاحبِ قاموس فرماتے ہیں کہ:

"ہر چیز کا حرف اس کا کنارہ، دھار اور گوشہ ہوتا ہے، اور پہاڑ کا حرف اس کے نوکیلے سرے کو کہتے ہیں، نیز حروفِ ہجائیہ میں سے ایک حرف کو بھی کہا جاتا ہے:

ترجمہ: "اور بعض آدمی اللہ کی عبادت (ایسے طور) پر کرتا ہے (جیسے کسی چیز کے) کنارے پر (کھڑا) ہو"۔

یعنی ایک طریقہ پر عبادت کرتا ہے بایں معنی کہ خوشی کی حالت میں عبادت کرتا ہے، مصیبت میں نہیں کرتا، یا شک کی کیفیت میں عبادت کرتا ہے یا اللہ کے حکم پر غیر مطمئن ہو کر عبادت کرتا ہے، یعنی دین میں کامل طریقہ سے داخل نہیں ہوتا۔ اور "وَ نُزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ أَحْرُفٍ" میں سات حروف سے مراد اہل عرب کی سات زبانیں ہیں، اور اس جملے کا معنیٰ یہ نہیں کہ اگر قرآن سات یا دس یا اس سے زیادہ طریقوں پر آیا ہو تو ایک حرف میں سات طریقے ہوں گے، بلکہ معنیٰ یہ ہے کہ سات زبانیں قرآن میں پھیلی ہوئی ہیں"۔

ماقبل کلام سے ہمیں معلوم چلتا ہے کہ حرف مشترکِ لفظی کی قبیل سے ہے، اور مشترکِ لفظی سے لفظ کے ان معانی میں سے ایک معنیٰ مراد لیا جاتا ہے کہ جنہیں قرائن متعین کرتے ہیں اور وہ مقام کے مناسب ہوتے ہیں، پس لفظِ حرف سے مراد طریقہ ہے، اور اس کی دلیل آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: "أُنْزِلَ الْقُرْآنُ عَلٰی سَبْعَةِ أَحْرُفٍ"۔ "عَلٰی" کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ یہ شرط آسانی اور سہولت پیدا کرنے کیلئے ہے، بایں معنیٰ کہ قرآن کو اس طور پر نازل کیا گیا ہے کہ اس میں قاری پر آسانی کر دی گئی ہے کہ وہ اسے سات حروف پر پڑھے اور ان میں سے بجائے ایک حرف کے جس دوسرے حرف پر چاہے پڑھے، گویا کہ آپ ﷺ نے یوں فرمایا ہے کہ قرآن اس شرط اور گنجائش پر اتارا گیا ہے۔

حدیث میں وارد "أحرف" کی مراد میں علماء کا اختلاف: اس مقام پر علمائے کرام کے درمیان بحثا بحثی اور اختلاف کھو لنے لگتا ہے اور قیل وقال بڑھ جاتا ہے، ہم اب

اس کے متعلق بعض اقوال ذکر کرتے ہیں، نیز ہماری نظر میں جو قول درستگی کے قریب ترین ہوگا اُسے ترجیح سے بھی دیں گے:

۱- بعض علماء اس بات کی طرف گئے ہیں کہ حروفِ سبعہ سے ایک ہی معنی کے اندر اہل عرب کی سات زبانیں مراد ہیں، بایں طور کہ جہاں معانی میں سے کسی ایک معنی کی تعبیر میں عربوں کی لغات مختلف ہوتی ہیں وہاں قرآن ان لغات کے بقدر الفاظ لاتا ہے، اور جب ان میں اختلاف نہیں ہوتا تو قرآن ایک ہی لفظ لاتا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ وہ سات لغات قریش، ہذیل، ثقیف، ہوازن، کنانہ، تمیم اور یمن کی لغات ہیں۔

۲- بعض علماء کا کہنا ہے کہ حروفِ سبعہ سے مراد عربوں کی وہ سات لغات ہیں جن پر قرآن کا نزول ہوا، بایں معنی کہ قرآن مجموعی طور پر اپنے کلمات میں عربوں کی فصیح ترین سات لغات کے دائرہ سے نہیں نکلتا، پس قرآن کا بیشتر حصہ لغتِ قریش میں ہے، اور اس کا کچھ حصہ ہذیل یا ثقیف یا ہوازن یا کنانہ یا تمیم یا یمن کی لغت سے ہے۔ بعض علماء کا کہنا ہے کہ یہ قول صحیح ترین اور راستی کے زیادہ قریب ہے، یہی وہ قول ہے جسے بیہقی رحمہ اللہ نے صحیح کہا ہے، اَبہری رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے اور صاحبِ قاموس نے اسی پر انحصار کیا ہے۔

۳- جن سات حرفوں پر قرآن نازل ہوا ہے اِن سے مراد قرآن میں پائی جانے والی سات اصناف ہیں، لیکن پھر اس کے قائلین کا ان اصناف کی تعیین اور ان کے طرزِ تعبیر میں باہم سخت اختلاف ہے، لہٰذا ان میں سے بعض تو کہتے ہیں کہ یہ سات اصناف: "امر و نہی، حلال و حرام، محکم و متشابہ اور امثال" ہیں۔ اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ اصناف: "وعدہ و وعید، حلال و حرام، نصائح و امثال، اور احتجاج" ہیں۔ اور بعض کا کہنا ہے کہ کہ یہ اصناف: "محکم و متشابہ، ناسخ و منسوخ، خصوص و عموم اور قصص" ہیں۔

۴- سات حروفوں سے مراد ایک کلمہ اور ایک ہی معنٰی میں مختلف الفاظ کی سات صورتیں ہیں، مثلاً: "هَلُمَّ، أَقْبِل، تَعَال، عَجِّل، أسْرِع، قصدي اور نحوي"۔ چنانچہ ان سات الفاظ کا ایک ہی معنی ہے، یعنی آمد کی درخواست کرنا۔ یہ قول جمہور فقہاء اور محدثین کی طرف منسوب ہے، جن میں علامہ طبری اور امام طحاوی رحمہما اللہ وغیرہ بھی شامل ہیں۔

۵- سات حروف سے مراد سات باتوں میں اختلاف ہے:

الف-اسماء کا افراد و تذکیر اوران دونوں کی فروع (تثنیہ، جمع و تانیث) کے اعتبار سے اختلاف۔اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (والمومنون:۸)

ترجمہ: ''اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں''۔

چنانچہ ﴿أمٰنتهم﴾ کا کلمہ مفرد وجمع دونوں طریقوں سے پڑھا گیا ہے۔

ب-مضارع، ماضی اور اَمر کے افعال کی گردانوں میں اختلاف۔اس کی مثال یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿رَبَّنَا بٰعِدْ بَيْنَ اَسْفَارِنَا﴾

ترجمہ: ''اے ہمارے پروردگار! ہمارے سفروں میں درازی کر دے''۔

یہاں لفظ ﴿ربنا﴾ کو منادی ہونے کی بنا پر منصوب اور لفظ ﴿بعد﴾ کو فعل اَمر کے ساتھ پڑھا گیا ہے، اور ایک قراءت یہ ہے: ﴿رَبُّنَا بَعَّدَ﴾ اس میں: ﴿ربنا﴾ مبتدا ہونے کی بنا پر مرفوع اور ﴿بَعَّدَ﴾ کا جملہ فعل ماضی مُضَعَّفُ العین خبر ہے۔

ج-بدلیت کا اختلاف: خواہ وہ حروف کو حروف کے ساتھ بدل کر ہو، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا﴾ (البقرة:۲۵۹)

ترجمہ: ''اور (اس گدھے کی) ہڈیوں کی طرف نظر کر کہ ہم ان کو کس طرح ترکیب دیے دیتے ہیں''۔

اس آیت کو ''زا'' کے ساتھ بھی پڑھا گیا ہے، اور ''نون'' کے فتحہ اور ''را'' کے ساتھ بھی۔

نیز اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ﴾ (الواقعة:۲۹)

ترجمہ: ''اور تہ بتہ کیلے ہوں گے''۔

یہاں ﴿وَّطَلْحٍ﴾ (بالعین) بھی پڑھا گیا ہے، اس اختلاف میں اسم اور فعل کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

اور یا وہ اختلاف لفظ کو لفظ کے ساتھ بدل کر ہوگا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے: ﴿كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ﴾ (القارعة:۵)

ترجمہ: ''(پہاڑ) دھنکی ہوئی رنگین اون کی طرح ہو جائیں گے''۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت: ﴿كَالصُّوفِ الْمَنْفُوشِ﴾ ہے۔

د- تقدیم وتاخیر کا اختلاف: یہ اختلاف یا تو حرف میں ہوگا، مثلاً فرمان باری تعالیٰ ہے: ﴿أَفَلَمْ يَيْأَسِ﴾

ترجمہ: ''کیا (یہ سن کر) پھر بھی دلجمعی نہیں ہوئی''۔

اور ایک قراءت: ﴿أَفَلَمْ يَأْيَسْ﴾ ہے۔

اور یا یہ اختلاف کلمہ میں ہوگا، مثلاً ارشاد ہے: ﴿فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ﴾

ترجمہ: ''قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں''۔

یہاں پہلے کو مبنی بر فاعل اور دوسرے کو مبنی بر مفعول پڑھا گیا ہے۔ اور ایک قراءت اس کے برعکس بھی ہے۔

اسی طرح ارشاد پاک ہے: ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ (ق: ۱۹)

ترجمہ: ''اور موت کی سختی (قریب) آ پہنچی''۔

اور ایک قراءت: ﴿وَجَاءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ﴾ ہے۔

ہ- وجوہِ اعراب کا اختلاف، مثلاً: فرمان الٰہی ہے: ﴿مَا هٰذَا بَشَرًا﴾

''یہ شخص آدمی ہرگز نہیں''۔

ابن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت رفع کے ساتھ (یعنی: ﴿بشرٌ﴾) ہے۔

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيدُ﴾ البروج: ۱۵)

''عرش کا مالک (اور) عظمت والا ہے''۔

﴿المجيد﴾ کا لفظ ﴿ذو﴾ کی صفت ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ نیز ﴿العرش﴾ کی صفت ہونے کی بنا پر مجرور بھی پڑھا گیا ہے۔

و- الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف، مثلاً اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿وَمَا خَلَقَ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ﴾ (اللیل: ۳)

ترجمہ: ''اور (قسم ہے) اُس (ذات) کی جس نے نر اور مادہ کو پیدا کیا''۔

ایک قراءت: ﴿ما خلق﴾ کے بغیر: ﴿الذكر والأنثى﴾ ہے۔

ز- لہجوں کا اختلاف، یعنی تفخیم، ترقیق، امالہ، اظہار، اور ادغام وغیرہ میں اختلاف، یہ

اختلاف قرآن میں بہت زیادہ ہے۔اور اس میں سے ایک امالہ و عدم امالہ کا اختلاف ہے جو کہ اللہ عزوجل کے اس فرمان میں موجود ہے: ﴿هَلْ أَتٰكَ حَدِيثُ مُوسٰى﴾ (النازعات: ۱۵)

ترجمہ: ''کیا آپ کو موسیٰ کا قصہ پہنچا ہے''۔

اس آخری (پانچویں) قول کو امام رازی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، اور ابن قتیبہ، ابن جزری اور ابن طیب رحہم اللہ کا مسلک بھی بالکل اس کے قریب ہے، نیز شیخ زرقانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب ''مناهل العرفان'' میں اس قول کو لیا ہے اور کئی دلائل سے اس کو تقویت دی ہے۔

ترجیح: صحت کے زیادہ قریب مسلک وہی آخری مسلک ہے جسے امام رازی رحمہ اللہ نے اختیار کیا ہے، اور زرقانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مناهل العرفان'' میں اس پر اعتماد کر کے چند دلائل سے اس کے اُصح ہونے پر استدلال کیا ہے جن میں سے بعض یہ ہیں:

۱- اس مذہب کی سابقہ احادیث تائید کرتی ہیں۔

۲- یہ مذہب اختلافِ قراءت اور اس کی طرف راجع ہونے والی سات وجوہ کے استقرائے تام پر مبنی ہے۔

۳- اس رائے کو کوئی ممنوعہ بات لاحق نہیں ہوتی۔

سات حروف کے متعلق علمائے کرام کے تمام اقوال آپ زرقانی رحمہ اللہ کی کتاب ''مناهل العرفان'' میں پاؤ گے، نیز اس میں صفحہ ۱۶۵ سے لیکر ۱۷۷ تک دوسرے مذاہب کی تضعیف و تردید بھی ہے۔

ہم یہاں اس مذہب کا خلاصہ ''اللوائح'' میں مذکور امام اُبوالفضل رازی کے کلام سے نقل کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ:

قراءتوں کا یہ اختلاف ان سات حروف کے دائرہ سے نہیں نکلتا:

۱- اسماء کا مفرد، تثنیہ، جمع، مذکر اور مؤنث ہونے میں اختلاف۔

۲- ماضی، مضارع، امر کے افعال کی گردانوں کا اختلاف۔

۳- وجوہِ اعراب کا اختلاف۔

۴- الفاظ کی کمی بیشی کا اختلاف۔

۵- تقدیم وتاخیر کا اختلاف۔

۶- بدلیت کا اختلاف۔

۷- لغات یعنی لہجوں کا اختلاف، جیسے فتح وامالہ، ترقیق وتفخیم، اور اظہار وادغام وغیرہ کا اختلاف۔

کیا اب سات حروف مصاحف میں موجود ہیں؟ ۱- فقہاء، قراء اور متکلمین کی ایک جماعت کا مذہب یہ ہے کہ یہ تمام حروف مصاحف عثمانیہ میں موجود ہیں۔

دلائل: اَلف: امت کیلئے جائز نہیں کہ وہ ان سات حروف میں سے کسی حرف کے نقل کرنے کو ترک کردے۔

ب: تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کا اس بات پر اجماع ہے کہ مصاحفِ عثمانیہ حضرت اَبوبکر رضی اللہ عنہ کے تحریر کردہ صحیفوں سے ہی نقل کیے گئے تھے۔

ج: مذکورہ بحث کا مطلب یہ ہے کہ حضرت اَبوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس موجود صحیفے سات حروف پر مشتمل تھے، اوران سے مصاحف عثمانیہ کی نقل بھی اسی طرح سات حروف کے ساتھ ہی کی گئی۔

د: آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد: "إن أمتي لَاتُطِيقُ ذٰلک"۔ (میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی) صرف عہد صحابہ کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ اعجاز قرآن کے باقی ہونے کے ساتھ ساتھ تسہیل قرآن کی یہ صورت بھی باقی ہے۔

۲- اکابر واسلاف اور ائمۃ المسلمین میں سے جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ مصاحف عثمانیہ سات حرفوں میں سے صرف ان حروف پر مشتمل ہیں جن کا احتمال ان کا رسم الخط رکھتا ہے، نیز وہ نبی اَکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت جبرئیلؑ کے ساتھ آخری دورِ قرآن کی قراءت کو بھی شامل ہوں۔

۳- علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ اوران کے ہمنوا علماء کا مذہب یہ ہے کہ مصاحفِ عثمانیہ سات حرفوں میں سے صرف ایک حرف پر مشتمل ہیں، اُن کا کہنا ہے کہ سات حروف عہد نبوی، عہد صدیقی اور عہد فاروقی میں موجود رہے، تاہم جب عثمان رضی اللہ عنہ کا دور آیا تو

امت نے مسلمانوں کے معاملہ کو یکجا کرنے کیلئے آپ کی قیادت میں محسوس کیا کہ وہ ایک حرف پر ہی اکتفا کرے، اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام مصاحفِ عثمانیہ کو صرف اس ایک حرف پر لکھنے کا حکم دیا جس کی طرف امت نے پہل کر کے اسے قبول کیا تھا۔

شیخ زرقانی رحمہ اللہ "مناهل العرفان" کے صفحہ نمبر ۲۶۲ پر ان الفاظ کے ساتھ رقم طراز ہیں:

"جب ہم ان سات حروف کو مصاحف عثمانیہ اور حقیقت وفی الواقع میں مصاحف میں تحریر شدہ مکتوب کی طرف راجع کرتے ہیں تو ہم ایک ناقابل اعتراض حقیقت کو نکال لاتے ہیں، اور اس باب میں فیصلہ کن کلام تک پہنچ جاتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ مصاحفِ عثمانیہ پورے سات حروف پر مشتمل ہیں، لیکن بایں معنی کہ ان مصاحف میں سے ہر ایک ان تمام حروف یا ان میں سے اُن بعض حروف پر مشتمل ہے جو اس کے رسم الخط کے موافق ہیں، بایں طور کہ مصاحفِ عثمانیہ مجموعی طور پر ان میں سے کسی حرف سے بالکل خالی نہیں ہیں"۔

بلاشبہ شیخ زرقانی رحمہ اللہ نے اپنے مذہبِ مختار کے مطابق سات حروف کے وجود اور مصاحفِ عثمانیہ میں سات حروف کے اب بھی پائے جانے کو خوب وضاحت اور تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ اب میں ان کی دی ہوئی مثالوں میں سے ایک مثال کے ذکر کرنے پر اکتفا کروں گا، تاہم شیخ رحمہ اللہ نے بعض وجوہِ سبعہ کے بارے میں ذکر کیا ہے کہ وہ عرضۂ اخیرہ کے ذریعے منسوخ ہوگئی ہیں۔ اس کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُونَ﴾

ترجمہ: "اور جو اپنی (سپردگی میں لی ہوئی) امانتوں اور اپنے عہدوں کا خیال رکھنے والے ہیں"۔

اس آیت میں لفظ "أمانة" کو جمع و مفرد، دونوں طرح سے پڑھا گیا ہے، ان دونوں قراءتوں کو مصحفِ عثمانی شامل ہے؛ کیوں کہ اس میں رسم عثمانی اس طرح ہے: ﴿أمٰنٰتهم﴾ یعنی حروف مفردہ کے رسم الخط کے ساتھ، لیکن اس پر جمع کی قراءت کی طرف اشارہ کرنے کیلئے ایک چھوٹا سا الف بھی موجود ہے، اور یہ نقطوں اور اعراب سے خالی ہے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ کے مذہب پر نقد ونظر: علامہ طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں اُمتِ اسلامیہ کے اتحاد کو ٹوٹنے سے بچانے کے لیے باجماع امت سات حروف کو منسوخ کر دیا گیا اور صرف ایک حرف کو باقی رکھا گیا؛ کیوں کہ جب اختلافِ قراءت کی وجہ سے لوگوں نے ایک دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا اور فتنہ پھیلنے کا اندیشہ ہونے لگا تو امت نے اس مشکل کا یہی حل پایا کہ تمام لوگوں کو ایک حرف کی قراءت پر جمع کر دیا جائے۔

علامہ طبری رحمہ اللہ پر رد: ۱- آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قراءت میں باہم اختلاف ہوا، اور قریب تھا کہ فتنہ بپا ہو جاتا جیسا کہ آپ نے کہا تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مشکل کو کیسے حل فرمایا؟

چنانچہ اس کا صرف یہی حل نکالا گیا کہ قراءت میں اختلاف کرنے والوں میں سے ہر ایک کو اسی قراءت پر برقرار رکھا گیا جسے وہ پڑھتا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں سمجھایا کہ وجوہِ قراءت کا متعدد ہونا اُن پر اللہ کی طرف سے رحمت اور آسانی پیدا کرنا ہے، جیسا کہ مذکورہ احادیث اس پر دال ہیں۔

۲- حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اَن اُمتی لاتطیق ذٰلک''۔ (میری امت اس کی طاقت نہیں رکھتی) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت قیامت تک باقی رہے گی، جیسا کہ آج کل ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ بعض اسلامی قومیں بعض حروف کی ادائیگی آسانی سے نہیں کر سکتیں اور نہ ہی بعض لہجوں کو عمدگی سے ادا کر سکتی ہیں۔

۳- سابقہ کلام کو جان لینے کے بعد ہم کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن کے سرخیل حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تھے کو رحمت وتخفیف کا وہ دروازہ جسے اللہ تعالیٰ نے امت اسلامیہ کیلئے وا کر دیا ہو بند کرنا کیسے گوارہ ہو سکتا ہے؟ اور صحابہ کے درمیان پائے جانے والے اختلاف کو دور کرنے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس علاج کی وہ مخالفت کریں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تعدد کو برقرار رکھا تھا؟!

۴- ہم اُصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات سے بے داغ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے قرآن کریم کے چھ حرفوں کو ضائع کرنے پر اتفاق کر لیا ہو، یا اس کی فکر کی ہو، جبکہ وہ حروف نہ

تلاوت کے اعتبار سے منسوخ ہیں اور نہ ہی حکم کے اعتبار سے، حالانکہ وہ حضرات آپ ﷺ کی آپ کے قول وفعل میں مخالفت کرنے والے بھی نہ تھے۔

۵-اگر یہ حروف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں منسوخ ہو گئے ہوتے تو علمائے کرام کیلئے اس میں اختلاف کی کوئی گنجائش باقی نہ رہتی، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے متعلق علماء کے چالیس کے قریب مختلف اقوال ہیں۔

۶-اگر ہم بالفرض تسلیم بھی کرلیں کہ سات حروف عہد عثمانی میں منسوخ ہو گئے تھے تو وہ اس عظیم ترین مقدس کتاب کی صرف تاریخ کے طور پر ہی باقی کیوں نہ رہے، باوجودیکہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے تلاوت یا حکم کے اعتبار سے منسوخ آیات کو بھی بیان کیا ہے، اور اسی طرح منسوخ آیات، موضوع احادیث اور ان میں سے ہر ایک کے طریقہ کو بھی ذکر کیا ہے؟!

۷-مختصر بات یہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کی قول یا فعل میں مخالفت کرنا پسند نہ کرتے تھے، اور نہ ہی انہیں کتاب اللہ میں منسوخ نہ ہونے والے کلام کو تبدیل یا منسوخ کرنے کا کوئی حق تھا، اور یہ ممکن نہیں کہ وہ حضرات اس جیسے کام پر آمادہ ہوں۔ رضی اللہ عنہم وارضاھم۔

زیرِ بحث موضوع پر وارد ہونے والے بعض اعتراضات اور ان کا جواب

پہلا اعتراض: بعض حضرات کا کہنا ہے کہ سات حرفوں سے مراد وہ سات قراءتیں ہیں جو قراء حضرات کے ہاں سات معروف ائمہ سے منقول ہیں؟

جواب: اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ آپ کا قول کئی وجوہ کی بنا پر باطل ہے:

۱-تمہارے قول کے مطابق تو آپ ﷺ کا ارشاد: ''ان ھذا القرآن أنزل علی سبعة أحرف''۔ ائمہ سبعہ کے پیدا ہونے تک فائدہ سے خالی رہے گا، مگر آپ کا یہ قول باطل ہے؛ کیونکہ آپ ﷺ، آپ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم اور تابعین رحمہم اللہ نے ان مذکورہ قراء حضرات کے پیدا ہونے سے قبل قرآن کو ان سات حروف پر پڑھا تھا۔

محقق ابن جزری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ حدیث مبارک سات مشہور قراء یا ان

کے علاوہ دوسرے ان قراء کرام کی قراءتوں کی طرف راجع ہو جو تابعین کے بعد پیدا ہوئے تو یہ اس بات کا سبب بنے گی کہ حدیث ان سات ائمہ کے پیدا ہونے اور ان سے علم قراءت حاصل کرنے تک فائدہ سے خالی رہے، اور اس بات کا بھی سبب بنے گی کہ ہر صحابی کیلئے صرف اسی قراءت پر پڑھنا جائز ہوگا جس کے بارے میں اسے علم ہو کہ یہ سات قراء جب پیدا ہوں گے اور علم قراءت حاصل کریں گے تو اس قراءت کو اختیار کریں گے، جبکہ یہ باطل ہے؛ کیوں کہ قراءت کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ اسے کسی ایسے ثقہ امام سے حاصل کیا جائے جس نے کسی دوسرے امام سے اس علم کو لیا ہو یہاں تک کہ سند آپ ﷺ تک پہنچ جائے۔

۲-حروفِ سبعہ قراءاتِ سبعہ پر عموم مطلق کا درجہ رکھتے ہیں؛ کیوں کہ سات حروف ان قراءات کو بھی شامل ہیں جنہیں آنحضرت ﷺ نے پڑھا، ان کو بھی جو قراء سبعہ تک پہنچیں یا اُن تک پہنچنے سے پہلے ہی منسوخ ہوگئیں، بلکہ تمام قراءات کو شامل ہیں خواہ صحیح ہوں یا منکر ہوں یا شاذ ہوں، چنانچہ جب تک یہ سات حروف قراءاتِ سبعہ سے عام ہوں گے تب تک انہیں بعینہ سات قراءتیں نہیں کہا جا سکتا۔

۳-ازروئے عقل بھی یہ بات محال ہے کہ آپ ﷺ اپنے صحابہ پر تلاوتِ قرآن کو ان قراء کی قراءت کے ساتھ ضروری قرار دیں جو ابھی تک پیدا نہیں ہوئے، یہ رائے بالکل باطل ہے۔

دوسرا اعتراض: بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ سات حرفوں پر قرآن کریم کے نازل ہونے کی احادیث اختلاف کو ثابت کرتی ہیں، جبکہ خود قرآن اس ارشاد خداوندی کے ذریعے اختلاف کی نفی کرتا ہے: ﴿أفلا...﴾

ترجمہ: "کیا پھر قرآن میں غور نہیں کرتے، اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے"۔

اور یہ تو نرا تناقض ہے اور ہمیں نہیں معلوم کہ حدیث وقرآن میں سے کونسا کلام سچا ہے؟!

جواب: احادیث جس اختلاف کو ثابت کرتی ہیں وہ اس اختلاف کے علاوہ ہے جس کی قرآن نفی کرتا ہے، اس بنا پر دونوں سچے رہے؛ کیوں کہ وہ اختلاف جسے احادیث ثابت

کرتی ہیں ایک ایسے محدود دائرے میں الفاظِ قرآن کریم کی ادائیگی اور نطق کے طریقوں سے متعلق ہے جو سات حروف سے متجاوز نہیں ہوتا اور ان تمام وجوہ کو آپ ﷺ سے حاصل کرنا شرط ہے۔

لہٰذا اس صورت میں احادیث میں اختلاف تنویع کے معنی میں ہوگا، رہا قرآن تو وہ اپنے احکام، معانی اور تعلیمات میں تناقض کی نفی کرتا ہے باوجودیکہ تلفظ اور ادائیگی میں تنویع موجود رہتی ہے۔

خلاصہ کلام: شیخ شہاب الدین اَبوشامہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ مصحف عثمانی میں جمع شدہ کلام کیا وہ ان تمام حروفِ سبعہ پر مشتمل ہے جن پر قراءت مقرر کی گئی ہے؟ یا اس میں صرف ایک حرف کا وجود ہے؟ تو قاضی اَبوبکر کہتے ہیں کہ یہ مصحف تمام حرفوں کو شامل ہے، جبکہ اَبوجعفر طبری اور اس کے بعد کے اکثر علماء نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ مصحفِ عثمانی صرف ایک حرف پر مشتمل ہے، اور علامہ شاطبی حضرت اَبوبکر رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ قرآن میں قاضی کے قول اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے جمع کردہ قرآن میں طبری رحمہ اللہ کے قول کی طرف میلان رکھتے ہیں۔

علامہ زرکشی رحمہ اللہ ''البرھان'' میں ذکر فرماتے ہیں کہ بعض متاخرین علماء کا کہنا ہے کہ اُن تمام سات قراءتوں کا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہونا صحیح ہے جنہیں قراء سبعہ نے پڑھا ہے، اور اسی پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مصحف قرآنی کو جمع فرمایا تھا، اور یہ سات قراءتیں ان قراء کرام کی اختیار کردہ ہیں؛ کیوں کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنی روایت وعلم کے مطابق اپنے نزدیک احسن طریقۂ قراءت کو اختیار کیا، قراءت کے ایک طریقہ کو لازم پکڑا، اسے روایت کیا اور پڑھا تو وہ قراءت اس کے نام سے مشہور ہوگئی اور اسی کی جانب منسوب کردی گئی، چنانچہ یوں کہا جانے لگا کہ نافع کی قراءت، ابن کثیر کی قراءت وغیرہ، ان قراء میں سے کسی ایک نے بھی دوسرے کی قراءت سے منع کیا اور نہ ہی اسے ناپسند کیا، بلکہ اسے جائز اور اچھا قرار دیا......

آگے جا کر علامہ فرماتے ہیں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کا ان قراء سے صحیح طور پر ثابت ہو جانے والی قراءت پر اعتماد کرنے پر اجماع ہو چکا ہے، اور قرآن کریم

کا سات حروف پر نازل کرنا اللہ کی طرف سے امت پر وسعت ورحمت کی بنا پر ہے ؛ کیوں کہ اگر ہر قوم کو اپنی لغت کو چھوڑنے اور امالہ، ہمزہ، لین اور مدو غیرہ کرنے کی اُس عادت سے پھرنے کا مکلف بنا دیا جاتا جس پر ان کی پرورش ہوئی تھی تو ان پر یہ معاملہ دشوار ہو جاتا(۱)۔

مشہور قراء تیں: اس بحث کے اختتام پر ہم اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ قراءت کے بارے میں مختصر سی گفتگو کریں اور یہ بتائیں کہ قراء تیں کیسے وجود میں آئیں؟ اور مشہور قراء کون کون ہیں؟

قراءات کی تعریف: "قراءت" جمع ہے "قراءۃ" کی جو کہ "قرأ یقرأ قراءۃً" سے مصدر ہے، اصطلاح میں قرآن کی دائیگی کے مذاہب میں سے ایک ایسے مذہب کا نام ہے جسے ائمہ قرآن میں سے کوئی قاری اس طور پر اختیار کرتا ہے کہ وہ قرآن کریم کی ادائیگی کے طریقوں میں دوسرے قاری کے مخالف ہوتا ہے، نیز یہ قراءات صحیح سندوں کے ساتھ رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہوتی ہیں۔

کیا عہدِ صحابہ میں قراء حضرات موجود تھے؟ جی ہاں! ان قراء کا زمانہ جنھوں نے لوگوں کو تلاوتِ کلام پاک میں اپنے اپنے طریقوں پر لا کھڑا کیا صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے دور کی طرف لوٹتا ہے، صحابہ کرام میں قراءت میں یہ حضرات مشہور ہوئے: ''حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابن مسعود اور حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم وغیرہ''۔ ان حضرات سے مختلف علاقوں میں صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم نے استفادہ کیا، اور یہ تمام کے تمام

(۱) واضح رہے کہ یہ سارا اختلاف صرف نظریاتی نوعیت کا ہے، عملی اعتبار سے قرآن کریم کی حقانیت وصداقت میں اس اختلاف کا ادنیٰ اثر بھی مرتب نہیں ہوتا؛ کیونکہ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ قرآن کریم جس شکل میں آج ہمارے پاس موجود ہے وہ تواتر کے ساتھ چلا آرہا ہے اور جتنی قراء تیں تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچی ہیں وہ سب قرآن کا حصہ ہیں اور صحیح ہیں، اختلاف صرف حروفِ سبعہ کی مراد کی تعیین میں ہے، اس کے اعتبار سے سارے حروف کی قرآن میں موجودگی میں بھی اختلاف ہوگا، مثلاً اگر کسی کے نزدیک حروفِ سبعہ میں چھ منسوخ ہو چکے ہیں تو اس کے نزدیک بھی قرآن اپنی موجودہ شکل میں متواتر قراءتوں کے بالکل درست ہے، اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں، ان اختلافات کی بنا پر معاذ اللہ قرآن کریم مختلف فیہ نہیں بنا۔

اپنی قراءت کی سند کو رسول اللہ ﷺ تک پہنچاتے تھے، یہاں تک کہ پہلی صدی ہجری میں تابعین کا دور شروع ہوا، اور قراءت کو محفوظ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو ایک جماعت نے اپنے آپ کو اس کام کے لیے فارغ کر دیا اور قراءت کے محفوظ کرنے کی طرف اپنی پوری توجہ صرف کردی اور دوسرے علوم شرعیہ کی طرح اسے بھی مستقل علم بنا دیا۔

اب ہم ایک بار پھر کہتے ہیں کہ قراءتیں کیسے وجود میں آئیں؟ ابھی ابھی ہم نے جان لیا کہ عہدِ صحابہ سے لے کر عہد تابعین تک قراء کا زمانہ تھا، اور قرآن کریم میں قابل اعتماد بات ایک ثقہ شخص کا دوسرے ثقہ سے اور ایک امام کا دوسرے امام کے توسط سے نبی ﷺ سے لینا اور حاصل کرنا ہے، پہلے مصاحف بغیر نقطوں اور اعراب کے تھے اور ان مصاحف میں کلمہ کی ایک صورت مختلف وجوہِ قراءت میں سے ہر ممکن صورت کا احتمال رکھتی تھی، اور اگر صورتِ کلمہ مختلف وجوہ کا احتمال نہ رکھتی تھی تو کلمہ کو ایک مصحف میں کسی ایک صورت پر اور دوسرے مصحف میں کسی دوسری صورت پر لکھ دیا جاتا اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا۔

پس اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہا قراءت اور قرآن کے باب میں اُخذ و روایت پر اعتماد کرنا ہی سہارا اور بنیاد ہے۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم کا آنحضرت ﷺ سے حاصل کرنے میں اختلاف ہو گیا، پس بعض نے تو قرآن کو ایک حرف پر پڑھا اور بعض نے آپ ﷺ سے دو حرفوں پر حاصل کیا، اور بعض نے اس سے کچھ زیادہ حروف پر پڑھا، پھر وہ اسی حالت میں مختلف ممالک میں پھیل گئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے جب مصاحف کو مختلف علاقوں کی طرف بھیجا تو ہر مصحف کے ساتھ اس شخص کو بھی بھیجا جس کی قراءت اس مصحف کے اکثر و بیشتر حصہ کے موافق تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اختلافِ قراءت کے ساتھ مختلف شہروں میں پھیل جانے پر تابعین اور تبع تابعین نے اُن سے علم حاصل کیا، اور صحابہ کے اختلاف کی وجہ سے تابعین کے لینے میں بھی اختلاف رہا، یہاں تک کہ یہ معاملہ اسی طریقہ پر ان مشہور ائمہ تک پہنچ گیا جنھوں نے قراءتوں کو حاصل کرنے کیلئے اپنے آپ کو خاص اور فارغ کر دیا اور انہیں یاد کرنے لگے، ان کی طرف پوری توجہ دی اور انہیں پھیلانے لگے۔

یہی علم قراءت اور اختلافِ قراءت کا منشا ہے اگرچہ درحقیقتیہ اختلاف جیسا کہ معلوم ہے بہت سارے مواضع میں اتفاق رائے کی بنسبت بہت کم مواقع میں پایا جاتا ہے، نیز یہ

اختلاف ان سات حرفوں کے دائرے سے باہر نہیں نکلتا جن پر قرآن کریم نازل ہوا، اور جو تمام کے تمام اللہ کی طرف سے ہیں۔

اس مقام میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم شیخ زرقانی رحمہ اللہ کے اپنی کتاب ''مناہل العرفان'' میں تحریر کردہ کلام کو نقل کرلیں، انہوں نے اسے علامہ نویری رحمہ اللہ کی ایک غیر مطبوع کتاب سے نقل کیا ہے (یہ مخطوطہ دار الکتب المصریۃ میں موجود ہے اور علامہ نے اسے ''الطیبة في القراءات'' کی شرح کے طور پر لکھا ہے) وہ فرماتے ہیں کہ:

''نقل قرآن میں حفاظ کرام پر اعتماد کیا گیا ہے، اسی وجہ سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ہر مصحف کو اُس شخص کے ساتھ بھیجا جس کی قراءت اس کے اکثر حصہ کے موافق تھی، اور یہ ضروری نہ تھا، ہر شہر کے لوگوں نے اپنے مصحف میں موجود حرف کے مطابق پڑھا، اور جو قراءت صحابہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کی ہوتی لوگوں نے اسے صحابہ سے سیکھا، پھر ایک جماعت نے ان حضرات سے قراءت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں، اپنی راتوں کو ان کے یاد کرنے میں جاگ کر گزار دیا، اور اپنے دنوں کو ان کے نقل کرنے میں تھکا دیا، یہاں تک کہ وہ لوگ ائمۂ اقتداء اور رہنمائی کے ستارے بن گئے، اور ان کے شہر کے لوگوں نے ان کی قراءت کے قبول کرنے پر اتفاق کرلیا، اور ان کی روایت ودرایت کی صحت میں کسی دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہ کیا، اور قراءت کے درپے ہونے کی وجہ سے قراءت ان کی طرف منسوب ہوگئی اور قراءت میں ان پر اعتماد کیا جانے لگا۔

پھر ان کے بعد قراء کی کثرت ہوگئی، اور ممالک میں پھیل گئے، اور نسل در نسل ان کی نیابت چل پڑی، اور ان کے طبقات معروف ہوئے، اور صفات کا باہم اختلاف ہوا، پس بعض ان میں سے روایت ودرایت دونوں میں مشہور قراءت کے ماہر تھے، اور کوئی صرف ایک وصف کا حامل تھا، اور دوسرا ایک سے زیادہ اوصاف رکھتا تھا، اس وجہ سے ان کے درمیان اختلاف بڑھ گیا اور اتحاد میں کمی آگئی، تب اس موقع پر بڑے بڑے ماہر ائمہ اور اکابرین امت کھڑے ہوئے اور بقدر حاصل اجتہاد کرنے میں مبالغہ کی حد تک کام کیا، اور اپنے قائم کردہ اصولوں اور بیان کردہ ارکان کے مطابق کھرے کھوٹے میں تمیز کی، حرفوں اور قراء

توں کو جمع کیا، قراءتوں کے طرق وروایات کی سند بیان کی، اور صحیح وشاذ، کثیر ونادر قراءتوں کو ذکر کیا''(۱)۔

قراءتوں کی تعداد اوران کی اقسام: ''الاتقان'' کے مصنف نے ذکر کیا ہے کہ قراءتیں یہ ہیں: ''متواتر، مشہور، آحاد، شاذ، موضوع، اور مدرج''(۲)۔

---

(۱) قراءت نام ہے حروفِ سبعہ میں سے خاص خاص حروف کو منتخب کر کے اُن کی ایک خاص ترتیب قائم کر دینے کا، قرآن کریم کے بعض الفاظ کو اللہ تعالیٰ نے کئی کئی طرح سے نازل فرمایا ہے، مثلاً: ''جِبْرِیْلَ، جَبْرَئِیْلَ، جَبْرَئِلَ، جَبْرِیْلَ۔ اَرْجِهْ، اَرْجِهٖ، اَرْجِهِ، اَرْجِئْهِ۔ اُفٍّ، اُفَّ، اُفِّ۔ هَیْهَاتَ، هَیْهَاتِ'' ۔ وغیر ذالک۔ اور پھر انہیں سے ائمۂ قراءت نے بہ پابندی شرائط: موافقتِ رسم وعربیت وصحتِ سند جدا جدا ترتیبیں اختیار کر لیں، پس اصطلاحِ قراء میں انہی مختلف ترتیبوں کا نام قراآت وروایات ہے۔ مثلاً: ایک امام نے یہ ترتیب اختیار کی: ''یُؤْمِنُوْنَ۔ الصَّلٰوةَ۔ رَزَقْنٰهُمْ'' ۔ جیسا کہ امام عاصم کی قراءت ہے، اور دوسرے امام نے یوں ترتیب قائم کی: ''یُؤْمِنُوْنَ۔ الصَّلٰوةَ۔ رَزَقْنٰهُمْ'' ۔ جیسا کہ امام ابن کثیر کی قراءت ہے، اسی طرح دیگر ترتیبات کو قیاس کر لیں، اور یہ ترتیبات اور قراآت بہت سی ہو سکتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ دورِ اول میں بے شمار قراآت پڑھی اور پڑھائی جاتی تھیں، جن کی تعداد ابو عبید اور قاضی اسماعیل رحمہما اللہ نے ۲۵ لکھی ہے۔ بعد میں جوں جوں سستی پیدا ہوتی گئی، شوق اور ہمت بھی گھٹتی چلی گئی اور قوتِ ضبط وحافظہ میں کمی بھی واقع ہوتی گئی، جس سے ان کی تعداد بھی کم ہوتے ہوتے دس قراآت یا بالفاظِ دیگر ۲۰ روایات تک آ رہی، پھر اس علم کی نسبت ان قراآت وروایات کے ائمہ کی طرف ہونے لگی؛ کیونکہ انہوں نے اپنے آپ کو اس علم کی خدمت واشاعت کے لیے فارغ اور وقف کر دیا تھا، اسی لیے وہ اس میں مشہور ہو گئے، پس یہ نسبت بوجہِ ملازمت ودوام واختیار کے ہے، نہ کہ بوجہِ اختراع وابتداع وایجاد کے۔ ان قراآت کی مثال یوں ہے کہ جیسے سات قسم کے پھولوں کے درخت اور بیلیں ہوں اور پھر کئی اشخاص اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی پسند کے مطابق ان سات درختوں اور بیلوں سے مختلف قسم کے رنگا رنگ اور گونا گوں گلدستے اور مجموعے تیار کریں اور ہر ایک ان ساتوں درختوں سے ایک پھول لینے کے بعد پھر کوئی تو بالکل پھول نہ لے اور کوئی دوسرے درخت سے دو اور تیسرے سے تین اور اور دوسرا شخص چوتھے سے تین اور پانچویں سے چار لے، اور اس طرح مختلف قسم کے گلدستے ترتیب دیں۔ اسی قیاس پر قراآت وروایات کی ترتیبوں کو تصور کر لیں، البتہ ابتداء میں حروفِ سبعہ کی صورتیں زیادہ تھیں، پھر عرضۂ اخیرہ میں بہت سی صورتیں منسوخ ہو گئیں، تاہم حروفِ سبعہ اب بھی مصاحف میں (جمہور کے قول کے مطابق) موجود ہیں۔

(۲) جو اختلافات آخری دور میں منسوخ ہو گئے اور وہ رسمِ عثمانی کے خلاف نہ تھے انہیں بوجہِ عدمِ شہرت وتلقی بالقبول وعدمِ صحت واتصالِ سند کے باصطلاحِ قراء ''قراآتِ شاذہ'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، اور جو وجوہ بعض صحابہ=

قاضی جلال الدین بلقینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قراءت تین قسم پر ہے: متواتر، آحاد اور شاذ، تاہم متواتر سات مشہور قراء تیں ہیں، اور آحاد تین قاریوں کی وہ قراء تیں ہیں جو قراءت میں دس کے عدد کو پورا کرتی ہیں، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی قراءت بھی اس کے ساتھ ملحق ہے، اور شاذ تابعین کی قراءت کو کہا جاتا ہے، مثلاً اُعمش، یحیی بن وثاب، ابن جبیر رحمہم اللہ وغیرہ کی قراءت۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ قاضی صاحب کے اس کلام میں نظر ہے، اس بارے میں سب سے عمدہ بات اپنے زمانہ کے امام القراء، شیخ اَبوالخیر ابن الجزری رحمہ اللہ نے کی ہے، وہ اپنی کتاب ''النشر'' کے شروع میں رقم طراز ہیں کہ ہر وہ قراءت جو عربی زبان کے موافق ہو اگرچہ کسی ایک وجہ سے ہو، مصاحفِ عثمانیہ میں سے کسی ایک مصحف کے مطابق ہو اگرچہ احتمالاً ہو، اور اس کی سند صحیح ہو تو وہ صحیح قراءت ہے جس کا رد کرنا جائز ہے اور نہ ہی انکار کرنا، بلکہ وہ ان حروفِ سبعہ میں سے ہے جن کو لے کر قرآن نازل ہوا ہے، لوگوں پر اس کو قبول کرنا واجب ہے خواہ وہ ائمۂ سبعہ سے منقول ہو یا ائمۂ عشرہ سے یا ان کے علاوہ دیگر مقبول ائمہ سے مروی ہو، اور جب ان تین ارکان میں سے کوئی ایک رکن میں بھی مفقود ہوگا تو اس پر شاذ یا باطل قراءت کا اطلاق ہوگا چاہے وہ قراءت ان ائمۂ سبعہ سے منقول ہو یا ان سے بھی بلند پایہ حضرات سے، یہی بات اکابر و اسلاف میں سے ائمۂ محققین کے نزدیک صحیح ہے۔

''الطیبۃ'' کے مصنف قبولِ قراءات کے ضابطہ کے بارے میں کہتے ہیں:

ہر وہ قراءت جو قاعدۂ نحو کے مطابق ہو اور رسم عثمانی کی احتمالی صورت اسے شامل ہو اور وہ از روئے سند بھی صحیح ہو تو وہ قرآن ہے پس یہی تین اس کے بنیادی ارکان ہیں اور جہاں بھی کوئی رکن مفقود ہو تو آپ فیصلہ کر دیں کہ وہ شاذ ہے، اگرچہ وہ قراءاتِ سبعہ میں سے ہو۔

قراء تیں: بیان کیا گیا ہے کہ قراءات سے قراءاتِ سبعہ، قراءاتِ عشرہ اور قراءاتِ اَربع عشرہ مراد ہیں، شہرت اور عظمتِ شان میں سب سے زیادہ حصہ قراءاتِ سبعہ نے پایا، ان قراءات کو سات مشہور ائمہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے، وہ ائمہ حضرت نافع، حضرت عاصم،

= سے منقول ہیں اور اب وہ معمول بہا نہیں وہ ''قرآآتِ مدرجہ'' کی قبیل سے ہیں جو صرف وضاحت اور تفسیر کے لیے تھیں، ان کی تلاوت درست نہیں۔ (مفاتیح ملخصا)

حضرت حمزہ، حضرت عبداللہ بن عامر، حضرت عبداللہ بن کثیر، حضرت اَبوعمرو بن علائ، اور حضرت علی کسائی رحمہم اللہ ہیں۔ اور قراءاتِ عشرہ میں سات تو یہی ہیں، اور حضرت اَبوجعفر، حضرت یعقوب، حضرت خَلَف رحمہم اللہ کی قراءتیں ان پر مستزاد ہیں [1]۔ اور قراءاتِ اَربع عشرہ میں ان دس کی قراءتوں پر چار کی زیادتی ہے، اور وہ حضرت حسن بصری، حضرت ابن محیص، حضرت یحییٰ یزیدی اور حضرت شنبوذی رحمہم اللہ کی قراءتیں ہیں۔

علمِ قراءات کے پہلے مصنّفین: علمِ قراءات پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ وہ کوئی قابلِ تذکرہ چیز نہ تھا، علمِ قراءات میں سب سے پہلے اَبوعبید قاسم بن سلام، اَبوحاتم سجستانی، اَبوجعفر طبری، اسماعیل قاضی رحمہم اللہ وغیرہ نے کتب تصنیف کیں۔

قراءاتِ سبعہ کب مشہور ہوئیں؟ قراءاتِ سبعہ دوسری صدی ہجری کے شروع میں اسلامی ممالک میں شہرت پذیر ہوئیں، بصرہ میں لوگوں نے اَبوعمرو اور یعقوب کی، کوفہ میں حمزہ اور عاصم کی، شام میں ابن عامر کی، مکہ میں ابن کثیر کی اور مدینہ میں نافع کی قراءت کو اختیار کیا۔

قراءات کی تدوین کب ہوئی؟ قراءات کی تدوین تیسری صدی کے اخیر میں بغداد میں امام ابن مجاہد اَحمد بن موسیٰ بن عباس رحمہ اللہ کے ہاتھوں عمل میں آئی، انہوں نے سات مشہور ائمہ کی قراءات کو جمع فرمایا لیکن انہوں نے کسائی کا نام رہنے دیا جبکہ یعقوب کا نام حذف کر دیا۔

ابن مجاہد رحمہ اللہ کا طریقۂ جمع: انہوں نے اپنے اوپر یہ لازم کر دیا تھا کہ صرف اس قاری سے نقل کریں گے جو ضبط و اَمانت میں، قراءت کی ملازمت میں ایک طویل عرصہ گزارنے میں اور اپنے سے اَخذ و تعلّم میں راویوں کی آراء کی یکسانیت میں مشہور ہو، ابن مجاہد رحمہ اللہ کا ان سات قراء پر اقتصار کرنا قراء کو ان سات میں منحصر نہیں کرتا، اور نہ کسی پر لازم کرتا ہے کہ وہ ان مشہور حضرات کی حدودِ قراءات پر ٹھہر جائے اور دوسرے ائمہ کی قراءت کی طرف نہ بڑھے۔

سات مشہور قرائے کرام: قراءتِ متواترہ اُن حفّاظ قراء سے ہم تک منقول ہوئی

(۱) ان تینوں حضرات کی بھی دو، دو روایتیں ہیں، امام ابوجعفر مدنی بروایت ابن وردان و ابن جماز، امام یعقوب حضرمی بروایتِ رویس و روح، امام خلف بزار بروایتِ اسحاق و ادریس۔ (مفاتیح)

ہیں جو حفظ وضبط اور پختگی میں مشہور تھے، یہ حضرات قراءاتِ مشہورہ کے امام تھے، انہوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے توسط سے ان قراءات کو رسول اللہ ﷺ سے نقل کیا ہے، انہیں باعظمت کتاب کی تعلیم وتعلّم کی فضیلت بھی حاصل تھی، جیسا کہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن مجید سیکھے اور سکھائے''۔ شیخ أبو الیسر عابدین رحمہ اللہ نے ان قراء کو شعر کے دو بیتوں کے اندر جمع کر دیا ہے:

پس نافع، ابن کثیر، عاصم — حمزہ پھر أبو عمرو اور یہ سب
ابن عامر کے ساتھ آنے والے کسائی — بلاشبہ قراءاتِ سبعہ کے امام ہیں

قراءِ سبعہ کا تعارف

۱- ابنِ عامر رحمہ اللہ: ان کا نام عبداللہ یحصبی ہے، ولید بن عبدالملک کے زمانۂ خلافت میں دمشق کے قاضی رہے، کنیت أبو عمران ہے، تابعی ہیں، آپ نے علم قراءت مغیرہ بن أبی شہاب مخزومی رحمہ اللہ سے، انہوں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے، اور انہوں نے آنحضرت ﷺ سے حاصل کیا۔ ۱۱۸ھ میں دمشق میں وفات پائی، ھشام اور ذکوان رحمہما اللہ نے آپ کی قراءت کو روایت کرنے میں مشہور ہوئے۔ صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ ان کے متعلق فرماتے ہیں: البتہ شام کا شہر دمشق جو کہ ابن عامر کا مسکن ہے عبداللہ کے باعث (طالبین قراءت کے لیے) عمدہ ٹھکانہ بن گیا ھشام اور عبداللہ نے جو کہ منسوب ہیں ذکوان کی طرف سند کے ساتھ ان سے قراءت کو نقل کیا ہے

۲- ابن کثیر رحمہ اللہ: یہ أبو محمد عبداللہ بن کثیر داری مکی ہیں، مکہ میں لوگوں کے امام قراءت تھے، تابعی ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت أبو أیوب أنصاری اور حضرت أنس بن مالک رضی اللہ عنہم سے ملاقات کی ہے، ۱۲۰ھ میں وفات پائی، ان سے قراءت کے راوی أحمد بزی متوفی ۲۵۰ھ اور محمد قنبل متوفی ۱۹۱ھ ہیں۔ ان کے بارے میں صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اور مکہ جو عبداللہ کی جائے اقامت ہے
وہ جو کہ قراء کی جماعت میں غالب نام آور بلند ترین ہیں

أحمد بزی نے ان سے قراءت نقل کی ہے اور محمد نے بھی
کہ جن کا لقب قنبل ہے سند پر اعتماد کرتے ہوئے

۳-عاصم کوفی رحمہ اللہ: یہ عاصم بن أبی النجود أسدی ہیں، انہیں ''ابن بہدلہ'' کہا جاتا ہے، کنیت أبو بکر ہے، تابعی ہیں، ۱۲۷یا۱۲۸ھ میں کوفہ میں ان کا انتقال ہوا، ان سے قراءت کے راوی شعبہ متوفی ۱۹۳ھ اور حفص متوفی ۱۸۰ھ ہیں۔ ان کے بارے میں صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قراءِ سبعہ میں سے تین امام (یعنی عاصم، حمزہ اور کسائی) چمکتے دمکتے کوفہ میں ہیں، جنہوں نے علم کی خوب اشاعت کی جس کی وجہ سے کوفہ عود اور لونگ جیسی خوشبو سے مہکنے لگا، ایک أبو بکر ہیں کہ جن کا نام عاصم ہے، عاصم کے ایک راوی شعبہ ہیں جو کہ دیگر سب پر فضیلت میں سبقت لے جانے والے ہیں، شعبہ سے مراد ابن عیّاش أبو بکر الرضا ہیں، دوسرے حفص ہیں جو کہ (عاصم کی روایت کے) ضبط میں سب سے افضل ہیں۔

۴-أبو عمرو رحمہ اللہ: ان کا نام أبو عمرو، زبّان بن علاء بن عمار بصری ہے، سب راویانِ قراءت کے شیخ ہیں، کہا جاتا ہے کہ ان کا نام یحییٰ ہے، اور بعض کا کہنا ہے کہ ان کی کنیت ہی ان کا نام ہے، ۱۵۴ھ میں کوفہ میں ان کی وفات ہوئی ہے، ان کی قراءت کے دو راوی أبو عمرو دوری اور شعیب سوسی ہیں۔ صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

البتہ امام مازنی ان میں خالص النسب ہیں یعنی أبو عمرو بصری جن کے والد علاء ہیں، أبو عمرو نے اپنے علم کی بارش یحیی یزیدی پر برسائی تو وہ شیریں اور پیاس دور کرنے والے علم نافع سے سیراب ہوگئے أبو عمرو دوری اور صالح أبو شعیب سوسی نے ان سے قراءت کو لیا ہے

۵-حمزہ کوفی رحمہ اللہ: یہ حمزہ بن حبیب بن عمارہ زیات تیمی ہیں، عکرمہ بن ربیع تیمی کے آزاد کردہ غلام ہیں، کنیت أبو عمارہ ہے، أبو جعفر منصور کے عہدِ خلافت میں حلوان شہر میں ۱۵۶ھ وفات پائی، ان کی بواسطۂ سلیم قراءت کے دو راوی خلف متوفی ۲۲۹ھ اور خلاد متوفی ۲۲۰ھ ہیں۔ صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

اور حمزہ کس قدر پاکیزہ پرہیز گار امام، نہایت صابر، قرآن کریم کو ترتیل سے پڑھنے والے ہیں! ان سے خَلَف اور خلاد نے قراءت کی روایت کی ہے بواسطہ سلیم جو کہ حمزہ سے

یہ مضبوط و محفوظ روایت نقل کرتے ہیں

٦- نافع رحمہ اللہ: ان کا نام أبورویم نافع بن عبدالرحمن أبی نعیم لیثی ہے، أصلاً أصفہانی ہیں، مدینہ منورہ میں قراء کی رئاست ان پر جا کر ختم ہو جاتی ہے، ١٦٩ھ میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوا، ان کے دو راوی قالون متوفی ٢٢٠ھ اور ورش متوفی ١٩٧ھ ہیں۔ صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

تاہم خوشبو کے بارے میں شریف راز والے نافع ہیں سو یہ وہی ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ کو اپنا مسکن بنالیا اور قالون یعنی عیسیٰ پھر عثمان یعنی قراء میں سے ورش دونوں نے امامِ نافع کی صحبت سے بلند بزرگی کو جمع کرلیا

٧- کسائی رحمہ اللہ: یہ کوفی علمائے نحو کے امام علی بن حمزہ ہیں، ان کی کنیت أبوالحسن ہے، (بچپن میں) احرام کی حالت میں لباس پہننے کی وجہ سے انہیں ''کسائی'' کہا جانے لگا، ١٨٩ھ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ خراسان جاتے ہوئے ''ری'' کے ایک گاؤں ''رنبویہ'' میں فوت ہوئے، ان کی قراءت کے دو راوی أبوالحارث متوفی ٢٤٢ھ اور حفص دوری ہیں۔ صاحبِ شاطبیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:ـ

اور تاہم کسائی کہ جن کا لقب کسائی ہے کیوں کہ انہوں نے احرام کی حالت میں بھی لباس پہن لیا تھا قراء میں سے لیث أبوالحارث الرضا نے ان سے روایت کی ہے اور حفص دوری نے بھی جن کا تذکرہ گزر چکا ہے۔

☆☆......☆☆

پانچویں فصل

قرآن کریم میں نسخ اور اس کی تشریعی حکمت

تابناک اسلامی شریعت اس طور پر وجود میں آئی کہ وہ لوگوں کے مفادات کو برقرار رکھنے والی، زمانہ کے بدلتے حالات کے ساتھ ساتھ چلنے والی اور ہر زمان ومکان کے مناسب تھی، اللہ تبارک وتعالیٰ کا اپنے بندوں پر کرم تھا کہ ان کے لیے احکام میں تدریج کی سنت کو جاری کیا، تا کہ انسانیت میں ان شرعی احکام کو رضا، خوشی اور اطمینان کے ساتھ قبول کرنے کی مکمل صلاحیت واستعداد باقی رہے، اور وہ اس میں کسی قسم کی بوریت واکتاہٹ اور تکلیف ومشقت محسوس نہ کرے، اور تا کہ یہ روشن شریعت جیسا کہ مشیتِ الٰہی ہے نرم، آسان اور سہل شریعت ہو، اس میں کوئی مشکل اور پیچیدگی ہو اور نہ ہی اس میں کوئی زیادتی اور بے جا پریشانی ہو۔

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی حقیقت کو بیان کر رہا ہے: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة: ۱۸۵)

ترجمہ: ''اللہ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے اور تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں''۔

اور اسی طرح فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ﴾ (الحج: ۷۸)

ترجمہ: ''اور (اس نے) تم پر دین (کے احکام) میں کسی قسم کی تنگی نہیں کی، تم اپنے باپ ابراہیم علیہ السلام کی (اس) ملت پر (ہمیشہ) قائم رہو''۔

اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ احکام کی فرضیت ومشروعیت صرف بندوں کی مصلحت و مفاد ہی کے لیے ہوئی، اور یہ مصلحت زمان ومکان کے بدلتے رہنے سے بدلتی رہتی ہے، لہٰذا

جب کوئی ایک حکم کسی زمانہ میں مشروع ہوتا ہے اور ضرورت اس کی متقاضی ہوتی ہے، پھر جب یہ ضرورت رفع ہو جاتی ہے تو حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سابقہ حکم کو ایسے حکم کے ساتھ تبدیل و منسوخ کر دیا جائے جو اس دوسرے وقت کے موافق ہو، چنانچہ یہ تغییر اور تبدیلی مصلحت کو ثابت رکھنے والی، مقصد کو پورا کرنے والی اور بندوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے، اس کی مثال اس ڈاکٹر کی سی ہے جو مریض کے لیے مزاج، قابلیت اور صلاحیت کے اختلاف کی وجہ سے غذاؤں اور دواؤں میں تبدیلی کرتا رہتا ہے۔

اور انبیاء علیٰ نبینا وعلیہم السلام بھی دلوں کے معالج اور نفوسِ انسانیہ کی اصلاح کرنے والے ہوتے ہیں، اس لئے ان کی شریعتیں زمان و مکان کے اختلاف کی وجہ سے مختلف رہیں، اور وہ شریعتیں احکام میں تدریجی طریقہ کو لے کر آئیں، کیونکہ یہ طریقہ اجسام کے لیے بمنزلہ دواؤں، جڑی بوٹیوں کے ہے، سو ایک شریعت کا وجود اگر کسی وقت میں مصلحت ہوگا تو وہی دوسرے وقت میں مضر ہو جائے گا، اور جو بات ایک امت کے لیے مناسب ہوتی ہے وہ دوسری امت کے لیے نفع بخش نہیں ہو سکتی، اور یہی وہ اس علیم و حکیم ذات کی حکمت ہے جس نے ہر زمانہ کے لیے اس کے مناسب حکم کو فرض کیا۔

علامہ قاسمی رحمہ اللہ کا نسخ کے بارے میں ایک عمدہ کلام: علامہ جمال الدین قاسمی رحمہ اللہ کی تفسیر موسوم بہ ''محاسن التاویل'' میں نسخ کے متعلق ایک عمدہ بات مذکورہ ہے، ہم اس کے حسن کی بناء پر اس کو یہاں نقل کرتے ہیں، قاسمی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''ذاتِ باری تعالیٰ نے تئیس سال کے عرصہ میں عرب قوم کی بتدریج تربیت کی، اور یہ تربیت غیر عرب کے لیے معاشرتی مسائل اور سماجی عوامل کی بناء پر چند صدیوں میں ہی مکمل اور ممکن ہوتی، اسی لیے ان پر احکام ان کی قابلیت و استعداد کے مطابق ہی لاگو کیے گئے اور جب ان کی استعداد بڑھ گئی تو اللہ نے اس پہلے حکم کو دوسرے حکم سے تبدیل کر دیا، اور یہ تمام افراد اور قوموں میں خالق کی یکساں طور پر عادت رہی ہے، چنانچہ اگر آپ اس زندہ کائنات میں غور و فکر کریں تو جان لیں گے کہ نسخ ایک محسوس فطری قانون و ضابطہ ہے جو امور مادیہ اور غیر مادیہ دونوں میں بیک وقت پایا جاتا ہے۔

چنانچہ انسانی خلیوں کا رحم مادر کے اندر پہلے نومولود، پھر بچے، پھر لڑکے اور نوجوان،

پھر ادھیڑ عمر اور عمر رسیدہ شخص کی طرف منتقل ہونا، اور ان اَدوار میں ہر دور میں لاحق ہونے والے عوارض آپ کو ایک واشگاف دلیل کے ذریعے یہ بتا رہے ہیں کہ کائنات میں ردو بدل ایک فطری ثابت شدہ قانون ہے، اور جب یہ تکوینی نسخ وتبدیلی کائنات میں کوئی اجنبی اور نا مانوس بات نہیں تو ایک حکم کا دوسرے حکم کے ذریعے منسوخ وتبدیل ہونا کسی ایسی قوم میں کیسے نامانوس ہوسکتا ہے جو کہ ارتقائی دور اور ادنی سے اعلیٰ درجہ کی طرف بڑھنے کی پوزیشن میں ہو؟

کیا وہ شخص جس میں عقل کی تھوڑی سی بھی رمق ہو یہ خیال کرسکتا ہے کہ حکمت کا تقاضا یہ تھا کہ عربوں کو ان کی ابتدائی حالت میں ایسے احکام کا پابند بنا دیا جاتا جن کا مکلف ہونا انسانی بلندیوں کی آخری حد اور بشری کمالات کے انتہائی زینہ پر ہونے کے وقت ہی ان کے لئے ممکن ہوسکتا تھا؟

اور جب یہ بات دنیا کا کوئی عقلمند شخص نہیں کہہ سکتا تو اللہ کے بارے میں جو کہ اُحکم الحاکمین ہیں یہ کہنا کیسے جائز ہوگا کہ وہ امت کو اس کے دورِ طفولیت میں ان باتوں کا مکلف بنا دیتے جن کی وہ صرف اپنے دورِ شباب اور زمانۂ کہولت میں ہی متحمل ہوسکتی تھی؟

دونوں شریعتوں میں کون سی شریعت افضل ہے؟ ہماری شریعت کہ جس کی حدود اور احکام کو اللہ تعالیٰ نے بذات خود ہمارے لیے مقرر کیا، اس میں سے جو چاہا اپنے علم سے منسوخ کرتے گئے، اور اسے اس طرح کامل کر دیا کہ جن وانس میں سے کوئی بھی اتنی سکت نہیں رکھتا کہ اس میں سے کسی ایک حرف کو (نقص کی بناء پر) کم کردے، کیونکہ وہ ہر زمانہ ومکان کے موافق اور انسان کے احوال میں سے ہر حالت کے مناسب ہے، یا دیگر دینی شریعتیں کہ جسے کاہنوں سے بدل کر رکھ دیا اور دنیا نے اس کے احکام کو مٹا ڈالا، بایں طور کہ انسانی زندگی کے تقاضوں سے کلی طور پر ان شریعتوں کے منافی ہونے کی وجہ سے ان پر عمل کرنا ناممکن ہے؟

نسخ کے لغوی اور اصطلاحی تعریف: نسخ لغت میں زائل کرنے کے معنی میں آتا ہے، عرب کہتے ہیں: "نسختِ الشمسُ الظل" یعنی سورج نے سایہ کو زائل کر دیا، اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد آیا ہے: ﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ﴾ (الحج: ۵۲) یعنی "اللہ تعالیٰ شیطان کے ڈالے ہوئے شبہات کو زائل اور باطل کر دیتا ہے"۔

اور یہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے، اور اسی معنی میں

عرب کا یہ قول ہے: "نسختُ الکتابَ" میں نے کتاب کو نقل کیا، یعنی ایک کتاب کے نوشتہ کو دوسرے اوراق پر منتقل کر دیا، اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے ﴿اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الجاثیۃ: ۲۹) یعنی "ہم (دنیا میں) تمہارے اعمال کو (فرشتوں سے) لکھواتے جاتے تھے"۔

اور کبھی تبدیل کرنے کے معنی میں آتا ہے، اور اسی معنی میں یہ فرمان الٰہی آیا ہے: ﴿واذا بدّلنا اٰیۃً مکانَ اٰیۃٍ﴾ یعنی "اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں"۔

نیز یہ تحویل کے معنی بھی دیتا ہے، اور اسی معنی میں یہ مقولہ ہے: "تناسخُ المواریث من واحدٍ الی واحدٍ" یعنی میراث کا ایک سے دوسری کی دوسری طرف تحویل ہونا۔

یہ کلام تو لغت کے اعتبار سے تھا، تاہم اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے "انتهاء الحکم وتبدیله بحکم آخر" یعنی "ایک حکم کو دوسرے حکم سے ختم اور تبدیل کرنا"۔

فقہاء اور اصولیین نے اس کی بہت سی تعریفات کی ہیں، ہم ان میں سے مختصر اور جامع تعریف کو اختیار کرتے ہیں، جسے علامہ ابن حاجب رحمہ اللہ نے بیان کیا ہے، نسخ کی تعریف میں وہ فرماتے ہیں: "اَلنَّسْخُ هُوَ رَفْعُ الْحُكْمِ الشَّرْعِيِّ بِدَلِيْلٍ مُتَأَخِّرٍ" یعنی "نسخ متاخر دلیل شرعی کے ذریعے حکم شرعی کو ختم کرنے کا نام ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قرآن پاک میں ارشاد ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۗ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرۃ: ۱۰۶)

ترجمہ: "جس آیت کو بھی ہم منسوخ کریں گے یا بھلائیں گے، اس سے بہتر یا اس جیسی آیت لے آئیں گے، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے"۔

آیتِ نسخ کا سببِ نزول: مروی ہے کہ یہود نے باہم ایک دوسرے سے کہا کہ کیا تمہیں محمد کے معاملہ سے تعجب نہیں ہوتا کہ وہ اپنے ساتھیوں کو ایک حکم دیتا ہے پھر اسی سے منع کر دیتا ہے اور اس کے خلاف حکم دیتا ہے، آج ایک بات کہتا ہے اور کل اس سے رجوع کر لیتا ہے؟!! لہٰذا یہ کلام محمد ہی کا کلام ہے، جسے یہ اپنی طرف سے گھڑتا ہے اور اس کا بعض حصہ دوسرے بعض کے مخالف ہے۔

چنانچہ ان کی حماقت وجہالت پر رد کے لیے اللہ عزّوجل کے اس ارشاد کے ساتھ آیتِ مبارکہ کا نزول ہوا:

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرۃ: ۱۰۶) ''نُنْسِهَا'' کا معنی ترجمان قرآن حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے جو بیان فرمایا ہے وہ یہ ہے: ''ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں اور تبدیل نہیں کرتے اور نہ ہی اسے منسوخ کرتے ہیں''۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ''نسیان'' بمعنی ترک سے ماخوذ ہے، یعنی ''ہم اسے تبدیل کیے بغیر چھوڑ دیتے ہیں''۔

کیا نسخ آسمانی شریعتوں میں ثابت ہے؟ نسخ شریعت اسلامیہ میں ازروئے عقل جائز، نقلاً وارد اور باعتبارِ وقوع مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے، برخلاف یہود کے کہ انہوں نے اس کے وقوع کا انکار کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ نسخ شریعتوں میں بالکل واقع نہیں ہوا، کیونکہ نسخ بے علمی پر دلالت کرتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ جہل سے پاک اور منزہ ہیں، اور ابو مسلم اصفہانی بھی اس قول میں یہود کے ہمنوا ہیں، وہ کہتے ہیں کہ کتاب اللہ میں نسخ نہیں ہوا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے متعلق فرمایا ہے: ﴿لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ﴾ (فصلت: ۴۲)

> ترجمہ: ''جس میں غیر واقعی بات نہ اس کے آگے کی طرف سے آسکتی ہے اور نہ اس کے پیچھے کی طرف سے، یہ خدائے حکیم محمود کی طرف سے نازل کیا گیا ہے''۔ پس اگر نسخ جائز ہو تو باطل کا اس میں دخول ماننا پڑے گا (جبکہ یہ بات درست نہیں ہے)۔

اور جمہور علماء نسخ کے جواز و وقوع پر اس بات سے استدلال کرتے ہیں کہ دلائلِ قطعیہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر قائم ہیں، اور ان کی نبوت اسی وقت صحیح شمار ہو سکتی ہیں جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے کی شریعتوں کو منسوخ مانا جائے، یہ تو دلیل عقلی ہے، اور رہا اس کا وقوع تو جمہور فرماتے ہیں کہ نسخ گزشتہ شریعتوں میں واقع ہوا ہے، نیز خود یہود کی شریعت میں بھی واقع ہے، کیونکہ تورات میں مذکور ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کو اپنے بیٹوں سے بیاہنے کا حکم

دیا، پھر یہ صورت بالاتفاق حرام قرار دے دی گئی۔

جمہور کے دلائل: جمہور علماء نے نسخ کے وقوع پر بہت زیادہ دلائل سے استدلال کیا ہے، ہم انہیں درج ذیل میں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل آیتِ مبارکہ میں نسخ کی صراحت کی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (البقرۃ:۱۰۶)

تو جمہور فرماتے ہیں کہ یہ آیت نسخ کے وقوع میں بالکل صریح اور واضح ہے۔

دوسری دلیل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل: ۱۰۱،۱۰۲)

ترجمہ: ''اور جب ہم کسی آیت کو بجائے دوسری آیت کے بدلتے ہیں، اور حالانکہ اللہ تعالیٰ جو حکم بھیجتا ہے اس کو وہی خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ افتراء کرنے والے ہیں، بلکہ انہیں میں اکثر لوگ جاہل ہیں، آپ فرما دیجیے کہ اس کو روح القدس آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں......''۔

جمہور فرماتے ہیں کہ مذکورہ بالا یہ آیت آیات واحکام کی تبدیلی میں پوری طرح ظاہر اور صریح ہے۔ اور تبدیلی ایک حکم کے رفع (اٹھائے جانے) اور دوسرے کے اثبات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور مرفوع (اٹھائی گئی) یا تلاوت ہوگی اور یا حکم، جیسے بھی ہو یہ تو رفع اور نسخ ہی ہے، اور اسی بات پر آیت مبارکہ دلالت کر رہی ہے۔

تیسری دلیل: قبلہ کا بیت المقدس سے بیت الحرام کی طرف منتقل ہونا یہ بالکل واضح معاملہ ہے، اس میں کوئی عقلمند اختلاف نہیں کرسکتا، چنانچہ مسلمان دعوتِ اسلامیہ کے ابتدائی دور میں اپنی نمازوں میں بیت المقدس کی طرف رخ کرتے رہے، پھر یہ حکم منسوخ ہوگیا اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ اور مسلمانوں کو مکہ مکرمہ میں موجود بیت اللہ کی طرف رخ کرنے کا حکم دیدیا گیا: ﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاۗءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىھَا﴾ (البقرۃ:۱۴۴)

ترجمہ: ''ہم آپ کے منہ کا (یہ) بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، اس لیے ہم آپ کو اسی قبلہ کی طرف متوجہ کردیں گے جس کے لیے آپ کی مرضی ہے، (لو) پھر اپنا چہرہ (نماز میں) مسجدِ حرام (کعبہ) کی طرف کیا کیجیے، اور تم لوگ جہاں کہیں بھی موجود ہو اپنے چہروں کو اسی (مسجد حرام) کی طرف کیا کرو''۔

اور اللہ تعالیٰ نے منافقین اور اہل کتاب کی اُس طعنہ زنی کی پیشگی خبر بھی دے دی جو کہ وہ عنقریب مسلمانوں کے بیت المقدس کی طرف رُخ چھوڑنے اور بیت الحرام کی طرف نماز پڑھنے کی وجہ سے قرآن اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں کریں گے، چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ﴿سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ...﴾ (البقرة: ۱۴۲)

ترجمہ: ''اب تو (یہ) بیوقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ اِن (مسلمانوں) کو اُن کے (سابق سمتِ) قبلہ سے (کہ بیت المقدس تھا) جس طرف پہلے متوجہ ہوا کرتے تھے کس (بات) نے بدل دیا، آپ فرما دیجیے کہ سب مشرق اور مغرب اللہ ہی کی ملک ہیں، جس کو خدا ہی چاہیں (یہ) سیدھا طریق بتلا دیتے ہیں''۔

چوتھی دلیل: اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں بیوہ عورت کو چار ماہ اور دس دن عدت گزارنے کا حکم فرمایا ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ (البقرة: ۲۳۴)

ترجمہ: ''اور جو لوگ تم میں وفات پا جاتے ہیں اور بیبیاں چھوڑ جاتے ہیں وہ بیبیاں اپنے آپ کو (نکاح وغیرہ سے) روکے رکھیں چار مہینے اور دس دن''۔

تحقیق اس آیت نے سابقہ حکم کو منسوخ کردیا اور وہ حکم اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی وجہ سے بیوہ عورت کو پورے سال عدت گزارنے کا تھا: ﴿وصيّةً لأزواجهم...﴾ (البقرة: ۲۴۰)

ترجمہ: ''وہ وصیت کر جایا کریں اپنی ان بیبیوں کے واسطے ایک سال تک منتفع ہونے کی''۔

اور یہ بات ہر مسلمان کے علم میں ہے کہ پورے سال وفات کی عدت گزارنے کا حکم چار ماہ اور دس دن کے حکم سے منسوخ ہو چکا ہے۔

اور اس طرح نسخ کے عالی شان شریعت اسلامیہ میں پائے جانے کی وجہ سے جمہور کی دلیل پوری آب وتاب کے ساتھ تپتی دوپہر کے سورج کی طرح روشن اور واضح ہو جاتی ہے،

جبکہ منکرینِ نسخ کے قول کا کوئی اعتبار نہیں رہتا؛ کیونکہ وہ واضح اور نصوصِ صحیحہ کے مخالف ومعارض ہے۔

امام قرطبی رحمہ اللہ کا اپنی تفسیر جامع الاحکام میں ارشادِ گرامی: علامہ قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر میں نسخ کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''اس باب (نسخ) کی معرفت بے حد ضروری ہے، اور اس کا بہت بڑا فائدہ ہے، اس کی معرفت سے نہ تو علماء بے نیاز اور مستغنی ہیں اور نہ ہی کند ذہن جاہل لوگوں کے علاوہ اس کا کوئی منکر ہے، کیونکہ پیش آمدہ مسائل کے شرعی احکام اور ان کی حلت وحرمت کی معرفت اسی پر مرتب ہوتی ہے، متأخرین میں سے ایک نام نہاد اسلامی گروہ اس کے جواز کا منکر ہے، جبکہ شریعت میں نسخ کے وقوع پر سلَفِ صالحین کے اجماع کی دلیل ان کے خلاف قائم ہے۔

پھر کچھ آگے چل کر آپ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علماء کے درمیان اس بات میں کوئی اختلاف نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں سے مقصود مخلوق کی دینی اور دنیوی مصلحتوں ہی ہیں، اور نسخ سے بداء (حکمت کے مخفی ہونے کے بعد اس کا آشکارا ہو جانے) کا اشکال تو تب لازم آئے گا جبکہ یہ احکام اسذات کی طرف سے ہوں جو اُمور کے انجام سے ناواقف ہو، البتہ انجام سے باخبر ذات کی باتوں میں تبدل وتغیر مصلحتوں کے تغیر کی بناء پر ہی ہوتا ہے، اس کی مثال اس طبیب ومعالج کی سی ہے جو مریض کے اَحوال کی رعایت رکھتا ہے، چنانچہ اللہ وحدہ لاشریک نے اپنی مخلوق کی مصلحتوں کی اپنی مشیت وارادہ سے رعایت رکھی، لہٰذا ان کے خطاب میں تو تبدیلی ہو سکتی ہے لیکن ان کا علم اور ارادہ متغیر نہیں ہو سکتا[1]، کیونکہ یہ اللہ کی بنسبت محال ہے۔

قرآن کریم میں نسخ کی اقسام: نسخ کی تین قسمیں ہیں:

۱- تلاوت وحکم دونوں منسوخ ہوں۔

۲- تلاوت منسوخ ہو، حکم باقی ہو۔

---

(۱) یعنی یہ تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایک حکم کو زمان ومکان کی رعایت کرتے ہوئے تبدیل فرما کر دوسرا حکم نازل فرما دیں، اور یہ بات پہلے سے علمِ الٰہی میں متعین ہوتی ہے، لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کا پہلے ایک ارادہ ہو پھر کسی حکمت کے آشکارہ ہونے پر وہ ارادہ تبدیل ہو جائے۔

۳۔ حکم منسوخ اور تلاوت باقی ہو۔

پہلی قسم: چنانچہ پہلی قسم (یعنی تلاوت وحکم کا منسوخ ہونا) کی تلاوت جائز ہے اور نہ ہی اس پر عمل کرنا روا ہے؛ کیونکہ وہ بالکلیہ منسوخ ہے، مثلاً دس بار دودھ پلانے سے حرمتِ رضاعت کے ثبوت کی آیت ہے، چنانچہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ وہ فرماتی ہیں: ''قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی تھی: ﴿عشرِ رَضَعَاتٍ مَعْلوماتٍ يُحَرِّمْنَ﴾ یعنی ''دس بار دودھ پینا جب کہ اس کے پینے کا کامل یقین ہو حرمت کو ثابت کر دیتا ہے''۔ پھر یہ حکم: ﴿خَمسُ رَضَعَاتٍ معلوماتٍ﴾ یعنی ''پانچ بار پینے کے ساتھ کہ جس کے پینے کا کامل یقین ہو'' منسوخ کر دیا گیا، اس کے بعد رسول کریم ﷺ اس دنیا سے تشریف لے گئے اور یہ آیت قرآن کریم میں تلاوت کی جاتی رہی''۔[1]

علامہ فخر الدین رازی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس آیت کا پہلا حصہ تو منسوخ الحکم والتلاوۃ دونوں ہے، جبکہ دوسرا حصہ یعنی ﴿خمس رضعات﴾ تلاوت کے اعتبار سے تو منسوخ ہے، البتہ باعتبارِ حکم کے شوافع کے ہاں باقی ہے''۔

دوسری قسم: اور دوسری قسم یعنی ''تلاوت میں منسوخ اور حکم میں باقی ہونا'' ہے، اور یہ جیسا کہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے: ''البرھان فی علوم القرآن'' میں ذکر کیا ہے کہ جب تمام امت اسے قبول کر لے تو اس پر عمل کیا جائے گا، جیسا کہ سورۂ نور میں رجم کے متعلق یہ آیت منقول ہے: ﴿الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا الْبَتَّةَ نَكَالاً مِّنَ اللهِ، وَاللهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ﴾ یعنی ''بوڑھا اور بوڑھی جب زنا کریں تو انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطور سزا کے ضرور سنگسار کرو، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہیں، حکمت والے ہیں''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ عمر نے کتاب اللہ میں زیادتی کر دی تو میں اس آیت کو اپنے ہاتھوں سے کتابُ اللہ میں لکھ لیتا''۔

ابن حبان رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: ''صحیح ابن حبان'' میں حضرت اُبی بن کعب

---

(۱) اس کا معنی یہ ہے کہ پانچ بار پینے کے ساتھ سابقہ حکم کا منسوخ ہونا تاخیر سے نازل ہوا، اسی لئے رسولِ کریم ﷺ کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد بھی بعض حضرات اسے پڑھتے رہے، کیونکہ نسخ کے زمانہ قریب ہی میں واقع ہونے کی وجہ سے ان تک یہ بات نہ پہنچی تھی۔ (از مصنف)

ﷺ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''سورۂ احزاب'' (طوالت میں) سورۂ نور کے برابر تھی، پھر اس سے کئی آیات منسوخ ہوگئیں''۔

اور یہ دونوں قسمیں (یعنی تلاوت وحکم دونوں منسوخ ہوں، اور تلاوت منسوخ ہو مگر حکم باقی ہو) قرآن میں بہت ہی کم ہیں، اور یہ شاذ ونادر ہی ہوگا کہ ہم قرآن میں ان اقسام کو پائیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی تلاوت اور اس کے احکام کی تنفیذ سے عبادت گزاری کریں۔

تیسری قسم: اور تیسری قسم ''حکم کا منسوخ اور تلاوت کا باقی ہونا'' ہے، اور یہ قرآن پاک میں پہلی دو قسموں سے بہت زیادہ ہے، جیسا کہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ یہ تریسٹھ سورتوں میں واقع ہے، اس نوع کی مثالوں میں سے ایک والدین کے لیے وصیت کے متعلق آیت ہے: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ (البقرة: ۱۸۰) جو آیتِ میراث: ﴿يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ﴾ (النساء: ۱۱) کے ذریعے منسوخ ہوگی، اور اسی طرح بیوہ عورت لے لئے پورے سال عدت گزارنے کی آیت ہے: ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ إِخْرَاجٍ﴾ (البقرة: ۲۴۰) جو چار ماہ دس دن عدت گزارنے کے متعلق آیت: ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ کے ذریعے منسوخ ہوگئی، اور آیتِ فدیہ: ﴿وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ﴾ یعنی روزے پر قدرت رکھنے والے شخص کے فدیہ دینے سے متعلق آیت کو وجوبِ صوم کی آیت: ''فمن شهد منكم الشهر فليصمه'' نے منسوخ کردیا، اور ایسے ہی حضور ﷺ سے سرگوشی سے پہلے صدقہ کا حکم اور مشرکین سے قتال کرنے کی ممانعت وغیرہ کی تمام آیات کو قرآن کریم میں دیگر ایسی آیات کے ذریعے منسوخ کردیا گیا جو از روئے حکم ودلالت بالکل واضح ہیں۔

علامہ ہبۃ اللہ بن سلامہ رحمہ اللہ نے ناسخ ومنسوخ کے متعلق ایک رسالہ تصنیف فرمایا

ہے جس میں مصنف نے یہ عبارت ذکر کی ہے:

''جان لو کہ شریعت میں سب سے پہلا نسخ نماز کے حکم سے متعلق تھا، پھر قبلہ کے بارے میں، پھر یوم عاشوراء (دس محرم) کے روزہ، پھر مشرکین سے اعراض، پھر ان سے جہاد، پھر مشرکین کو قتل کرنے، پھر اہلِ کتاب سے جزیہ نہ دینے تک جہاد کا حکم، پھر اہلِ معاہدہ کے درمیان میراثسے متعلق حکم، پھر مینارۂ جاہلیت کو توڑنے کا حکم دیا تاکہ مسلمان اپنے حج کے دوران غلط فہمی کا شکار نہ ہوں، وغیرہ وغیرہ''۔

حکم کو منسوخ کر کے تلاوت کو باقی رکھنے میں حکمت

اس قسم کی حکمت کو علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: ''البرہان فی علوم القرآن'' میں بیان کیا ہے، چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

''یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ حکم کو منسوخ کر کے تلاوت کو باقی رکھنے میں کیا حکمت ہے؟

اس کے دو جواب دیئے جاسکتے ہیں: پہلا جواب یہ ہے کہ قرآن کو جیسا کہ اس لیے پڑھا جاتا ہے کہ اس کا حکم کا معلوم ہو جائے اور اس پر عمل کیا جائے تو اسی طرح اس کو اس وجہ سے بھی پڑھا جاتا ہے کہ وہ اللہ عزوجل کا کلام ہے تو اس کی تلاوت پر ثواب ہوگا، لہٰذا تلاوت کو اسی حکمت کی بناء پر باقی رکھا گیا۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ نسخ بسا اوقات تخفیف کے لیے ہوتا ہے، چنانچہ تلاوت کو نعمت اور دور کی جانے والی مشقت کی یاد دہانی کروانے کے لیے باقی رکھا گیا، تاکہ اللہ نے صاحبِ ایمان پر دین کو آسان کر کے جو نعمت کی ہے اسے اس نعمت کا استحضار رہے۔

آیا قرآن کو احادیثِ مبارکہ سے منسوخ کیا جاسکتا ہے؟ تمام علماء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآن، قرآن کے لیے اور حدیثِ نبوی، حدیث کے لیے ناسخ ہوسکتی ہے [1] اسی طرح خبرِ متواتر اپنی مثل سے منسوخ ہوسکتی ہے، مگر ایک مسئلہ میں ان کا اختلاف ہے، وہ یہ ہے کہ آیا قرآن سنت کے ذریعے اور خبرِ متواتر غیر متواتر کے ذریعے منسوخ ہوسکتی ہے یا نہیں؟

---

(۱) یعنی قرآن کی بعض آیتیں دوسری بعض آیتوں کے لیے، اور اسی طرح ایک حدیث دوسری حدیث کے لیے ناسخ ہوسکتی ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کے لیے ناسخ اس کے مثل قرآن ہونا ہی ضروری ہے، لہٰذا ان کے ہاں قرآن کا نسخ سنتِ نبویہ کے ذریعے جائز نہیں، کیونکہ سنت قرآن کے درجہ میں نہیں۔

جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ قرآن کا نسخ قرآن سے جائز ہے، اور سنت مطہرہ سے بھی، کیونکہ ان دونوں میں سے ہر ایک اللہ کا حکم اور اس کی جانب سے نازل کردہ ہے، اور سب کی سب اللہ عزوجل کی وحی ہی ہے: ﴿وماينطق عن الهوىٰ، ان هو الّاوحي يُوحىٰ﴾ ''اور نہ آپ ﷺ اپنی خواہشِ نفسانی سے باتیں بناتے ہیں، ان کا ارشاد نری وحی ہے جو ان پر بھیجی جاتی ہے''۔

اور جمہور کی ایک دلیل آیتِ وصیت کے حدیث سے منسوخ ہونے کے بارے میں یہ روایت بھی ہے: ''إِنَّ اللّٰهَ أَعْطىٰ كُلَّ ذِيْ حَقٍّ حَقَّه، أَلَا لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ'' ''یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر صاحبِ حق کو اس کے حق سے نوازا ہے، سن لو کہ وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں''۔

نیز زانی اگر محصن ہو تو اس آیتِ مبارکہ میں اس کی سزا سو کوڑے مقرر تھی: ﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ﴾ ''یعنی زنا کرانے والی عورت اور زنا کرنے والا مرد سو ان میں سے ہر ایک کے سو دُرّے مارو''۔ پھر دُرّوں کی یہ سزا سنگسار کرنے کے حکم سے منسوخ ہو گئی، چنانچہ رسولِ خدا ﷺ نے حضرت ماعز اور غامدیہ (رضی اللہ عنہما) کے رجم کا حکم دیا اور دونوں میں سے کسی ایک کو بھی کوڑے نہیں لگائے گئے، پس یہ قصہ اس بات پر دال ہے کہ حکم تو کوڑوں کی سزا تھی، پھر اسے سنتِ نبویہ کے ذریعے منسوخ کر دیا گیا، اور یہی قول زیادہ مشہور اور ظاہر ہے، واللہ اعلم۔

کیا اخبار میں نسخ کا وقوع ممکن ہے؟ جمہور علماء کا کہنا ہے کہ نسخ احکام یعنی اوامر و نواہی کے ساتھ خاص ہے، اور خبر نسخ کی متحمل نہیں، کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی خبر میں کذب بیانی ناممکن ہے، اور بعض علماء کا کہنا ہے کہ خبر جب حکمِ شرعی پر مشتمل ہو تو اس کا نسخ جائز ہے، جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا﴾ (النحل: ٦٧)

ترجمہ: ''اور کھجور اور انگوروں کے پھلوں سے تم لوگ نشہ کی چیز اور عمدہ کھانے کی

چیزیں بناتے ہو"۔

لہٰذا یہ اس شراب کی خبر ہے جو کھجور اور انگور سے نکالی جاتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ نے اسے حرمتِ شراب کی اس آیت سے منسوخ کر دیا ہے: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (المائدة: ۹۰)

ترجمہ: "بات یہی ہے کہ شراب، جوا اور بت وغیرہ اور قرعہ کے تیر یہ سب گندی باتیں (اور) شیطانی کام ہیں، سو ان سے بالکل الگ رہو، تا کہ تم کو فلاح ہو"۔

امام المفسرین علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر "جامع البیان" میں بیان فرماتے ہیں: "مَانَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا" مطلب یہ ہے کہ جس آیت کے حکم کو بھی ہم دوسرے حکم کی طرف منتقل کریں گے تو ہم اس میں تبدیلی اور تغیر لے آئیں گے، اور وہ یہ ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال، مباح کو ممنوع اور ممنوع کو مباح کر دیا جائے۔

پھر آگے جا کر فرمایا کہ یہ نسخ صرف امر و نہی، حرمت و حلت، اور منع و جواز میں ہی روا ہے، اور جہاں تک اخبار کا تعلق ہے تو اس میں نہ ناسخ ہو سکتا ہے اور نہ ہی منسوخ"۔

یہ شریعتِ اسلامیہ اور قرآن و سنت میں نسخ کے متعلق اچٹتی نگاہ اور طائرانہ تبصرہ تھا، طالب علم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس بحث کا مطالعہ کرے اور بذریعۂ ناسخ و منسوخ ایسے لطیف اسلوب پر احکام سازی اور آیتوں کے اتارنے میں حکمتِ الٰہیہ کو جان لے کہ جس نے لوگوں کی مصلحتوں کو برقرار رکھا اور تغیراتِ زمانہ کے دوش بدوش چلا۔ اسی بات کو ہم نے اس ماحضر تحریر میں اختصار کے ساتھ ذکر کیا ہے: ﴿والله يقولُ الحقّ وهو يهدى السبيل﴾ "اور اللہ تعالیٰ حق بات فرماتا ہے اور وہی سیدھا رستہ بتلاتا ہے"۔

☆☆......☆☆

چھٹی فصل

جمعِ قرآن

عہدِ نبوی میں جمعِ قرآن: قرآن کریم کو دو عہدوں میں جمع کیا گیا: ۱-عہد نبوی، ۲-عہد خلفائے راشدین۔

ہر ایک کے جمع کی اپنی خصوصیات اور خوبیاں ہیں، لفظِ جمع کو ذکر کر کے کبھی تو حفظ اور لوگوں کے سینوں میں محفوظ کرنا مراد لیا جاتا ہے اور کبھی اس کو بول کر صحیفوں اور اوراق میں تحریر اور محفوظ کرنا مراد ہوتا ہے۔

عصرِ نبوت میں جمع قرآن کے لیے یہ دونوں صورتیں ساتھ ساتھ ہوئیں:

۱-حفظ اور بن دیکھے یاد کرنے کے اعتبار سے سینوں میں جمع کرنا۔

۲-تحریر اور لکھائی کے طور پر سطور میں جمع کرنا۔

اب ہم دونوں جمعوں کے متعلق قدرے تفصیل سے بحث کریں گے (انشاء اللہ تعالیٰ) تاکہ ہمارے سامنے قرآن پاک، اس کی کتابت اور تدوین کے ساتھ کیا گیا عظیم الشان اہتمام آشکارا ہو جائے کہ اللہ کی بزرگ و برتر کتاب اور محمد ﷺ کے ابدی معجزہ قرآن کریم نے جو رعایت، توجہ اور اہتمام کا حصہ پایا ہے، اس پہلے کسی بھی آسمانی کتاب نے نہیں پایا۔

سینوں میں جمعِ قرآن: قرآن پاک اُمی (ناخواندہ) نبی پر نازل ہوا، اس لئے ان کی پوری توجہ اس کے حفظ اور یاد کرنے کی طرف مرکوز رہتی کہ جسطرح قرآن کا نزول ہوا ہے، اسے اسی صورت میں یاد کر لیا جائے، اور پھر اسے لوگوں کو ٹھہر ٹھہر کر سنائیں تاکہ وہ بھی اسے یاد کر کے اپنے سینوں میں محفوظ کر لیں، کیونکہ وہ امی نبی تھے اللہ نے انہیں ان پڑھ اور جاہل عربوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا:

ترجمہ: ''وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک پیغمبر بھیجا جو

ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور دانشمندی سکھاتے ہیں"۔ (الجمعۃ: ۲)

اور ناخواندہ شخص کی عام طور پر یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ اپنے حافظہ اور یادداشت پر اعتماد کرتا ہے کیونکہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتا، اور عرب قوم نزولِ قرآن کے دور میں کامل عربیت کی خصوصیات سے بہرہ ور تھی، ان خصوصیات میں سے قوتِ حافظہ، تیز یادداشت اور ذہنوں کا انشراح بھی تھا اور ان میں سے ہر شخص کو لاکھوں اشعار ازبر ہوتے، حسب ونسب سے واقف ہوتا اور حسب ونسب کو پورا زبانی پڑھ کر سنا دیتا، اور اپنی پوری تاریخ پر بھی علم رکھتا، اور آپ ان میں بہت کم ہی ایسے آدمی پاؤ گے جو آپ کے سامنے حسب ونسب بیان نہ کر سکیں یا انہیں معلقاتِ عشر (دس مشہور شعراء کے شہرۂ آفاق اشعار کا مجموعہ) اشعار کی کثرت اور حفظ کے مشکل ہونے کے باوجود ازبر نہ ہوں، پھر ان کے پاس قرآن پاک آیا تو اس نے انہیں اپنے زورِ بیان، شوکتِ احکام اور عظمتِ دلیل سے مبہوت وحیران کر دیا، ان کے جذبات واحساسات پر غالب آ گیا، اور ان کی عقول اور افکار کو گرفت میں لے لیا، اور بالآخر ان کی ہمتوں کو بزرگ وبرتر کتاب کی طرف پھیر دیا، انہوں نے بھی اپنا رخِ توجہ اس کتاب کی طرف موڑ دیا، اسے حفظ کرتے اور اس کی آیتوں اور سورتوں کو زبانی پڑھتے، جبکہ اشعار کو پسِ پشت ڈال دیا، کیونکہ انہوں نے قرآن میں زندگی کی روح کو پا لیا تھا۔

اور ادھر نبی اکرم ﷺ کے حفظِ قرآن کی شدید حرص کا یہ عالم تھا کہ آپ ﷺ راتوں کو نمازوں میں آیاتِ قرآنیہ کی تلاوت، عبادت، قراءت اور قرآن کے معانی میں غور وفکر کر کے شب بیداری فرماتے یہاں تک کہ اللہ رب العزت کے درج ذیل حکم کی بجا آوری میں آپ ﷺ کے دونوں قدم مبارک کثرتِ قیام کی وجہ سے ورم زدہ ہو کر پھٹنے لگے:

﴿يَاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا﴾ (المزمل: ۱۔۴)

ترجمہ: "اے کپڑوں میں لپٹنے والے رات کو کھڑے رہا کرو، مگر تھوڑی سی رات یعنی نصف رات یا اس نصف سے کسی قدر کم کر دو"۔

اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آپ ﷺ سید الحفاظ، قرآن کریم کو سینۂ اطہر

میں جمع کرنے والے اور قرآن کے متعلق پیش آنے والے ہر معاملہ میں مسلمانوں کے مرجع اور ماخذ ہوں۔

اور رہے صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین تو قرآن کی تلاوت اور مطالعہ کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے، اپنی تمام تر کوششیں اس کے حفظ اور یاد کرنے میں صرف کرتے، اور گھروں میں اپنی بیویوں اور بچوں کو اس کی تعلیم دیتے، یہاں تک کہ اگر کوئی شخص صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کے گھروں کے قریب سے رات کی تاریکی میں گزرتا تو اسے گھروں سے شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح تلاوت قرآن کی آواز سنائی دیتی آپ ﷺ کا گزر بھی اگر بعض انصار کے گھروں سے ہوتا تو آپ وہاں شب کی اندھیری میں قرآن سننے کے لیے کچھ دیر کے لیے ٹھہر جاتے۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ان سے ارشاد فرمایا: ''اگر تم مجھے گزشتہ رات دیکھ لیتے جبکہ میں تمہاری تلاوت سن رہا تھا؟ تم کو تو نغمہائے داؤدی میں سے ایک بہترین نغمہ عطا کیا گیا ہے''۔

اور مسلم کی روایت میں یہ زیادتی بھی ہے یہ سن کر میں نے کہا: یارسول اللہ! اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ آپ میری تلاوت سن رہے ہیں تو بخدا! میں اسے مزید خوشنما بنا کر پڑھتا اور آنحضرت ﷺ سے یہ روایت بھی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اشعریوں کی جماعت جب رات میں داخل ہوتی ہے تو میں ان کے قرآن پڑھنے کی آوازوں کو جانتا ہوں اور رات کے وقت ان کے قرآن پڑھنے کی آوازوں کے ذریعے میں ان کے گھروں کو جان لیتا ہوں، اگرچہ دن میں ان کے گھر میں نے نہیں دیکھے ہوتے''۔

بہت سارے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حفظِ قرآن میں شہرت پائی اور نبی ﷺ حفظِ قرآن کے ساتھ اہتمام و توجہ کے جذبات کو ان میں برانگیختہ کرتے اور معلمین اور قراء حضرات کو شہروں اور بستیوں کی طرف بھیجتے تاکہ وہ انہیں قرآن پڑھائیں اور اس کی تعیم دیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے ہجرت سے پہلے مصعب بن عمیر اور عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کو اہلِ مدینہ کی طرف بھیجا تاکہ وہ انہیں اسلام کی تعلیم دیں اور قرآن پاک پڑھائیں، اسی طرح معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو ہجرت کے بعد مکہ کی طرف اہلِ مکہ کی تحفیظ و تعلیم کی خاطر بھیجا۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: جب کوئی شخص ہجرت کر کے آتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے ہم میں سے (انصار میں سے) کسی کے سپرد کر دیتے تاکہ وہ اسے قرآن کی تعلیم دے اور مسجد نبوی (علی صاحبہا اُلف تحیۃٍ وسلامٍ) میں تلاوتِ قرآن کی وجہ سے ایک شور سا سنائی دیتا، اسی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ اپنی آوازوں کو پست رکھیں تاکہ مغالطہ میں نہ پڑیں (اور ایک دوسرے کو تکلیف نہ ہو) اور یہی وجہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حفاظِ قرآن کی تعداد شمار سے باہر تھی، اور ہمارے لیے یہ جاننا کافی ہوگا کہ معرکۂ یمامہ میں شہید ہونے والے حفاظ کی تعداد ۷۰ سے متجاوز تھی، اسی طرح عہد نبوی میں بیر معونہ کی لڑائی میں اسی قدر تعداد، حفاظ کی شہید ہوئی۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''ستر حفاظ جنگ یمامہ میں شہید ہوئے اور دورِ نبوی میں معرکۂ بیر معونہ میں بھی اسی قدر حفاظ کی شہادت ہوئی''۔ (یعنی صرف ان دو لڑائیوں میں ایک سو چالیس حفاظ شہید ہوئے، حاشیہ میں)

امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک بے مثال خصوصیت یہ بھی ہے کہ یہ مقدس کتاب ان کے سینوں میں محفوظ ہے اور اسکو آگے منتقل کرنے میں وہ دلوں اور سینوں میں محفوظ کلام پر اعتماد کرتی ہے نہ کہ صرف صحیفوں اور سطور میں لکھی گئی تحریر پر، برخلاف اہل کتاب کے ہمیں ان میں کوئی بھی تورات و انجیل کا حافظ نظر نہیں آتا، وہ لوگ ان کی حفاظت میں لکھی گئی کتابوں پر اعتماد کرتے ہیں، اور انہیں بن دیکھے پڑھنے کے بجائے صرف ناظرہ ہی پڑھتے ہیں، اسی بنا پر ان کتب میں تحریف اور تبدیلی نے راہ پائی ہے، البتہ قرآن پاک کی اللہ نے اپنی تکوینی تدبیر کے ذریعے حفاظت فرمائی اور اسے حفظ کرنے کے لیے آسان کر دیا: ﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر: ۱۷)

ترجمہ: ''اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟''۔

اور اسے سطور اور سینوں میں محفوظ فرما کر ہر قسم کی تحریف و تبدیلی سے محفوظ کر دیا، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اس کی واضح دلیل ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

ترجمہ: ''ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں''۔

اور بلاشبہ یہ اللہ کی جانب سے اس قرآن کے ساتھ خصوصی عنایت اور وہ عظیم اعزاز ہے جس کے لیے اللہ نے اس امت محمدیہ ﷺ کو منتخب اور خاص کیا ہے اور ان کے صحیفوں کو ان کے سینوں میں محفوظ کر کے رکھ دیا اور ان پر ایسی کتاب کو نازل کیا جسے پانی نہیں دھوسکتا (یعنی صرف اوراق پر اس کا دارومدار نہیں بلکہ اس امت کے سینے اس کے لیے محفوظ قلعے ہیں) اور شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اِنَّ دِيْنَ مُحمدٍ وَكِتَابُهُ أَقْوىٰ وَأَقْوَمَ قِيْلَا
لَاتَذْكُرِ الْكُتُبَ السَّوَالِفَ عِنْدَهُ طَلَعَ الصَّبَاحُ فَأَطْفِىءِ الْقِنْدِيْلَا

ترجمہ: ''اللہ اکبر! بلاشبہ محمد ﷺ کا دین اور اس کی کتاب قوی تر اور بالکل راست کلام ہے اس کے ہوتے ہوئے سابقہ کتابوں کا ذکر نہ کرو اس لئے کہ جب سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا ہے تو چراغوں کو بجھادو''۔

سطور میں جمع قرآن: قرآن پاک کی دوسری امتیازی خصوصیت مصاحف میں اس کی تدوین و کتابت ہے، رسول اللہ ﷺ کے پاس چند حضرات وحی کو لکھنے کے لیے مقرر تھے، جب بھی قرآن کا کوئی جزء نازل ہوتا تو آپ ﷺ اس کے قلمبند کرنے کا حکم فرماتے، اور اس کی وجہ اس کی حفاظت و کتابت میں انتہائی درجہ کا اہتمام، اس کے ضبط و اعتماد میں زیادتی اور کتاب اللہ کے بارے میں زبردست احتیاط تھی، تاکہ کتابت حفظ کی اور سینے میں محفوظ ودیعتِ الٰہی (یعنی حافظہ) تحریری مکتوب کی معاون ومددگار ہو، اور یہ کاتبینِ وحی چنیدہ اور جلیل القدر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت تھی، نبی کریم ﷺ نے انہیں ماہر اور اہلِ کمال حضرات کے درمیان میں سے منتخب کیا تھا، تاکہ وہ اس مہتم بالشان کام کی ذمہ داری سنبھالیں، حضرت زید بن ثابت، حضرت اُبی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت معاویہ بن اَبی سفیان، حضراتِ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم وغیرہ جیسے صحابۂ کرام مشہور کاتبینِ وحی میں سے ہیں۔ (۱)

---

(۱) کم و بیش ۴۰ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کتابت وحی کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔ حضرت خالد بن سعید ابی العاص رضی اللہ عنہ پہلے وہ خوش نصیب صحابی ہیں جنہوں نے سب سے پہلے بسم اللہ لکھ کر کتابتِ وحی کی سعادت حاصل فرمائی۔ مکہ معظمہ میں جس قدر کتابت وحی ہوئی وہ قیراموزی خط میں ہوئی، پھر ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں =

شیخین رحمہا اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: عہدِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم میں چار اشخاص نے قرآن کریم جمع کیا جو سب کے سب انصاری تھے: حضرت ابی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابوزید رضی اللہ عنہم۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ابوزید کون ہیں؟ تو آپؓ نے فرمایا وہ میرے ایک چچا ہیں، اور یہ مذکورۃ الصدر حضرات مشہور و معروف کاتبینِ وحی میں سے ہیں، ورنہ یہاں تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت ہے جو قرآن کو لکھا کرتی تھی، پھر ان میں بہت سے ایسے بھی ہیں جن کے پاس اپنا ایک خاص مصحف ہوتا تھا جس میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہر سنا اور یاد کیا ہوا لکھ رکھا تھا، جیسا کہ حضرت ابن مسعود، حضرت علی اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہم وغیرہ کے مصاحف تھے۔

تحریر کا طریقۂ کار: تحریر کا طریقہ یہ تھا کہ صحابہ کرامؓ قرآن کریم کو کھجور کی تراشیدہ شاخوں، سفید باریک چوڑے پتھروں، (کاغذ، چمڑے وغیرہ کے) ٹکڑوں اور شانے کی ہڈیوں وغیرہ پر لکھتے، اور ایسا اس لئے کرتے تھے کہ کاغذوں کی صناعت کا عربوں کے ہاں رواج نہ تھا، البتہ بعض دوسری قوموں جیسے ایرانیوں اور رومیوں کے ہاں اس کا رواج تھا، لیکن وہ بھی فروتر تھا عام اور زیادہ نہیں تھا، اس لئے ان عرب حضرات کو جو لکھنے کے قابل چیز آسانی سے مہیا ہو جاتی تھی اسی پر لکھ لیتے تھے، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ''ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں قرآن کو ٹکڑوں پر جمع کیا کرتے تھے''۔

اور یہ تالیف و تدوین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اور اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کے مطابق آیتوں کی ترتیب سے عبارت تھی، اسی لئے تمام علماء کا اجماع ہے کہ جمع قرآن توفیقی ہے یعنی قرآن کی ترتیب اس موجودہ طرز پر جس پر اسے آج ہم مصاحف میں دیکھ رہے ہیں یہ

= خط حیری میں لکھا جاتا رہا، پھر تیسری بار ۱۶۰ھ میں خط کوفی میں لکھا گیا، چوتھی بار ۳۱۸ھ میں خط نسخ (جسے خط عربی بھی کہتے ہیں) میں لکھا گیا، اور اب بعض نے نسخ پر ہی اجماع امت بتایا ہے، اور یہی زیادہ حسین و جمیل اور خوبصورت خط ہے ابن مقلہ نے اسے ایجاد کیا اور اس کا نام خط بدیع رکھا تھا، لیکن کتابت قرآن مجید کے لئے خاص ہونے کی وجہ سے خطِ نسخ سے مشہور ہو گیا۔ رہے باقی خطوط (رقعہ، دیوانی، فارسی، سیاقت، شکستہ، خطِ گلزار، خطِ غبار وغیر ھذہ) سو ان میں قرآن کی لکھائی مستحسن و پسندیدہ نہیں، بلکہ سیاقت و شکستہ میں تو حرام ہے۔ (مفاتیح بتغییر)

اللہ کی وحی اور حکم کے مطابق ہے، روایت میں آتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی ایک یا زیادہ آیتیں لے کر اترتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے: ''اے محمد! اللہ آپ کو حکم دیتے ہیں کہ اسے فلاں سورت میں فلاں جگہ پر رکھ دو''۔ اور اسی طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرماتے کہ: ''اسے فلاں مقام میں رکھ دو''۔

عہدِ صدیقی میں جمعِ قرآن: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پیغامِ خداوندی ادا کرنے، امانت کو پہنچانے، امت کی خیر خواہی فرمانے اور لوگوں کی اللہ کے مستحکم و مضبوط دین کی طرف رہنمائی کرنے کے بعد اللہ کے جوارِ رحمت کی طرف رحلت فرما گئے، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالی، انہیں اپنے دور خلافت میں بڑے خطرات، شدید مصائب اور نہایت کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، ان مصائب میں سے ایک انتداد کی جنگ بھی ہے جو مسلمانوں اور مسیلمہ کذاب کے چیلوں کے درمیان لڑی گئی، معرکۂ یمامہ انتہائی گرم معرکہ تھا، جس میں بہت زیادہ حفاظ اور قراء صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین شہید ہوئے، جن میں کبار حفاظِ کرام کی تعداد ستر سے متجاوز تھی۔

یہ واقعہ مسلمانوں پر بہت گراں گزرا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر بھی یہ معاملہ شاق ہوا تو وہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو انہیں غم واندوہ کی حالت میں پایا، آپؓ نے انہیں قرآن کے جمع کرنے کا مشورہ دیا تاکہ وہ حفاظِ کرام کی موت کی وجہ سے کہیں ضائع نہ ہو جائے! پہلے پہل تو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اس تجویز پر عمل درآمد کرانے میں متردد رہے، لیکن جب ان کے سامنے جمعِ قرآن کی مصلحت آشکارا ہوگئی تو انہوں نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشورہ کو لے لیا جائے، اور اللہ نے اس بلند کام کی انجام دہی کے لیے ان کا شرحِ صدر فرما دیا، پھر آپؓ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلوا کر یہ معاملہ ان کے سامنے رکھا، اور گزارش کی کہ وہ قرآن کو ایک مصحف میں جمع کرنے کی ذمہ داری اپنے سر لیں، لیکن حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی شروع میں کچھ تردد ہوا، پھر اللہ نے اس کام کے لیے حضرت زید رضی اللہ عنہ کا بھی شرحِ صدر فرما دیا جس کے لیے حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کا سینہ کھول دیا تھا۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے اس قصہ کو اپنی کتاب صحیح بخاری میں ذکر کیا ہے، ہم اسے اس

کی اہمیت کے پیشِ نظر انہی الفاظ کے ساتھ نقل کرتے ہیں: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اہل یمامہ کی شہادت (یعنی جنگِ یمامہ میں ستر حفاظ کرام کی شہادت) کے بعد مجھے بلاوا بھیجا، میں آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: کہ عمر نے آکر مجھے یہ بات کہی ہے کہ جنگِ یمامہ میں قراءِ قرآن کی ایک بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی ہے، اگر ہر معرکہ میں قرآنِ کریم کے حفاظ اسی طرح شہید ہوتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک بڑا حصہ چلا نہ جائے، لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ جمعِ قرآن کا حکم دے دیں، میں نے ان سے کہا کہ وہ کام میں کیسے کرسکتا ہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ خدا کی قسم یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اور وہ مجھ سے بار بار یہی کہتے رہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرا شرح صدر بھی اس کام کے لیے فرما دیا جس کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سینہ کو وا کر دیا تھا اور اب میری رائے بھی اس میں وہی ہوگئی ہے جو عمر رضی اللہ عنہ کی رائے ہے، حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا: تم ایک نوجوان عقلمند آدمی ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی بھی نہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے وحی بھی لکھتے رہے ہو، لہٰذا قرآن کریم کو تلاش کر کے اسے جمع کر دو، حضرت زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: بخدا! اگر یہ حضرات مجھے کسی پہاڑ کے ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا جتنا کہ یہ جمع قرآن کا حکم ہوا، میں نے ان سے کہا: کہ آپ دونوں وہ کام کیسے کر رہے ہیں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا؟! اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: خدا کی قسم یہ کام بہتر ہی بہتر ہے، اس کے بعد وہ برابر مجھے اس پر آمادہ کرتے رہے، یہاں تک اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لیے میرا سینہ بھی کھول دیا جس کے لیے حضرت ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کا شرحِ صدر فرمایا تھا۔

چنانچہ میں نے قرآنی آیات کو تلاش کرنا شروع کر دیا، اور سفید باریک پتھروں، کھجور کی تراشیدہ شاخوں اور لوگوں کے سینوں سے انہیں جمع کرنے لگا، یہاں تک کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیات: ﴿لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ﴾ سے لے کر ﴿وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴾ تک، یعنی آخرِ سورت تک کو صرف حضرت ابوخزیمہ

انصاری رضی اللہ عنہ کے پاس پایا، کسی دوسرے کے پاس وہ مجھے نہ ملیں، چنانچہ یہ مکتوبہ صحیفے حضرت ابو بکر صدیق کی وفات تک ان کے پاس ہی رہے، پھر اس کے بعد وہ حضرت عمر کے پاس رہے یہاں تک کہ ان کا بھی انتقال ہو گیا، اس کے بعد وہ حضرت حفصہ بنت عمر کے ہاں موجود ہے، رضی اللہ عنہم اجمعین"۔ پس یہ روایت جمع قرآن کے سبب پر صراحۃً دلالت کر رہی ہے۔

جمع قرآن کے بارے میں چند سوالات: اس مقام پر چند سوالات وارد ہوتے ہیں جن کا جواب قدرے تفصیل سے دینا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہم درج ذیل میں اس کا خلاصہ ذکر کرتے ہیں:

سوال اوّل: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جمعِ قرآن کے سلسلہ میں ابتداء میں تردد کیوں ہوا، باوجود یکہ وہ ایک عمدہ کام اور ایسا مسئلہ تھا جسے اسلام ضروری قرار دیتا ہے؟

جواب: حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ (اگر قرآن جمع کیا گیا تو) لوگ قرآن کے حفظ اور زبانی یاد کرنے میں تساہل برتیں گے، اور صحیفوں میں موجود ہونے پر اعتماد کر بیٹھیں گے، تو ان کیقلوب حفظِ قرآن سے عاجز آ جائیں گے، اور ان کی رغبتیں اس کے حفظ اور زبانی یاد کرنے میں ماند پڑ جائیں گی، کیونکہ وہ قرآن کیمصاحفِ مطبوعہ میں موجود و مرقوم ہونے پر اعتماد کرتے ہوئے سمجھیں گے کہ قرآن کی تلاوت کرنا ان کے لیے ان مصاحف کے ذریعے ممکن ہے جبکہ مصاحف میں موجود ہونے سے قبل تمام لوگ اپنی کوششوں کو قرآن کے حفظ کرنے میں صرف کرتے تھے، یہ تو ایک پہلو سے تھا۔

اور دوسرا پہلو یہ تھا کہ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حدودِ شرع کے بارے میں بہت زیادہ محتاط اور توقف کرنے والے اور ہر کام میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے متلاشی اور اس پر چلنے والے شخص تھے، اس لیے انہیں خوف لاحق ہوا کہ کہیں وہ اس عمل سے کوئی ایسی نئی چیز ایجاد کرنے والے نہ ہو جائیں جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں ناپسندیدہ ہو، اسی بنا پر انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں وہ کام کیسے کر سکتا ہوں جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ کیا ہو؟ اور شاید کہ اس بات سے ڈر رہے تھے کہ یہ ایجاد و اختراع انہیں مخالفت اور بدعت میں مبتلا نہ کر دے، لیکن جب انہیں معاملہ کی اہمیت کا ادراک ہوا، اور وہ سمجھ گئے کہ یہ نئی تجویز فی نفسہ قرآن پاک کے یاد کرنے اور اسے ضیاع اور تحریف سے بچانے کا ایک عظیم سبب

ہے، اورانہیں یقین ہوگیا کہ یہ کوئی اسلام سے خارج کام نہیں اور نہ ہی کوئی نئی بدعت ہے، تو ان کا ارادہ جمعِ قرآن کے متعلق پختہ ہوگیا، اور پھر حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بھی اس کا برابر قائل کرتے رہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کا بھی شرحِ صدر بھی فرما دیا، اورر انہوں نے اس مہتم بالشان کام کی ذمہ داری اٹھالی۔ واللہ اعلم۔

سوالِ دوم: اس عظیم کام کے لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ہی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعینکے درمیان سے کیوں منتخب کیا؟

جواب: حضرت زید رضی اللہ عنہ میں وہ بہترین صلاحیتیں بدرجۂ اُتم موجود تھیں، جوانہیں جمعِ قرآن کا اہل قرار دیتی تھیں، جبکہ دوسرے کسی میں وہ اس طرح یکجا طور پر نہیں پائی جاتی تھیں، کیونکہ آپؓ حافظِ قرآن تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخصوص کاتبینِ وحی میں سے تھے، نیز انہوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری لمحوں میں قرآن کے عرضۂ اُخیرہ کا بھی مشاہدہ کیا، ان سب سے بڑھ کر وہ انتہائی متقی، بڑے امانت دار، کمالِ اخلاق سے متصف، دین پر ثابت قدمی کی دولت سے مالا مال اور کمالِ ذکاوت ومہارت میں معروف شخص تھے۔ اور انہیاوصاف کی طرف بخاری کی حدیث میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے کلام میں اشارہ کیا گیا ہے کہ جب انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو بلایا اور اسے کہا کہ: ''بے شک تم ایک عقلمند نوجوان ہو، ہمیں تمہارے بارے میں کوئی بدگمانی بھی نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے وحی بھی لکھتے رہے ہو''۔

پس انہیں عمدہ خصوصیات اور خوبیوں کی بنا پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں جمعِ قرآن کے لیے منتخب کیا، اور ان کی شدتِ ورع وتقویٰ پر ان کا یہ قول دلالت کرتا ہے: ''بخدا! اگر مجھے کسی پہاڑ کے ڈھونے کا حکم دیتے تو مجھ پر اتنا گراں نہ ہوتا جتنا کہ جمعِ قرآن کا حکم ہوا''۔

سوالِ سوم: بخاری کی روایت میں حضرت زید رضی اللہ عنہ کے اس قول کا مطلب کیا ہے: ''یہاں تک کہ میں نے سورۂ توبہ کی آخری آیات کو صرف ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ کے پاس پایا، کسی دوسرے کے پاس مجھے وہ نہیں ملیں''۔

جواب: حضرت زید رضی اللہ عنہ نے ان آیتوں کو ابوخزیمہ انصاری رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی

دوسرے صحابی کے پاس لکھا ہوا نہیں پایا، یہ معنی نہیں کہ وہ کسی کو یاد نہیں تھیں، کیونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو بذاتِ خود یہ آیتیں یاد تھیں، اور اسی طرح بہت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی یہ آیتیں یاد تھیں، لیکن حضرت زید رضی اللہ عنہ نے اعتماد میں زیادتی اور احتیاط میں مبالغہ کی خاطر حفظ وتحریر دونوں کو جمع کرنے کا ارادہ فرمایا، جیسا کہ ہم ان شاء اللہ اسے بیان کریں گے، بہر حال اس مثالی نہج پر جمع قرآن کا کام تکمیل پذیر ہوا۔

جمعِ قرآن کے متعلق عمدہ لائحہ عمل: حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جمعِ قرآن کے لیے ایسا عمدہ لائحہ عمل اپنایا جو انتہائی دقیق اور مستحکم تھا، اس میں اس مقدس کتاب کے مناسب حد درجہ چوکسی اور مکمل احتیاط کے ذریعہ اس کی حفاظت کی گارنٹی تھی، آپؓ نے صرف اپنے سینے میں محفوظ، اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے اور اپنے کانوں سے سنے ہوئے پر ہی اکتفاء نہیں کیا، بلکہ وہ مسلسل متلاشی رہے اور چھان بین کرتے رہے، اور اپنے نفس کو اس بات کا پابند بنایا کہ وہ جمعِ قرآن کے سلسلہ میں دو ماخذوں پر ہی اعتماد کریں گے:

ا- لوگوں کے سینوں میں محفوظ کلام۔

۲- رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے تحریر کردہ کلام۔

چنانچہ ضروری تھا کہ دونوں امر "حفظ اور تحریر" متحد اور جمع ہو جائیں اور ان کی اس بارے میں حرص اور احتیاط کی شدت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ وہ کسی بھی لکھی ہوئی چیز کو اس وقت تک قبول نہ کرتے جب تک کہ دو عادل گواہ اس کی گواہی نہ دے دیتے کہ اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اسے لکھا گیا ہے۔

اور اس پر وہ حدیث خوب دلالت کر رہی ہے جو امام ابو داؤد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "سننِ أبی داوٗد" میں ذکر کی ہے، فرماتے ہیں کہ "حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آکر کہا کہ جس نے بھی قرآن کا کوئی حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا ہو وہ اسے لے آئے، لوگ قرآنی آیات اوراق، تختیوں اور کھجور کی تراشیدہ شاخوں پر لکھا کرتے تھے، آپؓ اس وقت تک کسی کا لایا ہوا قبول نہ کرتے تھے جب تک کہ دو گواہ گواہی نہ دے دیں"۔

اور اسی طرح اس پر "سننِ أبی داوٗد" ہی کی دوسری روایت بھی دلالت کرتی ہے کہ: "حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر اور حضرت زید رضی اللہ عنہما سے فرمایا: "تم دونوں مسجد کے دروازہ

پر بیٹھ جاؤ، پھر جو شخص بھی کتاب اللہ کے کسی جزء پر تمہارے پاس دو گواہ لے کر آجائے تو اسے لکھ دو۔"

ابن حجر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: دو گواہوں سے مراد حفظ اور تحریر ہے۔

اور علامہ سخاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: مطلب یہ ہے کہ دو شخص یہ گواہی دیں کہ یہ مرقوم کلام رسول اللہ ﷺ کے سامنے لکھا گیا ہے۔

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرف سے حد درجہ کی احتیاط، باریک بینی اور استحکامیت تھی جسے انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے جمعِ قرآن کے سلسلہ میں معیار قرار دیا۔ رضی اللہ عنہم۔ (۱)

مصحفِ صدیقی کی خصوصیات: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک مصحف میں جمع کیے جانے والے مکتوبات کو کئی خصوصیات کی بناء پر نمایاں مقام حاصل ہے، جن میں سے اہم یہ ہیں:

۱۔ مکمل تلاش و جستجو اور حد درجہ کی احتیاط۔

۲۔ جن آیات کی تلاوت کا غیر منسوخ ہونا ثابت ہے صرف ان آیات کی کتابت۔

۳۔ اس پر اجماعِ امت اور اس میں مکتوب آیاتِ قرآنیہ کا تواتر سے منقول ہونے کا ثبوت۔

۴۔ نقل صحیح و ثابت سے منقول قراءاتِ سبعہ (۲) پر اس مصحف کا مشتمل ہونا۔

انہی خصوصیات نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعریف میں رطب اللسان بنا دیا کہ انہوں نے قرآن کریم کو ضائع ہونے سے محفوظ کر دیا اور یہ سب کچھ اللہ تبارک و تعالیٰ کی توفیق اور مدد سے ہی ہوا۔

حضرت علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ کا فرماتے ہیں: "لوگوں میں مصاحف کے

---

(۱) حضرت زید رضی اللہ عنہ کو یہ خصوصیت حاصل تھی کہ وہ مستقل طور پر کتابتِ وحی کی خدمت پر مامور رہے اور وصال سے قبل دو بار آپ ﷺ کو پورا قرآن بھی سنایا (مفاتیح)۔

(۲) قراءات سبعہ سے مراد احرف سبعہ (سات حروف) ہیں جو تمام متواتر قراءتوں کو شامل تھے، خواہ سات قراءتیں ہوں یا دس، کیونکہ یہ مصحف صرف قراءاتِ سبعہ پر مشتمل نہ تھا، بلکہ سب متواتر قراءتوں کا احاطہ کیے ہوا تھا، البتہ سات حروف پر مشتمل ضرور تھا۔

بارے میں سب سے زیادہ ثواب کے مستحق حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں، اللہ کی رحمت ہو ابوبکر پر، وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن کریم کو جمع کیا"۔

جمعِ قرآن کا یہ کام ایک ایسی عظیم دائمی منقبت کی صورت اختیار کر گیا جسے تاریخ ہمیشہ اشراف ونگرانی میں حضرت ابوبکر اور تنفیذ وعمل میں حضرت زید کو اچھے الفاظ اور عمدہ تعریف کے ساتھ ذکر کرتی رہے گی، رضوان اللہ عنہم اجمعین۔

قرآن کا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایک مصحف میں جمع کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ صحابۂ کرام رضوان اللہ عنہم اجمعین کے پاس پہلے ایسے مصاحف نہ تھے جن میں انہوں نے قرآن لکھ رکھا ہو، کیونکہ جمع قرآن اس بات کے منافی نہیں کہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم کے پاس اپنا کوئی خاص مصحف ہو، البتہ زبردست تحقیق وجستجو، غیر منسوخ التلاوۃ آیتوں پر انحصار، حدِّ تواتر تک رسائی، اجماعِ امت اور سات حرفوں یعنی قراءاتِ سبعہ کو شامل ہونے کی جو خصوصیات جیسا کہ گزر چکا مصحفِ صدیقی کو حاصل ہوئیں یہ خصوصیات دوسرے مصاحف حاصل نہ کرسکے۔

یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں ان کا اپنا ایک خاص مصحف تھا، جس کو انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی ایام میں لکھا، انہوں نے پختہ عزم کرلیا تھا کہ جب تک میں اسے پورا نہ لکھ لوں نماز کے علاوہ گھر سے باہر نہیں نکلوں گا۔ علامہ سیوطی نے محمد بن سیرین اور انہوں نے عکرمہ (رحمہم اللہ) سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ: "حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے ابتدائی دنوں میں جب حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اپنے گھر کے ہو کر رہ گئے تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے کہا گیا کہ انہوں نے آپ کی بیعت کو پسند نہیں کیا، (اس لیے گھر سے باہر نہیں نکلتے) اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی طرف بلاوا بھیجا اور فرمایا کہ کیا آپ نے میری بیعت کو ناپسند کیا ہے؟ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: میں نے اللہ کی کتاب کو دیکھا کہ اس پر زیادتی کی جارہی ہے تو میں نے اپنے دل میں پکا ارادہ کرلیا کہ جب تک میں اسے پورا نہ کرلوں اپنی چادر سوائے نماز کے نہیں پہنوں گا (یعنی گھر سے باہر نہیں نکلوں گا) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: بے شک آپ کی رائے بہت اچھی ہے"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان کا ایک ذاتی مصحف تھا، لیکن جیسا کہ ابن سیرین رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ اس میں ناسخ اور منسوخ دونوں قسم کی آیات تھیں، اس لیے وہ مصحف، مصحفِ صدیقی جیسا نہ تھا۔

عہدِ رسالت میں قرآن کو ایک مصحف میں کیوں جمع نہیں کیا گیا؟ ہم یہاں سوال کرتے ہیں کہ قرآن کریم کو عہدِ نبوی ﷺ میں ایک مصحف کے اندر کیوں جمع نہیں کیا گیا؟ اس سوال کے کئی جوابات دیئے گئے ہیں جو درج ذیل ہیں:

جوابِ اول: قرآن یکبارگی نازل نہیں ہوا، بلکہ متفرق طور پر نازل ہوا، اس لیے کہ اس کا جمع کرنا مکمل نزول سے پہلے ممکن نہ تھا۔

جوابِ دوم: عہدِ نبوی میں بعض آیتیں منسوخ ہوتی رہتی تھیں، اور جبکہ قرآن معرضِ نسخ میں تھا تو ایک مصحف میں اس کا جمع کرنا کیسے ممکن ہوتا؟

جوابِ سوم: آیتوں اور سورتوں کی ترتیب نزول کے مطابق نہ تھی، چنانچہ بعض آیتیں وحی کے اخیر میں نازل ہوئیں جبکہ ترتیب میں انہیں سورتوں کے شروع میں آنا تھا اور یہ بات مکتوب میں تبدیلی کا تقاضا کرتی ہے۔

جوابِ چہارم: آخری وحی کے نزول اور آپ ﷺ کے وصال کے مابین بہت کم عرصہ تھا، اور پہلی فصل میں گزر چکا ہے کہ قرآن مریم کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی آیت نازل ہوئی وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللهِ﴾، اور آپ ﷺ اس کے نزول کے نو راتوں کے بعد اپنے رب کی جوارِ رحمت کی طرف رحلت فرما گئے، چنانچہ آخری وحی اور وفات کے درمیان کی مدت بہت کم تھی، لہٰذا اس کا جمع کرنا نزول کے مکمل ہونے سے پہلے ممکن نہ تھا۔

جوابِ پنجم: ایک مصحف میں جمع کرنے کے جس طرح اسباب وعوامل عہد صدیقی میں پائے گئے اس سے پہلے اس طرح کے اسباب نہیں پائے گئے، چنانچہ پہلے مسلمان امن وامان کی حالت میں تھے، قراء کی تعداد زیادہ تھی اور فتنہ وفساد نہ تھا، برخلاف عہدِ صدیقی کے کہ اس میں حفاظِ کرام کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، جس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو قرآن کے ضیاع کا خوف لاحق ہوا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآن کو اگر اس حالت میں جمع کیا جاتا جو ہم نے بیان کی تو جب بھی کوئی نسخ واقع ہوتا یا کوئی واقعہ رونما ہوتا تو قرآن تغییر وتبدیلی کا ہدف بن جاتا، نیز اس دور میں کتابت کے آلات بھی میسر نہ تھے اور حالات بھی پرانے مصحف کو چھوڑ کر نئے مصحف پر اعتماد کرنے کے لیے ساز گار اور مساعد نہیں تھے، کیونکہ ہر ماہ یا ہر دن ایسے مصحف کا ہونا ممکن نہ تھا جو قرآن کے تمام نازل شدہ حصہ کو جمع کر دیتا، لیکن جب اس معاملہ نے قرآن کی تکمیل اور رسول اللہ ﷺ کے وصال کے ساتھ قرار پکڑا، نسخ سے اطمینان ہو گیا اور ترتیب معلوم ہو گئی تو ایک مصحف میں اس کا جمع کرنا ممکن ہو گیا، اور یہ وہ عظیم کام تھا جسے خلیفہ راشد حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے سرانجام دیا، اللہ تعالیٰ انہیں قرآن او اہلِ قرآن کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائیں۔ (امین)

عہدِ عثمانی میں جمعِ قرآن: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور میں جمع قرآن کا سبب عہدِ صدیقی میں واقع ہونے والے سب سے مختلف تھا، عہدِ عثمانی میں فتوحاتِ اسلامیہ کا دائرہ بہت زیادہ وسیع ہو گیا، مسلمان دور دور کے ممالک اور شہروں میں پھیل گئے اور اسلامی علاقہ میں سے ہر علاقہ کے اندر اس صحابی کی قراءت مشہور ہو گئی جو انہیں قرآن کی تعلیم دیا کرتے تھے، اہلِ شام حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی قراءت، اہلِ کوفہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی قراءت، اور دوسرے لوگ حضرت اُبو موسیٰ اُشعری رضی اللہ عنہ کی قراءت میں پڑھنے لگے، اور ان کے درمیان حروف کی ادائیگی اور وجوہِ قراءات میں اختلاف کی بناء پر باہم لڑائی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی اور اختلافِ قراءت کی بناء پر لوگ ایک دوسرے کی تکفیر کرنے لگے۔

حضرت اُبو قلابہؒ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ''حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب ایک معلم یعنی قاری صاحب نے ایک صحابی کی قراءت اور دوسرے معلم نے دوسرے صحابی کی قراءت میں سکھانا شروع کیا تو بچے جب باہم ملتے تو اختلاف کرتے، یہاں تک یہ بات اساتذہ اور پڑھانے والوں تک پہنچی تو ایک نے دوسرے کو کافر کہنا شروع کر دیا۔ یہ بات جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ تک پہنچی تو آپؓ نے تقریر کی اور فرمایا: کہ تم میرے قریب ہو کر بھی اختلاف کرتے ہو تو جو لوگ مجھ سے دور ہیں وہ تو شدید اختلاف کا شکار ہوں گے۔

انہی اسباب اور عوامل کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی عمدہ رائے اور مخلصانہ سوچ کی وجہ سے یہ خیال کیا کہ لوگوں کے درمیان شگافِ اختلاف کے وسیع ہونے سے پہلے ہی اتفاق کا پیوند لگا کر اس کا تدارک کرلیں، اور مرض کے لاعلاج ہونے سے قبل ہی اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکیں، اس لیے انہوں نے کبار صحابہ اور اصحابِ عقل وبصیرت کو جمع کیا اور اس فتنہ اور اختلاف کے سدّ باب کے بارے میں ان سے مشورہ کیا، تو سب نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا کہ امیر المؤمنین چند مصاحف لکھوائیں اور ہر ملک اور شہر کی طرف ان میں سے ایک ایک مصحف بھیج دیں اور لوگوں کو ان مصاحف کے علاوہ دیگر تمام مصاحف نذرِ آتش کرنے کا حکم دیں، تاکہ وجوہ قراءت میں وہاں نزاع اور اختلاف کا کوئی راستہ نہ رہے تو آپ رضی اللہ عنہ نے اس حکیمانہ قرارداد کو نافذ کرنے کا حکم دیا اور چنیدہ صحابۂ کرام اور ثقہ حفاظ کرام رضی اللہ عنہم حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمن بن ہشام رضی اللہ عنہم کو یہ ذمہ داری سونپی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ تمام مہاجرین اور قریشی صحابہ تھے جبکہ زید رضی اللہ عنہ خود انصار میں سے تھے، اور یہ عظیم کام چوبیس ہجری میں سرانجام پایا، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ان سب سے یہ فرمایا کہ جب وجوہِ قراءت کی وجوہ میں سے کسی وجہ میں تمہارا باہم میں اختلاف ہوجائے تو اسے لغتِ قریش میں لکھنا[1]، کیونکہ قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حفصہ بنتِ عمر رضی اللہ عنہا سے درخواست کی کہ اسے وہ مصحف دے دیں جو ان کے پاس حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جمع کردہ موجود ہے، تاکہ وہ اس کی چند کاپیاں نکلوالیں پھر انہیں وہ لوٹا دیں گے، چنانچہ حفصہ رضی اللہ عنہا نے ان کے اس حکم کی تعمیل کردی۔

دورِ عثمانی میں جمعِ قرآن کا سبب: امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ اہلِ شام آرمینیہ اور آذربائیجان کی فتح کے لئے اہلِ عراق کے ساتھ مل کر جہاد میں مشغول تھے، (حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بھی اسی محاذ پر تھے،

---

(۱) اس سے مراد یہ ہے کہ اسے قریشی رسم الخط میں لکھا جائے، قریشی لغت کے مطابق لکھنا مراد نہیں اور قریشی رسم الخط اس بنا پر اختیار کیا گیا کہ قرآن اسی لغت کے موافق اترا تھا۔

وہاں) آپؓ کو قراءت میں لوگوں کے اختلاف (۱) نے پریشانی اور گھبراہٹ میں مبتلا کردیا تو آپؓ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آکر عرض کیا: یا أمیر المؤمنین! اس امت کی خبر لیجیے قبل اس کے کہ یہ بھی یہود ونصاریٰ کی طرح اس کتاب میں اختلاف کا شکار ہوجائے، پس حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ کے پاس جو صحیفے ہیں وہ ہمارے پاس بھیج دیجیے، ہم انہیں دیگر مصاحف میں نقل کرکے آپ کو واپس بھیج دیں گے، حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے وہ صحیفے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس بھیج دیئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت سعید بن العاص اور حضرت عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام رضی اللہ عنہم کو ان کے نقل کرنے کا حکم دیا، لہٰذا انہوں نے ان کو مختلف مصاحف میں نقل کردیا اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تین قریشی صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت سے فرمایا: جہاں کہیں بھی قرآن کے تلفظ میں تمہارے اور زید بن ثابت کے درمیان اختلاف ہوجائے تو اسے لغتِ قریش پر لکھ لینا، کیونکہ قرآن انہی کی زبان میں نازل ہوا ہے، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، اور جب انہوں نے مصحفِ صدیقی کو دیگر مصاحف میں نقل کردیا تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے صحائفِ صدیقی کو دوبارہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو واپس کردیئے، اور ہر علاقہ میں نقل کردہ نسخوں میں سے ایک مصحف بھجوادیا، نیز اس کے علاوہ ہر صحیفہ یا مصحف میں مکتوب قرآن کی نذرِ آتش کرنے کا حکم بھی صادر فرمایا۔

جمعِ صدیقی اور جمعِ عثمانی میں فرق: حضرت ابوبکر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہما کی جمع کے

(۱) قرآن کریم سات حروف پر نازل ہوا تھا، اور مختلف صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف قراءتوں کے مطابق سیکھا تھا، اور اسی کے مطابق انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھی سکھایا، لیکن جب یہ اختلاف دور دراز ممالک میں پہنچا تو حقیقت سے ناواقفی کی بنیاد پر بعض لوگ اپنی قراءت کو صحیح اور دوسرے کی قراءت کو غلط قرار دینے لگے اور یوں جدل وجدال اور پھر قتل وقتال تک نوبت آپہنچی، ان جھگڑوں کو ختم کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ ایسے نسخے سارے عالم میں پھیلا دیئے جائیں جس میں ساتوں حروف جمع ہوں اور انہیں دیکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ کونسی قراءت صحیح ہے اور کونسی غلط؟ کیونکہ اس وقت معیاری نسخہ جس میں ساتوں حروف جمع ہوں وہ ایک ہی تھا جسے عہد صدیقی میں جمع کیا گیا تھا، اور دوسرے انفرادی نسخوں میں ہر ایک نے اپنی قراءت کے مطابق جمع کیا تھا، ساتوں حروف کو جمع کرنے کا اہتمام نہ تھا، لہٰذا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں یہ عظیم الشان کارنامہ انجام دیا۔

درمیان فرق تھا، مذکورہ کلام سے ہم جمع صدیقی اور جمعِ عثمانی کے درمیان فرق جان سکتے ہیں، اور وہ یہ ہے کہ عہدِ صدیقی میں جمعِ قرآن ایک مصحف میں نقل کرنے اور مرتب آیات کے ساتھ لکھنے کا نام تھا، وہ جمع سفید باریک پتھروں، کھجور کی تراشیدہ شاخوں اور (کاغذ اور چمڑے وغیرہ کے) ٹکڑوں میں ہوئی، اس کا سبب حفاظ کرام کی شہادت تھی، لیکن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا جمع کرنا[1] عہدِ صدیقی میں جمع کیے گئے مصحف سے چند نقول تیار کروانے کا نام تھا، تاکہ اسے اسلامی ممالک میں بھیجا جاسکے، اور یہاں جمع کا سبب قراء حضرات کا قراءت قرآن کی وجوہ میں اختلاف تھا[2]۔ واللہ أعلم۔ وصلی اللہ علی سیدنا محمد وآلہ وصحبہ وسلم۔

---

(۱) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تقریباً آٹھ نسخے امصارِ مملکت میں بھیجنے کے لئے تیار کرائے، اور یہ مصاحف بارہ ہزار صحابہ کے اجماع سے لکھے گئے، پھر ایک جلد خاص اپنی تلاوت کے لئے رکھ لی اور دیگر نسخے معلّمین سمیت بڑے بڑے شہروں کی طرف روانہ کر دیئے تاکہ عوام اس سے اپنے نسخوں کا مقابلہ کرلیں یا صحیح نقل کرلیں۔ لہٰذا مدنی مصحف کے معلم زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور کوفی کے ابوعبدالرحمن سلمی، بصری کے عامر بن قیس، شامی کے مغیرہ بن أبی شہاب اور مکی کے عبداللہ بن سائب رضی اللہ عنہ تھے، ان مصاحف عثمانی میں سے دو مصحف اس وقت دنیا میں محفوظ ہیں، ایک تاشقند میں ہے اور دوسرا استنبول میں۔ وہ مصحف عثمانی جو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بوقت شہادت تلاوت کر رہے تھے اب بھی وہ تاشقند میں بحمد اللہ محفوظ ہے، اور دیکھنے والوں کے مطابق آیت: ﴿**فسيكفيكهم الله وهو السميع العليم**﴾ پر خون مبارک کے قطروں کے نشانات ہیں (مفاتیح ملخصاً)۔

(۲) جمع عثمانی میں مندرجہ ذیل امور کا بھی اہتمام کیا گیا:

۱......قرآن کریم کو ایک جلد میں بین الدفتین جمع کرلیا گیا جبکہ جمعِ صدیقی میں مختلف صحیفوں اور اوراق کی شکل میں محفوظ کیا گیا تھا۔ (مفاتح: ۱۱۹/۷)

۲......سورتوں کو ترتیب کے ساتھ ایک ہی مصحف میں لکھا گیا جبکہ پہلے سورتیں مختلف صحیفوں میں الگ الگ لکھی ہوئی تھیں۔ (فتح الباری)

۳......قرآن کریم کی آیات اس طرح لکھیں کہ ان کے رسم الخط میں تمام متواتر قراءتیں سما جائیں۔ (علوم القرآن)

۴......رسم الخط قریشی اختیار کیا گیا۔ (علوم القرآن)

فائدہ: حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مذکورہ کارنامے کے بعد امت کا اس پر اجماع ہے کہ قرآن کریم کو رسمِ عثمانی کے خلاف لکھنا جائز نہیں، البتہ جب اسلام عجمی ممالک میں اور زیادہ پھیلا تو نقطے اور حرکات کی ضرورت اور دیگر تسہیل کے اقدامات کی ضرورت محسوس ہوئی:

☆ - حرکات سب سے پہلے أبو الأسود دؤلی رحمہ اللہ نے وضع کیں، لیکن یہ حرکات نقطوں کی صورت میں =

تھیں کہ زبر کے لئے حرف کے اوپر، زیر کے لئے نیچے اور پیش کے لئے سامنے ایک نقطہ لگایا گیا۔

☆-اس کے بعد لوگوں نے حرکات کے متعلق چند علامتیں اور زیادہ کیں، حتیٰ کہ خلیل بن احمد فراہیدی نحوی رحمہ اللہ نے ضبطِ حرکات کا مروّجہ طریقہ رائج کیا۔

☆-اس کے کچھ عرصہ بعد حجاج بن یوسف کی فرمائش پر نصر بن عاصم لیثی اور یحییٰ بن یعمر رحمہا اللہ نے تلاوت میں سہولت اور تفہیمِ معنی میں سرعت کے لئے پورے قرآن کو نقطوں سے منقوط کر دیا۔

☆-حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ''قرآن کو ہر مہینہ ختم کیا کرو، میں نے عرض کیا میرے میں زیادہ قوت ہے، فرمایا کہ سات دن میں ختم کرو اور اس پر زیادتی نہ کرو''۔ شاید اسی سے اخذ کر کے حجاج کے زمانے میں تیس پاروں کی اصطلاح مقرر ہوئی، جو سورتِ فاتحہ کے علاوہ باقی قرآنی کلمات کے شمار کے موافق مساوی یا قریب بہ مساوی ہیں، پھر ہر پارہ کے چار ٹکڑے کئے گئے، اسی لئے اکثر مروّجہ نسخوں میں رُبع (چوتھائی) نصف (آدھے) ثلث (تہائی) کے حصے شمارِ حروف کے اعتبار سے درج ہیں۔

☆- نبی ﷺ نے ایک ہفتہ میں ختمِ قرآن کی ترتیب ابنِ عمر بن عاص رضی اللہ عنہ کے لئے مقرر فرمائی، پھر اکثر صحابہ رضی اللہ عنہم اسی ترتیب سے نمازِ تہجد میں پڑھتے تھے، شاید منازل: ''فمی بشوقٍ'' (میرا منہ بتلائے شوقِ قرآن ہے) انہی احادیث سے اخذ کر کے حجاج کے زمانہ میں ایک مستقل اصطلاح بنادی گئی ہوں جو شب جمعہ سے شروع ہو کر شبِ جمعرات کو ختم ہوتی ہیں، ''فمی بشوقٍ'' کی فاء فاتحہ کی، میم مائدہ کی، یاء یونس کی، باء بنی اسرائیل کی، شین شعراء کی، واو والصّٰفّٰت کی اور قاف سورۂ قٓ کی رموز ہیں۔

حضرت عثمان، حضرت زید، حضرت اُبی اور حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہما کا معمول یہ تھا کہ ''فایطٰ عزذ'' کے مطابق جمعرات سے لیکر جمعہ تک سات دنوں میں ختمِ قرآن کیا کرتے تھے، ''فایطٰ عزذ'' کی فاء فاتحہ کی، ہمزہ انعام کی، یاء یونس کی، طاء طٰہٰ کی، عین عنکبوت کی، زاء زمر کی اور دال واقعہ کی رمز ہے۔

☆-رکوع کی علامات کو مشائخِ فقہاء اور علماءِ ماوراء النھر نے مقرر کیا ہے، ان کے تقرر کا زمانہ تقریباً ۳۰۰ ھ کا ہے، ان کے وضع کا منشا یہ تھا کہ تراویح میں ختمِ قرآن ستائیسویں شب کو ہو جائے، کیونکہ شبِ قدر کی زیادہ احادیث اسی رات کے متعلق آئی ہیں، لہٰذا قرآن کے پانچ سو چالیس رکوع مقرر کئے گئے تاکہ ہر رکعت میں ایک رکوع پڑھنے سے ستائیسویں شب کو قرآن ختم ہو جائے، اس میں دو باتوں کا لحاظ رکھا گیا، اوّل یہ کہ کوئی رکوع قراءت کی فرض مقدار سے کم نہ ہو، دوم یہ کہ ہر رکوع ایک پورے مضمون پر مشتمل ہو۔

☆- نیز مختلف قرآنی جملوں پر ط، ج، ز وغیرہ جیسے اشارات لکھ دیئے گئے جن سے یہ معلوم ہو سکے کہ اس جگہ وقف کرنا کیسا ہے؟ ان اشارات کو ''رموزِ اوقاف'' کہتے ہیں، ان میں سے اکثر رموز سب سے پہلے علامہ ابو عبداللہ محمد بن طیفور سجاوندی رحمہ اللہ نے وضع فرمائے ہیں۔ (ماخوذ از مفاتیح الحجاز وعلوم القرآن)۔

ساتویں فصل

تفسیر اور مفسرین

اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب کو نازل فرمایا تا کہ وہ مسلمانوں کے لیے دستورِ حیات اور ایسی شاہراہ ہو جس پر وہ اپنی زندگی میں رواں دواں رہیں، اور اس کی روشنی سے فیض یاب ہوں، اس کی راہ سے ہدایت پائیں، اور اس کی اُن عمدہ تعلیمات اور حکیمانہ طریقوں سے استفادہ کریں جو انہیں سعادت وعزت کے اعلیٰ مقام پر فائز اور کمال و بزرگی کی بلندیوں تک پہنچادیں اور پھر انسانی قافلے کی قیادت وسیادت ان کے سپرد کر دیں تا کہ وہ اقوامِ دنیا کو عزت وشرافت کی راہِ حیات پر لے کر چلنے والے اور انسانیت کو امن و آشتی اور استحکام کے کنارے تک پہنچا دینے والے ہوں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ انسانیت آج بدبختی اور جاہلیت کی گھٹاٹوپ اندھیریوں میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہے، آزادی اور مادہ پرستی کے سمندروں میں غرق ہے، اور اُس کو اِس مشکل سے نکالنے والا اسلام کے سوا اور کوئی نظر نہیں آتا، جو کہ قرآن کی اُن تعلیمات اور حکیمانہ طریقوں کی رہنمائی کے ذریعے سے اُس کا نجات دہندہ بن سکتا ہے کہ جن میں بنی نوعِ انسان کی سعادت کے لئے خالقِ کائنات اور حکمت والے رب کے علم کے مطابق تمام عناصر کی رعایت کی گئی ہے۔

اور ظاہر ہے کہ ان تعلیمات پر عمل قرآن کو سمجھنے، اس کے معانی میں غور وفکر کرنے اور قرآن میں موجود ارشادات ونصائح پر واقف ہونے کے بعد ہی ہو سکتا ہے، اور یہ فہم وتدبر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک آیاتِ قرآنیہ کے مدلولات اور معانی کی توضیح اور تشریح نہ کی جائے، اور یہی وہ چیز ہے جسے ہم علمِ تفسیر کا نام دیتے ہیں،

خصوصاً اس آخری زمانہ میں کہ جس میں عربی بیان کا ملکہ فاسد اور عربیت کی خصوصیات

ضیاع کا شکار ہو گئیں ہیں حتیٰ کہ خود ابناءِ عرب سے بھی ناپید ہو رہی ہیں! چنانچہ تفسیر ہی ہے جو اس مقدس کتاب کے اندر پنہاں خزانوں اور دفینوں تک رسائی کے لیے کلید ہے، لوگ جس قدر بھی قرآن کے الفاظ دھرانے کا اہتمام کریں اور روزانہ صبح و شام اس کی آیتیں تلاوت کرتے رہیں لیکن تفسیر کے بغیر ان ذخائر، خزانوں، اور ہیرے موتیوں تک نہیں پہنچ سکتے۔

اور انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مسلمان صرف قرآن کے الفاظ پر اکتفاء کر بیٹھے ہیں کہ انہیں دہراتے رہتے ہیں اور ان لہجوں پر قناعت کر لی ہے جنہیں وہ سوگ کی محفلوں، مقبروں اور رواجی تقریبات میں ترنم کے ساتھ پڑھتے رہتے ہیں، پھر قرآن کا ان کے ہاں سماع سے لطف اندوزی یا تلاوت سے تبرک حاصل کرنے کے علاوہ کوئی مرتبہ نہیں رہا، اور آپ ﷺ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''یتخذون القران مزامیر''، یعنی لوگ قرآن کو مزامیر بنالیں گے۔

مسلمان یہ بات فراموش کر گئے ہیں یا از خود بھلا دیا ہے کہ قرآن کی سب سے بڑی برکت تو اس میں غور و فکر کرنے، سمجھنے، اس کی راہ سے ہدایت پانے اور اس کی تعلیمات و ارشادات سے استفادہ کرنے میں اور پھر اس کے احکام و مرضیات سے آگے نہ بڑھنے اور اس کی ناراضگی کے مقامات اور منہیات سے دور رہنے میں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

ترجمہ: ''یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں''۔ (ص:۲۹)

اور ارشادِ پاک ہے: ﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد:۲۴)

ترجمہ: ''تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں''۔

نیز فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾ (القمر:۱۷)

ترجمہ: ''اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟''۔

آج مسلمان کس قدر اس شخص کے مشابہ ہیں جو پانی سامنے ہونے کے باوجود پیاس سے مرجائے یا ان کی مثال اس حیوان جیسی ہے جو چارہ اور پانی پیٹھ پر ہونے کے باوجود بھوک اور پیاس کی وجہ سے ہلاک ہوجائے، اور شاعر نے کیا ہی خوب بات کہی ہے!

کالعیس فی البیداء یقتلها الظما   والماء فوق ظهور ها محمول

ترجمہ: ''اس کی مثال ان اونٹوں کی طرح ہے جو جنگل میں پیاس سے مرجائیں جبکہ پانی ان کی پیٹھوں پر رکھا ہوا ہو''۔

آنحضرت ﷺ نے جب فرمایا تو واقعی سچ فرمایا: ''میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، جب تک تم انہیں مضبوطی سے تھامے رہو گے میرے بعد کبھی گمراہ نہ ہوگے، اور وہ کتاب اللہ اور میری سنت ہے''۔

ہم قرآن کی تفسیر کیوں کرتے ہیں؟ یہاں چند ایسے سوالات ہیں جو ہر انسان کے دل میں کھٹکتے ہیں اور ہر کسی کی سوچ وفکر میں گردش کرتے ہیں کہ ہم قرآن کی تفسیر کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ اس کی قراءت وتلاوت میں تحسین پیدا کریں اور مہارت حاصل کریں؟ یا اس لیے کہ اس کے پوشیدہ معانی کی پردہ کشائی کریں؟ یا اس کے رازوں کو ظاہر اور محاسن کو کھول کر رکھ دیں؟

نہیں نہیں ہرگز نہیں نہ صرف یہ بات ہے اور نہ ہی وہ، بلکہ ہم تفسیر کرتے ہیں تاکہ بندوں کی بندگی اور انسان کی اطاعت سے نکل کر تمام انسانوں کے پروردگار کی بندگی کرنے والے بن جائیں، اور فرد وجماعت دونوں کا رشتہ ہم خالقِ کائنات، منتظمِ دنیا، بلند آسمانوں کے مالک اور عرش عظیم کے رب کے ساتھ جوڑ دیں۔

قرآن کریم امت کا آئین، خالق کی طرف سے رہنمائی اور اہلِ زمین کیلئے اللہ کی شریعت ہے، اور وہ ایسا ربانی نور، آسمانی تحفہ اور جنرل ابدی قانون ہے جس نے انسان کی اپنے دینی دنیوی مسائل میں تمام ضروریات کو پیش نظر رکھا ہے، اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ ایک ایسی مکمل کتاب اور ہمہ گیر نظام ہے جو عقائد وعبادات، اخلاق ومعاملات، سیاست وحکومت، صلح وجنگ اور اقتصادی مسائل وملکی تعلقات غرض زندگی کے تمام گوشوں کو شامل ہے۔

سو یہ ایسی جامع کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس لئے نازل فرمائی ہے کہ وہ (دین کی) تمام باتوں کو بیان کرنے والی اور (خاص) مسلمانوں کے لئے بڑی ہدایت اور بڑی رحمت اور (ایمان کی) خوشخبری سنانے والی ہو، اور وہ ان تمام باتوں میں حکمت سے لبالب بھری ہوئی ہے، انتشار واختلاف کا شکار نہیں ہوتی، اس لیے اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ اگر سعادت کا پانا اس کے نقش قدم پر چلنے اور اس کے لائے ہوئے احکامات پر عمل کرنے کے سوا ممکن نہ ہو، پس یہ کتاب دلوں میں ہونے والے بُرے روگوں کے لیے شفاء اور معاشرہ میں سرایت کرنے والے فتنوں اور متوقع فساد کے لیے دوا اور علاج ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَاۗءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ (الاسراء: ۸۲)

ترجمہ: ''اور ہم قرآن مجید میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں کہ وہ ایمان والوں کے حق میں تو شفاء اور رحمت ہے اور ناانصافوں کو اس سے اور الٹا نقصان بڑھتا ہے''۔

تفسیر اور تاویل میں فرق: تفسیر لغت میں ''تشریح اور وضاحت کرنے'' کو کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا﴾ (الفرقان: ۳۳)

ترجمہ: ''اور یہ لوگ کیسا ہی عجیب سوال آپ کے سامنے پیش کریں مگر ہم (اس کا) ٹھیک جواب اور وضاحت میں (بھی) بڑھا ہوا آپ کو عنایت کردیتے ہیں''۔

چنانچہ ہمارے قول ''فسّر'' کا معنی ہے اس نے تشریح اور وضاحت کی، اور ''کلامِ مفسّر'' کا معنی ہے واضح اور ظاہر کلام، اور تفسیر کی اصطلاحی تعریف یوں ہے: ''هُوَ عِلْمٌ يُعْرَفُ بِهِ فَهْمُ كِتَابِ اللهِ الْمُنَزَّلِ عَلٰى نَبِيِّهٖ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم وَبَيَانِ مَعَانِيْهِ وَاسْتِخْرَاجِ اَحْكَامِهٖ وَحِكَمِهٖ''۔

''علم تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعے اللہ کی اس کتاب کے مفہوم کو سمجھا جاتا ہے جو انہوں نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ پر نازل کی، اور اس کے معانی کے بیان، اس کے احکام اور حکمتوں کے استنباط کو معلوم کیا جاتا ہے''۔

اور بعض دوسرے حضرات نے اس کی تعریف یہ کی ہے: "هُوَ عِلْمٌ يُبْحَثُ فِيْهِ عَنِ الْقُرْآنِ الْكَرِيْمِ مِنْ حَيْثُ دَلَالَتِهٖ عَلٰى مُرَادِ اللّٰهِ تَعَالٰى بِقَدْرِ الطَّاقَةِ الْبَشَرِيَّةِ"۔

"علم تفسیر وہ علم ہے جس میں انسانی طاقت کے بقدر قرآن کریم کے بارے میں بحث کی جاتی ہے بایں طور کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مراد پر دلالت کرتا ہے"۔[1]

تاویل کا معنی: لغت میں تاویل "أول" سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں "لوٹنا" اور مفسر بھی آیت کو لفظ کے محتمل معانی کی طرف لوٹاتا اور راجع کرتا ہے۔

اور بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ تاویل تفسیر کے مرادف اور ہم معنی ہے، اسی لیے صاحبِ قاموس فرماتے ہیں: "أَوَّلَ الْكَلَامَ تَأْوِيْلًا وَتَأَوَّلَهٗ" کا معنی ہے: "دبره وقدره وفسره" یعنی "اس نے کلام میں تدبر کیا، اندازہ لگایا اور تفسیر بیان کی"۔

اور اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيْلِهٖ﴾ "(دین میں) شورش ڈھونڈنے کی غرض سے اور اس کے (غلط) مطلب ڈھونڈنے کی غرض سے"۔

اور اصطلاح میں "تاویل" متقدمین کے ہاں "تفسیر" کے ہم معنی ہے، اسی لیے تاویلِ قرآن اور تفسیرِ قرآن کا ایک ہی معنی بتایا جاتا ہے، علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ اپنی تفسیر

---

(۱) تفسیر نے جب ایک مدوّن علم کی صورت اختیار کی اور مختلف پہلوؤں سے اس کی خدمت کی گئی تو یہ ایک انتہائی وسیع اور پہلودار علم بن گیا، اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق اس میں تفصیلات کا اضافہ ہوتا چلا گیا، اب علمِ تفسیر جن تفصیلات کو شامل ہے اس کی اصطلاحی تعریف یہ ہے:

"علم يُبحث فيه عن كيفية النطق بألفاظ القرآن ومدلولاتها وأحكامها الأفرادية والتركيبية ومعانيها التي تُحمل عليها حالة التركيب وتتمات لذٰلک"۔

"علمِ تفسیر وہ علم ہے جس میں الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقے، اُن کے مفہوم، ان کے افرادی اور ترکیبی احکام اور اُن معانی سے بحث کی جاتی ہے جو اُن الفاظ سے ترکیبی حالت میں مراد لئے جاتے ہیں، نیز اُن معانی کا تکملہ: ناسخ ومنسوخ، شانِ نزول اور مبہم قصوں کی توضیح کی شکل میں بیان کیا جاتا ہے"۔

الفاظِ قرآن کی ادائیگی کے طریقوں کی معرفت کے لئے "علمِ قراءات"، مفاہیم لغویہ کی معرفت کے لئے "علمِ لغت"، الفاظ کے انفرادی احکام مادہ، وزن اور اُن کے خواص کے لئے "علمِ صرف"، ترکیبی احکام اور اُن کے معانی کے لئے "علمِ نحو اور علمِ معانی"، ترکیبی حالت میں الفاظ کے مجموعی معنی کے لئے مختلف علوم سے مدد لی جاتی ہے، اور معانی کے تکملوں کے لئے زیادہ تر "علمِ حدیث" سے کام لیا جاتا ہے۔ (علوم القرآن)

میں ذکر فرماتے ہیں کہ: ""الْقَوْلُ فِیْ تَأوِیْلِ قَوْلِہٖ تعالیٰ کَذَا، وَاخْتَلَفَ أَهْلُ التَّاوِیْلِ فِیْ هٰذِہٖ الاٰیۃِ" جیسی عبارتوں میں اہلِ تاویل سے مراد اہل تفسیر ہی ہوتے ہیں"۔

اور مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے: "اِنَّ الْعُلَمَاءَ یَعْلَمُوْنَ تَأوِیْلَہٗ"" یعنی بے شک علماء اس (قرآن) کی تاویل جانتے ہیں"۔ ان کی مراد اس سے قرآن کے معنی کی تفسیر ہے۔

اور علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ تفسیر اور تاویل کے درمیان واضح فرق موجود ہے، اور یہ نظریہ متاخرین کے ہاں مشہور و معروف ہے، وہ یہ کہ "تفسیر" آیتِ مبارکہ کے ظاہری معنی کو کہتے ہیں، جبکہ "تاویل" متعدد معانی کا احتمال رکھنے والی آیتِ مبارکہ میں سے کسی ایک محتمل معنی کو راجح قرار دینے کا نام ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاتقان في علوم القران" میں تاویل و تفسیر کے درمیان فرق کی بحث کو تفصیل سے ذکر کیا ہے، اور علمائے کرام کے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں، ہم ان میں سے جامع ترین اور صحت کے زیادہ قریب قول کو ذکر کرنے پر اکتفاء کریں گے، اور وہ یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ:

"تفسیر" قرآن کے ظاہری معنی کی پردہ کشائی ہے، جبکہ "تاویل" آیاتِ مبارکہ میں داخل ایسے پوشیدہ معانی اور لطیف ربانی سربستہ رازوں کا نام ہے جن کا حق شناس علماء نے استنباط و استخراج کیا ہے، علامہ آلوسی رحمہ اللہ بھی ہماری اختیار کردہ رائے کے قائل ہیں، کیونکہ ان کا کہنا ہے کہ مؤلفین سے بغیر کسی تردید کے یہ بات متعارف ہے کہ تاویل غیب کی بدلیوں سے عارفین باللہ کے دلوں پر برسنے والے مفاہیمِ قدسیہ اور معارفِ ربانیہ کو کہتے ہیں، جبکہ تفسیر اس کے علاوہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ "تفسیر" قرآن کریم کے ان ظاہری معانی کو کہتے ہیں جو اللہ عزوجل کے مرادی معنی پر دلالت کرنے میں واضح ہوں، اور "تاویل" ان پوشیدہ معانی کو کہتے ہیں جو آیاتِ مبارکہ سے مستنبط، غور و فکر اور استنباط کے محتاج اور کئی معانی کے محتمل ہوتے ہیں، پھر مفسر قیاس و استدلال کے طریقہ سے ان میں سے زیادہ قوی کو ترجیح دیکر اسے اختیار کرتا ہے، اور یہ ترجیح قطعی نہیں ہوتی، بلکہ یہ مفسر کے ہاں اظہر اور اقوی معنی کے وزن دار ہونے کا بیان ہوتا ہے، کیونکہ اس بات کا حکم لگانا کہ یہی قطعی طور پر مراد ہے کتاب

اللہ میں بے جا بلا دلیل فیصلہ ہے، اس لیے کہ ارشاد پاک ہے:

﴿وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ﴾ یعنی ''ان کا (صحیح) مطلب بجز حق تعالیٰ کے کوئی اور نہیں جانتا''۔

تفسیر کی اقسام: تفسیر کی مستحکم علمی اصطلاح کے مطابق تین قسمیں بیان کی جاتی ہیں:

۱۔تفسیر بالروایۃ، اسے تفسیرِ منقول یا تفسیرِ ماثور بھی کہتے ہیں۔

۲۔تفسیر بالدرایۃ، اور اسے تفسیر بالرأی بھی کہا جاتا ہے۔

۳۔تفسیر بالاشارۃ، اہل علم اسے تفسیر اشاری کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

اور اب ہم ان شاء اللہ ان میں سے ہر قسم کی تفصیل بیان کرتے ہیں، اور صحیح کلام کی لچر اور معیوب کلام سے تمیز اور وضاحت کرتے ہیں۔

پہلی قسم۔تفسیر منقول: تفسیر منقول وہ روایتیں جو قرآن وسنت یا صحابہ رضوان اللہ علیہم اَجمعین کے اقوال میں اللہ تعالیٰ کی مراد بیان کرنے کی لئے سنتِ نبویہ کے ذریعے قرآن کی تفسیر بیان کرنے کے لئے آئی ہو، چنانچہ تفسیر منقول یا تو قرآن کی قرآن کے ذریعے تفسیر ہوگی، یا قرآن کی سنت کے ذریعے تفسیر ہوگی، یا قرآن کی صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اَجمعین سے مروی اقوال کے ذریعے تفسیر ہوگی۔

الف...... تفسیر القرآن بالقرآن کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿أُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيمَةُ الْأَنْعَامِ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ﴾ (المائدۃ:۱)

ترجمہ: ''تمہارے لیے تمام چوپائے جو انعام کے مشابہ کے ہوں (یعنی اونٹ، بکری، گائے) حلال کیے گئے ہیں سوائے ان کے جن کا ذکر آگے آتا ہے''۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ﴾ کی تفسیر دوسری آیتِ مبارکہ میں آئی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللهِ بِهِ﴾ (المائدۃ:۳)

ترجمہ: ''تم پر حرام کیے گئے ہیں مردار اور خنزیر کا گوشت اور جانور کہ غیر اللہ کے نام زد کر دیا گیا ہو......''۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ﴾ (الطارق:۱)
ترجمہ: ''قسم ہے آسمان کی اور اس چیز کی جو رات کو نمودار ہونے والی ہے''۔
اور اسی سورت میں اس کی تفسیر: ﴿النَّجْمُ الثَّاقِبُ﴾ یعنی ''چمکتے ہوئے تارے'' سے کی گئی ہے۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿فَتَلَقَّى آدَمُ مِن رَّبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ﴾ (البقرۃ:۳۷)
ترجمہ: ''بعد ازاں حاصل کر لیے آدم نے اپنے رب سے چند الفاظ تو اللہ تعالیٰ نے رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی ان پر (یعنی توبہ قبول کر لی)''۔

آدم علیہ السلام کے حاصل کردہ کلمات کی تفسیر قرآن میں ایک دوسری جگہ آئی ہے، وہ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: ﴿قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا أَنفُسَنَا وَإِن لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾ (الأعراف:۲۳)
ترجمہ: ''دونوں کہنے لگے کہ اے ہمارے رب! ہم نے اپنا بڑا نقصان کیا اور اگر آپ ہماری مغفرت نہ کریں گے اور ہم پر رحم نہ کریں گے تو واقعی ہمارا بڑا نقصان ہو جائے گا''۔

اور تفسیر قرآنی کی ایک مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ﴾ (الدخان:۳)
ترجمہ: ''ہم نے اس کو (لوحِ محفوظ سے آسمانِ دنیا پر) ایک برکت والی رات میں اتارا ہے''۔

اور مبارک رات کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد: ﴿إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ﴾ میں شب قدر سے کی گئی ہے۔

اور اس کے علاوہ بھی دیگر بہت سی مثالیں تفسیرِ قرآنی کی موجود ہیں۔

ب..... قرآن کی اس تفسیر وتشریح کی مثال جو سنتِ نبوی میں وارد ہوئی یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے اس ارشاد میں ظلم کی تفسیر شرک سے فرمائی: ﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ﴾ (الأنعام:۸۲)

ترجمہ: ''جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ نہیں ملاتے ایسوں ہی کے لئے امن ہے اور وہی راہ پر چل رہے ہیں''۔

اور اپنی تفسیر کی تائید میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پیش کیا: ﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ﴾ (لقمان: ۱۳)

ترجمہ: ''بیشک شرک کرنا بڑا بھاری ظلم ہے''۔

اور اسی طرح آپ ﷺ نے حساب یسیر کی تفسیر عرض سے فرمائی، یعنی اعمال کو صرف مؤمن پر پیش کرنا اور اسے اعمال کی یاددہانی کرانا مراد ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے فرمایا: ''من نُوقش الحساب عُذّب'' یعنی ''جس سے قیامت کے دن حساب لیا گیا اسے عذاب دیا جائے گا''۔ تو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا: ﴿فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا وَيَنْقَلِبُ إِلَى أَهْلِهِ مَسْرُورًا﴾ (الانشقاق: ۷۔۹)

ترجمہ: ''(تو اس روز) جس شخص کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں ملے گا، سو اس سے آسان حساب لیا جائے گا، اور وہ (اس سے فارغ ہو کر) اپنے متعلقین کے پاس خوش خوش آئے گا''۔

(یعنی اس آیت میں تو مؤمنین سے بھی حساب لینے کا ذکر ہے تو کیا انہیں بھی عذاب دیا جائے گا؟) چنانچہ آپ ﷺ نے (آسان حساب کی تفسیر کرتے ہوئے) فرمایا کہ اس سے مراد عرض ہے (یعنی مؤمنین پر ان کے اعمال کو پیش کرنا مراد ہے) اور رہا وہ شخص جس سے حساب لیا گیا تو اسے عذاب دیا جائے گا''۔

اور اسی طرح آپ ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں صلوٰۃ وسطیٰ کی تفسیر نمازِ عصر سے فرمائی ہے: ﴿حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَقُومُوا لِلَّهِ قَانِتِينَ﴾ (البقرۃ: ۲۳۸)

ترجمہ: ''محافظت کرو سب نمازوں کی (عموماً) اور درمیان والی نماز کی (خصوصاً)''۔

اور سورۂ فاتحہ میں: ﴿المغضوب علیهم﴾ اور ﴿الضالین﴾ کی تفسیر یہود

ونصاریٰ سے فرمائی۔

نیز آیاتِ مبارکہ کی تفسیرِ نبوی کی ایک مثال حضور ﷺ کی طرف سے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: ''زیادۃ'' کی وضاحت بھی ہے: ﴿لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ﴾ (یونس:۲۶)

ترجمہ: ''جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی (جنت) ہے، اور مزید برآں بھی''۔

کہ آپ ﷺ نے: ''زیادۃ'' کی تفسیر میں فرمایا کہ اس سے مراد رب کریم کے مبارک چہرے کا دیدار ہے۔ "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنَا مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ الَّذِيْنَ لَهُمُ الْحُسْنٰى وَزِيَادَةٌ"۔

اور اسی طرح حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں: ''قوۃ'' کی تفسیر: ''رمی'' (تیر اندازی) سے فرمائی ہے: ﴿وأعدّوا لهم ماستطعتم من قوةٍ﴾ (الأنفال:۶۰)

ترجمہ: ''ان کافروں کے لیے جس قدر تم سے ہو سکے ہتھیار سے سامان درست رکھو''۔

چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "ألا انّ القوة الرمي، ألا انّ القوة الرمي" ''غور سے سن لو کہ قوت تو تیر اندازی ہی ہے، پھر گوش گزار کر لو کہ قوت تو تیر اندازی ہی ہے''۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تفسیرِ نبوی ہے: ﴿يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا﴾ (الزلزال:۴)

ترجمہ: ''اس روز (زمین) اپنی سب (اچھی بری) خبریں بیان کرنے لگے گی''۔ کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''کیا تم جانتے ہو کہ زمین کی خبریں کیا ہوں گی؟ تو صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی زیادہ جانتے ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: زمین ہر مرد و عورت کے خلاف ان تمام کاموں کی گواہی دے گی جو انہوں نے اس کی پیٹھ پر کیے، وہ کہے گی کہ تو نے فلاں فلاں دن ایسا ایسا کام کیا''۔

اور ان تفاسیر کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب:

"الاتقان فی علوم القرآن" میں تفاسیر نبویہ کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کیا ہے، سو تفصیل کے لئے اس کی طرف رجوع کیا جائے۔

یہ دونوں قسمیں: "تفسیرِ قرآنی اور تفسیرِ نبوی" بلا شبہ تفسیر کی انواع میں سے سب سے افضل واعلیٰ ہیں، اور ان کے مقبول ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں، پہلی قسم اس وجہ سے اعلیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مراد کو غیر سے زیادہ جانتے ہیں، اور کتاب اللہ سب سے سچا کلام ہے؛ کیونکہ باطل نہ اس کے سامنے سے اور نہ ہی اس کے پیچھے سے اس میں داخل ہوسکتا ہے۔

اور دوسری قسم اس وجہ سے اعلیٰ ہے کہ قرآن کریم نے رسول اکرم ﷺ کے مشن وکاز کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ آپ ﷺ کی ذمہ داری ہی توضیح وتبیین ہے: ﴿وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ﴾ (النحل: ۴۴)

ترجمہ: "اور آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تاکہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ہیں ان کو آپ اُن پر ظاہر کردیں"۔

لہٰذا جو تشریح وتوضیح بھی رسول اللہ ﷺ سے صحیح اور ثابت سند کے ساتھ مروی ہے اس کے سچا ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں اور اس پر اعتماد کرنا ضروری ہے۔

ج...... صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تفسیر

تفسیرِ ماثور کی اقسام میں سے تیسری قسم رہ جاتی ہے جو کہ "تفسیر الصحابۃ" کہلاتی ہے، سو یہ بھی ایک معتمد ومقبول تفسیر ہے، کیونکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے رسول اکرم ﷺ کی صحبت اختیار کی، آپ ﷺ کے صاف چشمہ سے سیراب ہوئے، وحی اور قرآن کے نزول کا مشاہدہ کیا، اسبابِ نزول کو پہچان لیا تھا، اور ان کے نفوس کی پاکیزگی، فطرتوں کی سلامتی اور فصاحت وبلاغت میں ان کے مرتبہ کی بلندی نے انہیں کلام اللہ کے صحیح اور درست سمجھنے کے قابل اور اس قرآن کے رازوں کو ہر شخص سے زیادہ جاننے والا بنا دیا۔

امام حاکم رحمہ اللہ کا قول ہے کہ: "اس صحابی کی تفسیر جس نے وحی اور قرآن کے نزول کا مشاہدہ کیا ہو حدیثِ مرفوع کے حکم میں ہے"۔

مطلب یہ ہے کہ صحابی کی تفسیر اس حدیثِ نبوی کے حکم میں ہے جو آنحضرت ﷺ

تک براہِ راست پہنچتی ہو، چنانچہ اس تقدیر پر صحابی کی تفسیر بھی تفسیر ماثور ہوگی۔[1] اور رہا تابعی تو اس کی تفسیر میں اختلاف ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ وہ تفسیرِ منقول کی قبیل سے ہے؛ کیونکہ تابعی اسے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے ہی حاصل کرتا ہے، جبکہ دیگر بعض کی رائے یہ ہے کہ تابعی کی تفسیر تفسیر بالرأی کی قبیل سے ہے، یعنی اس کا حکم ان باقی مفسرین کی تفسیر کی طرح ہے جو منقول کا التزام کیے بغیر قرآن کی تفسیر عربی زبان کے قواعد کے مطابق کیا کرتے ہیں۔[2]

تنبیہ: تفسیر ماثور کی اسناد جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف صحیح ہوتو وہ تفسیر کی انواع میں سب سے اعلیٰ اور عمدہ تفسیر ہوگی، البتہ تفسیرِ ماثور ذکر کرنے کے وقت روایت کی تحقیق نہایت ضروری ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''تفسیر ماثور کا اکثر حصہ نا قلین تک ملحدینِ یہود، ایرانیوں اور مسلمانانِ اہل کتاب کے ذریعے پہنچا ہے، اور ان نا قابلِ اعتبار روایات کا اکثر حصہ انبیاء علیہم السلام کے اپنی قوموں کے ساتھ واقعات، ان کی کتابوں اور معجزات اور ان کے علاوہ دیگر تاریخی واقعات مثلاً اصحاب کہف کے قصہ وغیرہ کے بارے میں ہے''۔ اسی لئے روایت میں احتیاط و تحقیق ایک لازمی امر ہے۔

روایت بالماثور کے ضعیف ہونے کے اسباب: ماقبل میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ قرآن کی بعض آیتوں کی دیگر بعض سے اور قرآن کی صحیح ومرفوع حدیث نبوی کے ذریعے تفسیر کے مقبول ہونے میں کوئی شک ہے اور نہ ہی ان دونوں قسموں کے تفسیر کے اعلیٰ مرتبہ پر ہونے میں کوئی اختلاف ہے، البتہ قرآن کی تفسیر صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے منقولہ اقوال سے کی جائے تو کئی وجوہ سے اس میں ضعف سرایت کر جاتا ہے:

---

(۱) بشرطیکہ وہ کسی صحیح مرفوع حدیث کے مخالف نہ ہو، البتہ اگر صحابہؓ کی تفاسیر میں باہم اختلاف ہوجائے تو تطبیق ممکن نہ ہونے کی صورت میں مجتہد دلائل کے اعتبار سے مضبوط رائے کو اختیار کر سکتا ہے۔ (برھان واتقان)

(۲) حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اس سلسلہ میں بہترین محاکمہ ذکر کیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تابعینؒ کے درمیان باہم اختلاف نہ ہو تو اُن کی تفسیر بلاشبہ حجت ہوگی، اور اگر اختلاف ہو تو اس آیت کی تفسیر کے لئے قرآن کریم، لغتِ عرب، احادیثِ نبویہ، آثارِ صحابہؓ اور دوسرے شرعی دلائل میں غور کر کے فیصلہ کیا جائے گا۔ (تفسیر ابن کثیرؒ)

(۱) پہلی وجہ: صحیح روایت کا غیر صحیح سے مل جانا اور صحابہ یا تابعین کی جانب منسوب اقوال بغیر سند و تحقیق کے نقل کرنا اور حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کرنے والی روایات کو ذکر کرنا ہے۔

(۲) دوسری وجہ: یہ ہے کہ یہ روایات اسرائیلیات [1] سے لبریز ہیں، اور ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو اسلامی عقائد کے متصادم ہیں، نیز ان کے بطلان پر دلائل قائم ہیں۔، اور یہ وہ روایات ہیں جو اہل کتاب کے ذریعے مسلمانوں میں داخل ہوئی ہیں۔

(۳) تیسری وجہ: غیر معقول مذاہب کے ماننے والوں میں بعض لوگوں نے اقوال گھڑ کر اور بے سرو پا باتیں بنا کر بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف سے منسوب کر لیں! مثلاً شیعانِ علی رضی اللہ عنہ کا انتہا پسند فرقہ کہ جس نے آپ رضی اللہ عنہ کی جانب ایسے ایسے اقوال منسوب کر لئے کہ جن سے آپ یقیناً بری الذمہ ہیں، اسی طرح وہ لوگ جو عباسیوں کے طفیلی رہے ہیں انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی طرف حکام کی چاپلوسی کی خاطر ایسی باتیں منسوب کیں جن کی نسبت ان کی طرف کرنا درست نہ تھا۔

(۴) چوتھی وجہ: بعض دشمنان اسلام ملحدین نے جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف احادیث مبارکہ میں سازشیں کیں اور باتیں گھڑیں، اسی طرح صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے خلاف بھی چالیں چلیں اور اس سے ان کا مقصد دین کے قلعہ کو بے سرو پا اور من گھڑت باتوں کے ذریعے مسمار کرنا تھا، چنانچہ ان وجوہات کی بناء پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف

---

(۱) اسرائیلیات سے مراد وہ روایات ہیں جو یہودیوں یا نصرانیوں سے ہم تک پہنچی ہیں، ایسی رویات تین قسم کی ہیں:

۱......جن کی تصدیق خارجی دلائل سے ہو چکی ہے، یہ روایات قرآن و حدیث کے موافق ہونے کی وجہ سے مقبول ہیں۔

۲......جن کی تکذیب خارجی دلائل سے ہو چکی ہے، یہ روایات نا قابلِ اعتبار ہیں۔

۳......جن کے بارے میں خارجی دلائل سے نہ اُن کا صدق معلوم ہوتا ہو اور نہ ہی کذب، ان کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے: "لَا تُصَدِّقُوْهَا وَلَا تُكَذِّبُوْهَا" "نہ ان کی تصدیق کرو، اور نہ ہی تکذیب"۔

فائدہ: تفسیر کی کتابوں میں جو روایات کعب الاحبارؒ اور وہب بن منبہؒ سے منقول ہیں وہ اکثر اسی قبیل سے ہیں۔ (علوم القرآن)

منسوب اقوال کو قبول کرنے میں انتہائی احتیاط، پرہیز اور تحقیق کی ضرورت ہے۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ کا ''مناھل العرفان'' میں نقطۂ نظر: علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: ''مناھل العرفان'' میں تفسیر بالمأثور کے متعلق بہت عمدہ بات ذکر کی ہے، امام احمد اور ابن تیمیہ رحمہما اللہ سے کئی روایات ذکر کرنے کے بعد علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اور انصاف کی بات اس موضوع میں یہ ہے کہ ''تفسیر بالمأثور کی دو قسمیں ہیں:

ا......ایک یہ ہے کہ اس کی صحت وقبولیت میں دلائل کثیر ہوں، ایسی تفسیر کا رد کرنا کسی شخص کے مناسب ہے اور نہ ہی اس کے ساتھ بے اعتنائی اور غفلت روا ہے، اور یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم اسے قرآن کے رستہ سے دور کرنے کے اسباب میں شمار کریں، بلکہ یہ اس کے برعکس قرآن سے ہدایت پانے کے قوی اسباب میں ایک سبب ہے۔

۲......دوسری یہ ہے کہ جو تفسیر مذکورہ بالا اسباب میں سے کسی سبب یا کسی دوسری وجہ سے صحیح نہ ہو، اس قسم کی تفسیر کا رد کرنا ضروری اور اسے قبول کرنا اور اس میں منہمک ہونا کسی طرح جائز نہیں، بہت سارے محتاط مفسرین مثلاً ابن کثیر رحمہ اللہ وغیرہ کی یہ عادت رہی ہے کہ جس روایت کو وہ نقل کرتے ہیں اس کی صحت کی تحقیق کرتے ہیں اور ان میں سے جو غلط یا ضعیف روایات ہیں انہیں بے سروپا قرار دیتے ہیں۔

مشہور مفسرین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے: ''الاتقان'' میں ذکر کیا ہے کہ تفسیر میں دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت مشہور ہوئے: خلفاء اربعہ حضرت ابن مسعود، حضرت ابن عباس، حضرت اُبی بن کعب، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہم، البتہ خلفاء اربعہ میں سب سے زیادہ روایات حضرت علی بن ابی طالب کرّم اللہ وجہہ سے منقول ہیں، اور باقی تین خلفاء سے بہت ہی کم روایات منقول ہیں، شاید کہ ان کا سبب ان حضرات کا پہلے وفات پانا ہے۔

تاہم تین خلفاء حضرت ابو بکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم سے روایات کے کم ہونے کا سبب تو جیسا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اس پر متنبہ کیا ہے کہ وہ ان کی خلافت کی مدت کے قلیل ہونے اور پہلے وفات پانے کی طرف لوٹتا ہے، اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی زندگی ایسے ماحول اور حلقہ میں گزری جس میں اکثر لوگ کتاب اللہ کے عالم تھے، کیونکہ

وہ لوگ رسول اللہ ﷺ کی صحبت میں رہے تھے، لہذا وہ قرآن کے رازوں سے باخبر اور اس کے معانی واحکام کو جاننے والے تھے۔ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ خلفائے ثلاثہ کے بعد ایسے دور میں زندہ رہے جس میں اسلام کا دائرہ وسیع ہو چکا تھا، بہت سارے عجمی لوگ نئے دین میں داخل ہو چکے تھے اور صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی اولاد کی نئی نسل پروان چڑھ رہی تھی جنہیں قرآن کے مطالعے، اس کے رازوں اور حکمتوں کو سمجھنے کی ضرورت تھی، اور یہی وہ وجوہات تھی جن کی بناء حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بقیہ خلفاء راشدین کے مقابلہ میں زیادہ روایات منقول ہوئیں۔

اور اب ہم تفسیر قرآن میں شہرت پانے والے بعض صحابہ کے بارے میں قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

۱...... حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما حبرُ الامت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اکرم ﷺ کے چچازاد بھائی ہیں، جن کے لیے آنحضرت ﷺ نے ان الفاظ کے ساتھ دعا فرمائی ہے: "اللّٰهم فقّهه في الدين وعلّمه التأويل" "یا اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطا فرما اور انہیں تفسیرِ قرآن کا علم عطا فرما" اور آپ ترجمانِ قرآن کے نام سے ملقب ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: "نعم ترجمان القرآن عبدالله بن عباس" "عبداللہ بن عباس قرآن کریم کے اچھے ترجمان ہیں"۔

آپ رضی اللہ عنہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں قرآن کریم کی تفسیر کو سب سے زیادہ جاننے والے تھے، آپ کے فضل وکمال کے بڑے بڑے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم معترف تھے جبکہ آپ ابھی نوجوان لڑکے تھے، یہاں تک کہ آپ اپنی کم سنی کے باوجود بڑے بڑے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے بحث ومباحثہ کرتے اور انہیں حیرت وتعجب میں ڈال دیتے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ انہیں مجلس شوریٰ میں بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ بٹھا دیتے، صحابہ اُن سے مشورہ کرتے تو کبھی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے بھی بات رکھتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انہیں یہ بلند مقام دینا بعض صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ہاں بحث ومباحثہ کا محرک بھی بنا یہاں تک کہ بعض صحابہ نے تو یہ تک کہہ دیا کہ "یہ نوجوان ہماری مجلس میں کیوں داخل ہوتا ہے جبکہ ہمارے بعض بچے ان سے عمر میں بڑے ہیں؟

ان کا ایک قصہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "صحیح بخاری" میں نقل کیا ہے، جو

ان کی وسعتِ علمی اور قرآن کے لطیف رازوں کی تہ تک پہنچنے میں ان کی عظمتِ شان پر دلالت کرتا ہے۔

بخاری شریف کی روایت: امامِ بخاری رحمہ اللہ نے سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے طریق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے وہ فرماتے ہیں: ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے اکابرینِ بدر کی مجلس میں داخل کیا کرتے تھے جس کو بعض صحابۂ کرام نے دل میں بُرا سمجھا اور کہنے لگے کہ یہ لڑکا ہمارے ساتھ کیوں بیٹھتا ہے جبکہ اس کے برابر کے ہمارے بیٹے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ تو وہ ہے جس سے تم اچھی طرح واقف ہو (یعنی یہ تو وہ ہے جس کی علم وذکاوت سے تم خوب واقف ہو)۔

چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن انہیں بلوایا اور مجھے بھی ان کے ساتھ مجلس میں شامل کرلیا، میں سمجھ گیا کہ اس دن انہوں نے مجھے ان کے ساتھ صرف اس لیے بلایا ہے تاکہ انہیں میری ذکاوت وفطانت دکھلا دیں، تاہم آپؓ نے اُن سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تعبیر کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ ﴿اذا جاء نصر الله والفتح...﴾ ''(اے محمد ﷺ) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے (یعنی واقع ہوجائے)......''۔

تو بعض نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا جو کہ جب ہمیں مدد اور فتح نصیب ہوگئی تو ہم اللہ کی حمد بیان کریں اور اس سے استغفار کی درخواست کریں، جبکہ بعض دوسرے حضرات خاموش رہے اور کچھ نہ کہا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھ سے فرمایا کہ اے ابن عباس! تمہاری بھی یہی رائے ہے؟ تو میں نے جواب دیا کہ نہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ پھر تم کیا کہتے ہو؟ میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی اجل مبارک ہے جو اللہ نے آپ کو بتلادی اور گویا کہ فرمایا: ''(اے محمد ﷺ) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے (یعنی واقع ہوجائے) تو یہ آپ کی رحلت کی علامت ہے، پس اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجیے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ''بخدا! میں بھی اس آیت کا مطلب وہی جانتا ہوں جو تم نے کہا''۔

پس یہ قصہ ایسی قرآنی آیات کے استنباط میں ان کی قوتِ فہم اور مستحکم رائے پر دلالت

کرتا ہے جن کا جاننا علم و دین میں پختہ اور ماہر علماء کا ہی کام ہے، اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے قرآن کے سربستہ رازوں کو سمجھنے میں یہ بلند مقام پالیا؛ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں دین کو سمجھنے کی دعا فرمائی تھی، جیسا کہ شیخین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ذکر کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سینۂ مبارک کے ساتھ لگایا اور فرمایا: ''یا اللہ! اس کو دین کی سمجھ عطاء فرما اور انہیں تفسیر کا علم عطاء فرما''۔ اور ایک روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''اے اللہ! انہیں حکمت کا علم عطا فرما''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو ان کی وسعتِ علمی کی بناء پر ''البحر'' (علوم کا سمندر) سے بھی پکارا جاتا تھا۔

روایت میں آتا ہے کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور اس آیت کا مطلب پوچھنے لگا: ﴿السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا﴾ ''آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے، پھر ہم نے دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا''۔

تو آپ رضی اللہ عنہما نے اس سے فرمایا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے پاس چلے جاؤ اور ان سے اس کا مطلب پوچھو، پھر آکر مجھے بتاؤ! پس وہ شخص چلا گیا اور اُن سے اس آیت کا مطلب پوچھا، تو ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ آسمان پہلے بند تھا کہ بارش نہ برساتا تھا اور زمین بھی بند تھی کہ نباتات نہ اُگاتی تھی پھر اس کو بارش اور اُس کو نباتات کے ساتھ اللہ نے کھول دیا۔

تو وہ شخص حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس واپس آیا اور اُن کی جواب سنا دیا، تو حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میں پہلے کہا کرتا تھا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرآن کریم کی تفسیر میں دلیری و بے خوفی مجھے اچھی نہیں لگتی، لیکن اب میں نے جان لیا کہ اسے خصوصی علم سے نوازا گیا ہے''۔

اور روایت ہے کہ: ''حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک دن صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ تمہاری کیا رائے ہے کہ یہ آیت کس شخص کے متعلق نازل ہوئی ہے: ﴿اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ...﴾ ''کیا تم میں سے کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کے لئے کھجوروں اور انگوروں کا کوئی باغ ہو''۔ انہوں نے کہا کہ اللہ زیادہ جانتے ہیں، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ غصہ میں آگئے اور فرمایا کہو جانتے ہیں یا نہیں جانتے، اس پر حضرت

ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: میرے دل میں اس کے متعلق ایک بات ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اے بھتیجے! کہو اور اپنے نفس کو حقیر مت سمجھو! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ ایک عمل کی مثال بیان کی گئی ہے، تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کون سے عمل کی؟ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما نے فرمایا کہ ایسے مالدار شخص کی مثال ہے جو اللہ کی فرمانبرداری کے اعمال بجالاتا ہے، پھر اس کے لیے شیطان بھیج دیا جاتا ہے تو وہ اس قدر گناہوں کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے کہ اپنے گزشتہ اعمال کو بھی غارت کر دیتا ہے''۔ رواہ البخاری۔

یہ تمام باتیں اور ان جیسی بہت سی دوسری باتیں نوعمری ہی سے آپؓ کی علمی رسائی اور عمدہ رائے پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اسی وجہ سے آپؓ کا شمار بڑے بڑے جلیل القدر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی صفوں میں ہونے لگا اور انہیں بذاتِ خود کبار صحابہ کے اعتراف سے ''حبرُ الامۃ'' (امت کے زبردست عالم) کے لقب سے پکارا جانے لگا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے اساتذہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے وہ اساتذہ جن کے علوم سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد سیراب ہوئے اور ان کا آپؓ کی رہنمائی اور تعلیم وتربیت میں نمایاں اثر تھا یہ ہیں: حضرت عمر بن خطاب اور اُبی بن کعب اور علی بن اَبی طالب اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں، اور یہ پانچوں آپؓ کے ان خاص اساتذہ میں سے ہیں جن سے آپ نے اپنا زیادہ تر علم حاصل کیا اور اپنی تعلیم کا ایک بڑا حصہ پایا، اور ان حضرات کا آپ کی اس مستحکم علمی سمت کی طرف رہنمائی کرنے میں گہرا اثر ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے تلامذہ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے تابعین کی ایک بڑی جماعت نے علم حاصل کیا ہے، آپؓ کے معروف شاگردوں میں سے سب سے زیادہ مشہور تلامذہ جنہوں نے ان کی تفسیر اور وسیع علم کو نقل کیا ہے یہ ہیں: حضرت سعید بن جبیر، حضرت مجاہد بن جبر خزرمی، حضرت طاؤس بن کیسان یمانی، حضرت عکرمہ مولی بن عباس اور حضرت عطاء بن اَبی رباح رحمہم اللہ ہیں، اور یہ حضرات آپؓ کے ان نمایاں شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے تفسیر میں مدرسۂ ابن عباسؓ کو ہم تو پہنچایا، اللہ تعالیٰ ان سب سے راضی ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا شمار ان جلیل القدر صحابہ میں ہوتا ہے جنہوں نے تفسیر میں شہرت پائی اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے آثار واقوال کو ہم

تک پہنچایا ہے، آپؓ پہلے پہل اسلام لانے والوں میں سے ہیں، ان چھ مسلمانوں میں سے چھٹے شخص ہیں کہ جب روئے زمین پر ان کے علاوہ دوسرا کوئی مسلمان نہ تھا، رسول اکرم ﷺ کے خادم تھے، آپ ﷺ کو نعلین مبارک پہناتے اور آپ کے ساتھ اور آگے چلتے اور اسی نبوی تعلق کی بناء پر آپؓ بہترین معلم اور مُربی بن کر اُبھرے، اسی لئے آپؓ کا شمار کتاب اللہ، اس کے محکم ومتشابہ اور حلال وحرام کی معرفت کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سب سے زیادہ جاننے والوں میں ہوتا ہے۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے تفسیر میں مرویات حضرت علی کرّم اللہ وجہہ سے زیادہ ہیں، شیخینؒ نے ان سے روایت ذکر کی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ''اس ذات کی قسم جس کے سواء کوئی معبود نہیں، کتاب اللہ میں کوئی بھی سورت نازل نہیں ہوئی مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہ وہ کہاں نازل ہوئی، اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کی کتاب میں کوئی آیت نازل ہوئی ہوگی مگر یہ کہ میں جانتا ہوں کہ کس بارے میں نازل کی گئی، اور مجھے ایسے شخص کا پتہ معلوم ہو جائے جو کتاب اللہ کو مجھ سے زیادہ جانتا ہو تو میں اس کے پاس ضرور جاؤں گا بشرطیکہ اس کی جگہ تک اونٹنیاں جا سکتی ہوں''۔ آپؓ سے بہت سے تابعین نے روایات نقل کی ہیں۔

دوسری قسم۔تفسیر معقول: تفسیر بالروایۃ پر سیر حاصل گفتگو کرنے کے بعد اب ہم تفسیر بالدرایۃ کی طرف آتے ہیں۔ اس نوع کو علمائے مفسرین کے ہاں ''تفسیر بالراء'' اور ''تفسیر بالمعقول'' بھی کہا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس میں کتاب اللہ کی تفسیر کرنے والا اپنے اجتہاد کا سہارا لیتا ہے، نہ کہ صحابہ یا تابعین سے منقولہ تفسیر کا، بلکہ اس میں اعتماد عربی زبان پر ہوتا ہے، نیز اہل عرب کے طریقہ پر اسلوبِ عربی کو سمجھنے، ان کے ہاں اندازِ تخاطب کو جاننے اور ان علوم ضروریہ کی معرفت پر اعتماد کیا جاتا ہے جس کا جاننا ہر تفسیر قرآن کا ارادہ کرنے والے کیلئے ضروری ہے، مثلاً: علم نحو، علم صرف، علوم بلاغت،، اصول فقہ، اسباب نزول کی معرفت اور اس کے علاوہ ہر وہ علم جس کی جانب مفسر محتاج ہوتا ہے، جیسا کہ ان علوم کو عنقریب ہم بیان کریں گے۔ (انشاء اللہ)

تفسیر بالرائے کا معنی: رائے سے مراد وہ اجتہاد ہے جو اصولِ صحیحہ اور مُسلَّمہ قواعدِ سلیمہ پر

مبنی ہوتا ہے، جو بھی تفسیر قرآن میں مشغول ہونے کا ارادہ کرے، یا اس کے معانی کے بیان کرنے کے درپے ہو تو اس کیلئے ضروری ہے وہ ان امور کو حاصل کرے۔ اور رائے سے مراد محض رائے یا صرف خواہش نفسانی، یا انسان کے دل میں آنے والے خیالات یا اپنی چاہت کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنا نہیں۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جس شخص نے قرآن کی تفسیر میں اصول صحیحہ سے استدلال کئے بغیر جو اس کے وہم میں آئی یا دل پر اس کا گزر ہوا تو وہ شخص خطا کار اور قابل مذمت ہے۔ اور یہ حدیث شریف بھی اسی بات پر محمول ہے: ''جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنالے، اور جس نے قرآن میں اپنی رائے زنی کی تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔ اور آپ علیہ السلام کا فرمان ہے: ''جس نے قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہا اور وہ بات صحیح بھی نکلی تب بھی وہ غلطی کا مرتکب ہوا''۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الجامع لاحکام القرآن'' کے مقدمہ میں فرمایا ہے یوں فرمایا ہے کہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت: ''من قال في القرآن برأيه فليتبوأ مقعده من النار'' کی دو تفسیریں بیان کی گئی ہیں:

پہلی تفسیر: جس شخص نے مشکل قرآن کے بارے میں وہ بات کہی جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا مذہب معلوم ہوا اور نہ ہی تابعین کا تو وہ اللہ کی ناراضگی مول لینے والا ہے۔

دوسری تفسیر: جس نے قرآن میں ایسی بات کہی کہ وہ جانتا ہے کہ حق اس کے علاوہ ہے تو وہ جہنم اپنا ٹھکانہ بنادے۔

اور علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے دوسرے قول کو ترجیح دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ قول معنی کے اعتبار سے دونوں قولوں میں سے زیادہ مستحکم اور صحیح ہے، پھر فرماتے ہیں کہ حدیث جندب رضی اللہ تعالیٰ عنہ ''من قال في القرآن برأيه فاصاب فقد أخطأ'' کو بعض اہل علم حضرات نے اس بات پر محمول کیا ہے رائے سے مراد خواہش نفسانی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ جس نے قرآن میں ایسی بات کہی جو اس کی خواہش کے مطابق ہو، نیز اسے ائمۂ سلفِ صالحین سے بھی نہ لیا ہو پھر وہ صحیح بھی نکلے تو وہ شخص خطاوار ہوگا؛ کیوں کہ قرآن کے بارے میں اس نے ایسا فیصلہ کیا ہے جس کی اصل سے وہ ناواقف ہے اور علمائے حدیث کے اس

بارے میں کہے گئے اقوال سے نابلد ہے۔

اور ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص سے کتاب اللہ کے کسی معنی کے متعلق دریافت کیا جائے تو وہ علماء کے اقوال اور علم نحو واصول وغیرہ کے قوانین میں غور کیے بغیر اپنی رائے اس پر ٹھونس دے۔ اور اس حدیث میں وہ تفسیر داخل نہیں جو کہ اہل لغت اس کی لغت، نحوی حضرات اس کی نحو اور فقہائے کرام اس کے معانی واحکام کی تفسیر کرتے ہیں، اور ہر ایک اپنے اجتہاد کے مطابق تفسیر کرتا ہے جو کہ علم و نظر کے قوانین پر مبنی ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس صفت کے ساتھ تفسیر کرنے والا محض اپنی رائے زنی کرنے والا نہیں۔

تفسیر معقول کی اقسام: اور اسی بنا پر تفسیر معقول کی دو قسمیں بن سکتی ہیں:

۱)۔ تفسیر محمود۔ ۲)۔ تفسیر مذموم۔

تفسیر محمود: وہ تفسیر ہے جو شارع کی غرض کے موافق، جہالت وگمراہی سے دور، عربی زبان کے قوانین کے ساتھ چلنے والی، اور قرآن کریم کے نصوص کے سمجھنے میں عربی اسالیب کا سہارا لینے والی ہو۔ چنانچہ جو شخص اپنی رائے (یعنی اجتہاد) سے قرآن کی تفسیر کرتا ہے، لیکن کتاب اللہ کے معانی کے بارے میں اپنی رائے کی صورت میں ان مذکورہ شرطوں کو لازم سمجھتا ہے اور ان پر اعتماد کرتا ہے تو اس کی تفسیر مستحسن، خوشگوار اور اس لائق ہے کہ اسے ''تفسیر محمود'' یا ''تفسیر مشروع'' کے لقب سے نوازا جائے۔

تفسیر مذموم: یعنی بغیر علم کے یا لغت وشرع کے قوانین سے ناواقف ہونے کے باوجود قرآن کی تفسیر خواہشاتِ نفسانیہ کے مطابق کرنا، یا اللہ کے کلام کو اپنے باطل مذہب اور گمراہ کن بدعت پر محمول کرنا، یا اللہ نے جس معنی کو اپنے علم کے ساتھ خاص کیا ہے اس میں خوشہ چینی کرنا، اور یقین سے کہنا کہ اللہ کے اس کلام سے فلاں فلاں معنی مراد ہے۔ تفسیر کی اس نوع کو ''تفسیر مذموم'' یا ''تفسیر باطل'' کہا جاتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ تفسیر محمود وہ تفسیر ہے جس کا کرنے والا لغت کے قوانین سے واقف اور اس کے اسالیب کو جاننے والا ہو، نیز شرع کے قوانین پر بصیرت تامہ رکھتا ہو۔ اور تفسیر باطل یا مذموم وہ تفسیر ہے جو خواہشات کی پیداوار ہو اور جہالت وگمراہی پر مبنی ہو۔

تفسیر مذموم کی مثال: ارشاد باری تعالیٰ ہے:﴿یوم ...﴾

ترجمہ: ''جس روز ہم تمام آدمیوں کو ان کے نامۂ اعمال سمیت بلاویں گے''

علم کے دعویدار بعض جاہلوں سے مروی ہے کہ اس آیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن لوگوں کی پردہ پوشی کیلئے انہیں ان کی ماؤں کے ناموں کے ساتھ پکاریں گے۔ پس اس جاہل مفسر نے ''امام'' کی تفسیر ''اُمہات'' (ماؤں) سے کی ہے، اور ''امام'' کو ''اُم'' کی جمع سمجھا ہے، باوجودیکہ عربی لغت اس کا انکار کر رہی ہے؛ کیوں کہ ''اُم'' کی جمع ''اُمہات'' آتی ہے۔ ارشاد گرامی ہے:﴿وأمهاتكم...﴾

ترجمہ: ''اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تم کو دودھ پلایا ہے''۔

اور ''اُم'' کی جمع ''امام'' نہیں؛ کیوں کہ یہ لغت وشرع دونوں اعتبار سے باطل ہے۔ البتہ یہاں آیت میں ''امام'' سے مراد امت کا ''متبوع نبی'' ہے، یا مراد ''اعمال نامہ'' ہے۔ اور اس پر دلیل تتمۂ آیت ہے:﴿فمن...﴾

ترجمہ: ''پھر جس کا نامۂ اعمال اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا، ایسے لوگ اپنا نامۂ اعمال پڑھیں گے اور ان کا ذرا نقصان نہ کیا جائے گا''۔

پس جب انسان لغت کے قواعد کو جانتا ہے اور نہ ہی عربی کے اصولوں کو تو وہ اندھی اونٹنی کی طرح بے راہ چلتا ہے، اور کمزور رائے وناقص فہم کا مالک ہوتا ہے، اور اسی طرح جو شخص شریعت کی غرض کو نہیں سمجھتا، تو جہالت وگمراہی کے گڑھے میں جا گرتا ہے، مثلاً وہ شخص جو آیت مبارکہ کے صرف ظاہر ہی کو لیتا ہے۔ وہ آیت یہ فرمانِ الٰہی ہے:﴿ومن...﴾

ترجمہ: ''اور جو شخص دنیا میں (راہ نجات دیکھنے سے) اندھا رہے گا وہ آخرت میں بھی (منزل نجات تک پہنچنے سے) اندھا رہے گا''۔

لہٰذا وہ ہر اندھے پر بدبختی، خسارہ اور جہنم میں دخول کا حکم لگا بیٹھتا ہے، باوجودیکہ آیت مبارکہ میں اندھے پن سے مراد آنکھ کا نابینا پن نہیں بلکہ اس سے مراد دل کا بصیرت نہ رکھنا ہے، اور اس پر دلیل اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گرامی ہے:﴿فإنها...﴾

ترجمہ: ''بات یہ ہے کہ (نہ سمجھنے والوں کی کچھ) آنکھیں اندھی نہیں ہوجایا کرتیں، بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہوجایا کرتے ہیں''۔

اور بعض دفعہ تو آنکھوں کا اندھا پن بھی انسان کی سعادت کا سبب ہوتا ہے جیسا کہ حدیثِ قدسی میں آیا ہے: ''جس کو میں نے اس کی دو محبوب چیزیں (یعنی آنکھیں) لیکر آزمائش میں ڈالا پھر اس نے صبر کیا تو میں اس کے بدلہ میں اسے جنت عطا کرونگا''۔

عنقریب ہم غرائب التفسیر کے بارے میں بحث کرتے ہوئے تفسیر باطل کے چند نمونے اور مثالیں بیان کریں گے، لہٰذا وہیں ملاحظہ کیا جائے۔

تفسیر کے اصول و مآخذ: وہ امور جن کی طرف تفسیر معقولی میں رائے کی نسبت کرنا مناسب اور ضروری ہے، ان کی اصل چار چیزیں ہیں جیسا کہ علامہ زرکشی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''البرھان'' اور سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں ان کو ذکر کیا ہے۔ ہم انتہائی اختصار کے ساتھ ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

۱- موضوع اور ضعیف احادیث سے بچتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے نقل کرنا۔

۲- تفسیر میں صحابی کے منقول قول کو لینا؛ کیوں کہ یہ حدیث مرفوع کے حکم میں ہوتا ہے۔

۳- جس کی گنجائش عربی زبان نہ رکھے اس کو ترک کرتے ہوئے مطلق لغت کو لینا؛ کیونکہ قرآن صاف عربی میں نازل ہوا ہے۔

۴- عربی کلام کے موافق بات کو لینا جو کہ شرعی قانون کا بھی مدلول ہو، اور یہی وہ بات ہے جس کی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے اپنے اس ارشاد میں دعا فرمائی ہے: ''اے اللہ! اسے دین کی سمجھ عطا فرما اور اسے علم تفسیر سکھا دے''۔

مفسر کے لیے ضروری اور لازمی علوم: کتاب اللہ کی تفسیر بیان کرنے والا علوم و معارف کی چند ایسی انواع کا محتاج ہوتا ہے جن کا اس کے اندر پایا جانا نہایت ضروری ہے، تا کہ وہ تفسیر کا اہل بن سکے، ورنہ وہ مفسر سابقہ وعید (من قال فی القرآن برأیہ فلیتبوأ مقعدہ من النار) میں داخل ہوگا، اور علمائے کرام نے علوم کی ان انواع کو ذکر کیا ہے جن کا مفسر میں پایا جانا ضروری ہے۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں ان علوم کو پندرہ کی تعداد تک پہنچا دیا ہے۔ ہم درج ذیل میں اختصار کے ساتھ انہیں بیان کرتے ہیں:

۱- عربی زبان اور اس کے قواعد یعنی علم نحو، علم صرف اور علم اشتقاق کو جاننا۔

۲-علوم بلاغت یعنی علم معانی، علم بیان اور علم بدیع کو جاننا۔

۳-اصولِ فقہ یعنی خاص و عام اور مجمل و مفصل وغیرہ کو جاننا۔

۴-اسبابِ نزول کی معرفت۔

۵-ناسخ و منسوخ کا علم۔

۶-علم قراءت کی معرفت۔

۷-علمِ وہبی۔

۱-علمِ اوّل: وہ عربی زبان اور اس کے متعلقات جیسے صرف، نحو اور اشتقاق کا علم ہے، پس اس کا جاننا ہر مفسر کے لیے ضروری ہے؛ کیوں کہ مفردات و تراکیب کی معرفت کے بغیر آیت کا سمجھنا کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے؟! کیا ''ایلاء'' اور ''تربص'' کے لغوی معنی جانے بغیر کوئی شخص اللہ کے اس ارشاد کی تفسیر بیان کر سکتا ہے: ﴿للذین...﴾

ترجمہ: ''جو لوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی بیبیوں (کے پاس جانے) سے ان کے لیے چار مہینے تک مہلت ہے۔ سو اگر یہ لوگ (قسم توڑ کر عورت کی طرف) رجوع کر لیں تب تو اللہ معاف کر دیں گے، رحمت فرما دیں گے''۔

امام مالک رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر عربی لغت کو نہ جاننے کے باوجود کتاب اللہ کی تفسیر کرنے والا میرے روبرو لایا گیا تو میں عبرت ناک سزا دونگا''۔

مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا: ''جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھے اس کیلئے جائز نہیں کہ وہ اہل عرب کی زبان کو نہ جاننے کے باوجود کتاب اللہ میں گفتگو کرے''۔

چنانچہ جب لفظ لغوی معنی کے ساتھ موافقت نہیں رکھے گا تو وہ تفسیر باطل ہوگی۔ مثلاً بعض روافض نے اللہ کے اس ارشاد میں دو دریاؤں کی تفسیر حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما سے کی ہے: ﴿مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ﴾ ''اسی نے دو دریاؤں کو (صورۃً) ملایا کہ (ظاہر میں) باہم ملے ہوئے ہیں''۔

اور اس فرمان الٰہی میں ''لؤلؤ'' اور ''مرجان'' سے مراد حسن و حسین رضی اللہ عنہما لیے ہیں: ﴿يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ﴾ ''ان دونوں سے موتی اور مونگا برآمد ہوتا ہے''۔

اور اسی طرح اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں فرعون کی تفسیر ''قلب'' سے کرتے ہیں، اور ''قلب'' سے سخت دل انسان کا دل مراد لیتے ہیں:

﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾ ''تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے''۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''اس قسم کی تفسیر کو بعض واعظین صحیح مقاصد میں تحسین کلام اور سامعین کو رغبت دلانے کیلئے استعمال کرتے ہیں جبکہ یہ ممنوع ہے؛ کیوں کہ یہ لغت میں قیاس کرنا ہے جو کہ ناجائز ہے۔ اور یہ تفسیر معقولی کی ممانعت کی دو وجوہ میں سے ایک وجہ ہے۔

اور ''علم نحو'' کا جاننا بھی مفسر کے لیے ضروری ہے؛ کیوں کہ معنی میں حرکات کے تغیر سے بہت بڑی تبدیلی آجاتی ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: ﴿اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا﴾ لفظ ﴿اللہ﴾ کے ھا پر نصب اور ﴿العلماء﴾ کے ہمزہ پر رفع ہے، اور اس صورت میں معنی صحیح ہے؛ کیوں کہ اس صورت میں آیت کریمہ کا مطلب ہے: ''اللہ سے ڈرنیوالے بندے وہی ہیں جو (اس کی عظمت کا) علم رکھتے ہیں نہ کہ دوسرے کوئی''۔ لہٰذا جس قدر جو شخص اللہ کی معرفت میں ترقی کرے گا اسی قدر اللہ سے اس کے خوف میں بھی اضافہ ہوگا، اور اگر حرکات کو اس کے برعکس کر دیا جائے اور لفظ ﴿اللہ﴾ کے ھا کو ضمہ اور ﴿العلماء﴾ کے ہمزہ کو نصب دے دیا جائے تو معنی فاسد ہو جائے گا۔

ایک دلچسپ قصہ: علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں ''عدم اللحن فی القرآن'' کے ذیل میں اس قصہ کو ذکر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ ایک دیہاتی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں مدینہ منورہ آیا اور اس نے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب میں سے کون مجھے پڑھائے گا؟ راوی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اسے سورۂ براءت پڑھانا شروع کی، جب آیت مبارکہ: ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ﴾ میں ﴿رسولُه﴾ میں لام کے ضمہ کے بجائے لام کے جر کے ساتھ پڑھ کر سنایا تو دیہاتی نے کہا کہ کیا اللہ اپنے رسول سے بری ہے؟! جب اللہ اپنے رسول سے بری ہے تو میں بھی اس کے رسول سے بری ہوں!

یہ بات لوگوں پر بڑی شاق گذری، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جب دیہاتی کا یہ کلام پہنچا تو

اسے بلایا اور کہا: ''کہ اے اعرابی! کیا تو رسول اللہ ﷺ سے براءت کا اظہار کرتا ہے؟ تو اس نے کہا: یا امیر المؤمنین! میں مدینہ آیا تو قرآن سے ناواقف تھا، چنانچہ میں نے پوچھا کہ کون مجھے قرآن پڑھائے گا؟ تو اس شخص نے مجھے سورۂ براءت پڑھانا شروع کی، اور اس نے جب یہ آیت: ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ وَرَسُوْلِهٖ﴾ تلاوت کی تو میں نے کہا کہ آیا اللہ اپنے رسول سے بری ہیں؟! اگر اللہ اپنے رسول سے بری ہیں تو میں بھی اس کے رسول سے براءت کا اعلان کرتا ہوں! اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ''اے اعرابی! آیت اس طرح نہیں ہے، دیہاتی نے کہا: یا امیر المؤمنین! تو آیت پھر کس طرح ہے؟ تو آپ نے آیت تلاوت فرمائی: ﴿اَنَّ اللّٰهَ بَرِیْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ﴾ چنانچہ دیہاتی نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں بھی ان سے براءت کا اعلان کرتا ہوں جن سے اللہ اور اس کے رسول بری ہیں۔ میں بھی مشرکین سے بیزار ہوں ...... چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ آئندہ لوگوں کو قرآن وہ شخص بڑھائے جو لغت کو جانتا ہو، اور ابوالاسود رضی اللہ عنہ کو نحو کی تدوین کا حکم دیا، چنانچہ انہوں نے علم نحو کو با قاعدہ طور پر لکھا۔

اسی طرح علم صرف اور علم اشتقاق کا جاننا بھی مفسر کیلئے لازم ہے؛ تاکہ کوئی شخص شب کور اونٹنی کی طرح بے راہ نہ چلے، علامہ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ انوکھی تفاسیر میں سے اس شخص کا قول بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ''امام'' کو ''اُم'' کی جمع قرار دیتا ہے: ﴿یَوْمَ نَدْعُوْا كُلَّ اُنَاسٍۭ بِاِمَامِهِمْ﴾ اور کہتا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو اپنے باپوں کے ناموں کے بجائے ماؤں کے نام سے پکارا جائے گا، علامہ فرماتے ہیں کہ یہ فحش غلطی ہے اور اس کا موجب قائل کی علم صرف سے جہالت ہے؛ کیوں کہ ''اُم'' کی جمع ''امام'' نہیں آتی۔

۲-علم دوم: رہا علوم معانی، بیان اور بدیع کا جاننا تو کتاب اللہ کی تفسیر کا ارادہ کرنے والے کیلئے ان کا جاننا بھی نہایت ضروری ہے؛ کیوں کہ مفسر کیلئے اعجاز کے مُقتضی کی رعایت کرنا ناگزیر ہے، اور اس رعایت کا ادراک ان علوم کے جاننے ہی پر موقوف ہے۔

مثلاً ارشاد پاک ہے: ﴿وَاُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ﴾ مطلب یہ ہے کہ ان کے قلوب میں وہی گوسالہ کی محبت پیوست ہوگئی تھی۔ تو یہاں مضاف محذوف ہے۔ اور اسی

طرح ارشاد ہے:﴿واسأل القریة﴾ ''قریہ'' سے مراد ''اہل قریہ'' ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ ''وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو''۔ حقیقت پر محمول نہیں، بلکہ یہاں استعارہ ہے۔ چنانچہ جیسے لباس انسان کے ستر کو ڈھانپتا اور اسے حسن و جمال بخشتا ہے اسی طرح میاں بیوی میں سے بھی ہر ایک دوسرے کے لیے لباس کی طرح ہے کہ اسے حسن و جمال سے نوازتا اور اس کی تکمیل کرتا ہے۔ یہ استعارہ شاندار اور بہترین کلام کی ایک قسم ہے۔ جب کوئی شخص اس آیت کے معنی کو اس کے ظاہر پر محمول کرے گا تو معنیٰ فاسد ہو جائے گا۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فرانسیسیوں نے قرآن کا اپنی زبان میں ترجمہ کرنا چاہا، جب اس آیت کریمہ تک پہنچے تو: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ تو انہوں نے اس کا ظاہری ترجمہ کیا اور اس میں پوشیدہ دقیق راز کو نہ پا سکے، چنانچہ ان کا ترجمہ بالآخر اس طرح تھا: ''وہ تمہاری پینٹ پتلون ہیں اور تم ان کی پینٹ پتلون ہو''۔ کیوں کہ ان کے ہاں لباس کو پتلون کہا جاتا ہے، اسی طرح ان کی سمجھ نے غلطی کھائی اور قرآن کی عمدہ تعبیر کا ادراک نہ کر سکے۔

اسی کے قریب قریب ایک دیہاتی کا واقعہ ہے کہ جب اس نے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد سنا:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ﴾

''اور کھاؤ، پیو (بھی) اس وقت تک کہ تم کو سفید خط (یعنی نور) متمیز ہو جائے سیاہ خط سے''۔

تو اس نے سیاہ اور سفید دو رنگ کے دھاگے لیے اور ان کی طرف دیکھ دیکھ کر کھاتا رہا یہاں تک سورج طلوع ہونے کے قریب ہو گیا! وہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور اس کی خبر دی تو آپ علیہ السلام نے اسے ارشاد فرمایا: ''کہ تو تو چوڑی گدی والا ہے (یعنی نااندیش ہے)، اس سے مراد تو دن کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔

قرآن کریم میں استعارہ، کنایہ اور مجاز کی اور بھی بہت ساری مثالیں ہیں جن کے سمجھنے کیلئے علم بیان و بدیع کا جاننا از حد ضروری ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا نوح علیہ السلام کی کشتی کے متعلق ارشاد ہے: ﴿تجری بأعیننا﴾ اور ارشاد پاک ہے: ﴿قدم صدق﴾، ﴿لسان

صدق﴾ ،﴿جناح الذل﴾ یہ تمام اوران جیسے دوسرے ارشادات کا سمجھنا علوم بلاغت اوررازہائے بیان کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

۳-۶۔علم سوم تا ششم: اسی طرح بقیہ علوم یعنی اصول فقہ، اسباب نزول، ناسخ ومنسوخ اورعلم قراءت تمام کے تمام وہ علوم ہیں جن کا جاننا کتاب اللہ کی تفسیر کرنے والے کیلئے ناگزیر امر ہے؛ تاکہ سمجھنے میں اس سے لغزش نہ ہواوران ضروری امور سے جہالت کے سبب اس کا پاؤں نہ پھسلے۔ ۷۔علم ہفتم

اورجہاں تک علم وہبی کی بات ہے تواس سے مراد''علم لدنی وربانی'' ہے:

﴿وعلمنٰه...﴾

ترجمہ:''اورہم نے ان کواپنے پاس سے ایک خاص طور کاعلم سکھایا تھا''۔

یہ وہ علم ہے جسے اللہ تعالیٰ اپنے علم پر عمل کرنے والے کوعطا کرتے ہیں، اوراس کا دل اپنے رازوں کے سمجھنے کیلئے کھول دیتے ہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:﴿واتقوا اللّٰه...﴾

ترجمہ:'' اورخدا سے ڈرو، اوراللہ تعالیٰ (کاتم پراحسان ہے کہ)تم کوتعلیم فرماتا ہے''۔

تو یہ علم تقویٰ واخلاص کا نتیجہ وثمرہ ہے، اس علم کووہ شخص نہیں پاسکتا جس کے دل میں ذراسی بھی بدعت، یا تکبر، یادنیا کی محبت کی آمیزش ہو، یا گناہوں کی طرف کچھ میلان ہو۔اللہ تعالیٰ کافرمان ہے:﴿سَأَصْرِفُ...﴾

ترجمہ:'' میں ایسے لوگوں کواپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا، جودنیا میں تکبر کرتے ہیں، جس کاان کوکوئی حق حاصل نہیں''۔

اورامام شافعی رحمہ اللہ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے:ـــہ

شکوت...وأخبرني...

''میں نے اپنے استادوکیع سے حافظہ کی کمزوری کی شکایت کی ☆ توانہوں نے مجھے گناہوں کے چھوڑنے کامشورہ دیا۔

اورمجھے بتایا کہ علم ایک نورالٰہی ہےاوراللہ تعالیٰ کانورکسی نافرمان کوعطانہیں کیاجاتا۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:''شاید کہ آپ علم وہبی کومشکل گردانیں اورکہیں

کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان کی قدرت سے باہر ہے، جبکہ یہ تو ہم صحیح نہیں جیسا کہ کہ آپ نے سمجھا ہے۔ اس کے حصول کا طریقہ عمل اور خدا ترسی کے ان اسباب کا اختیار کرنا ہے جو اس علم کے موجب ہیں''۔

پھر فرمایا کہ: ''قرآنی علوم اور قرآن سے مستنبط ہونے والے مسائل ایک بحر ناپیدا کنار ہیں، تاہم یہ علوم جو ہم نے بیان کیے ہیں مفسر کیلئے آلہ کا درجہ رکھتے ہیں، ان کی تحصیل کے بغیر کوئی مفسر نہیں بن سکتا۔ چنانچہ جو شخص ان علوم کے حصول کے بغیر تفسیر کرے گا وہ ممنوعہ رائے کے ذریعے تفسیر کرنے والا شمار ہوگا۔ اور یہ شروط جو علماء نے ذکر کی ہیں تفسیر کے اعلیٰ مرتبہ کے حصول کے لیے ہیں، اور یہاں کچھ عام مفاہیم و معانی بھی ہیں جسے انسان قرآن کریم کے الفاظ کو سنتے ہی سمجھ لیتا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو آسان بنا دیا ہے، اور اپنی مقدس کتاب میں تدبر اور اس سے نصیحت لینے کا حکم دیا ہے: ﴿أفلا...﴾ ''تو کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے''۔ اور یہ تفسیر کا ادنیٰ درجہ ہے اور اللہ ہی توفیق بخشنے والے ہیں''۔

مراتب تفسیر: شیخ محمد عبدہ مرحوم نے تفسیر کو دو درجات میں تقسیم کیا ہے:

ا۔ اعلیٰ درجہ ۲۔ ادنیٰ درجہ

اعلیٰ درجہ: پہلا درجہ جو کہ اعلی ہے چند امور سے پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے:

۱) قرآن میں موجود الفاظ کے حقائق کی معرفت اہل لغت کے طریقۂ استعمال کے اعتبار سے۔

۲) عالی شان اسالیب سے واقفیت، اور یہ فصیح کلام کے استعمال و تمرین اور اس کی باریکیوں اور محاسن کو جاننے سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

۳) انسانیت کے حالات کا علم، قوموں کی ترقی اور قوت و ضعف، عزت و ذلت اور ایمان و کفر کے مابین ان کے احوال میں ردوبدل کے متعلق تکوینی سنن الٰہیہ کو جاننا۔

۴) انسانیت کی قرآنی رہنمائی کے طریقے کی معرفت اور جاہلیت میں عرب کی بدبختی اور گمراہی کے احوال کا علم۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ''اسلام کی فضیلت سے وہ شخص واقف نہیں ہو سکتا جو جاہلیت کی زندگی کا مطالعہ نہ کرے''۔

۵) حضور ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کی سیرت، اور دینی و دنیوی امور میں ان کے علم وعمل اور کردار کا جاننا۔

ادنیٰ درجہ: تفسیر کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ انسان کے سامنے وہ بات ظاہر ہو جائے جو اس کے دل کو اللہ کی تعظیم وتقدیس سے سیراب کر لے اور اس کے نفس کو برائی سے روک کر بھلائی کی طرف ہانک کر لے جائے۔ اور یہ درجہ ہر ایک کو حاصل ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿ولقد...﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے قرآن نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کر دیا ہے، سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟''۔

تفسیر کی صورتیں: علامہ سیوطی رحمہ اللہ ابن جریر رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے متعدد طرق سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنھما سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے فرمایا کہ تفسیر کی چار صورتیں ہیں:

۱- ایک صورت وہ ہے جسے عرب اپنے کلام سے جان لیتے ہیں۔
۲- دوسری تفسیر وہ ہے جس سے ناواقفیت کسی ایک کے لیے بھی قابل عذر نہیں۔
۳- تیسری تفسیر وہ ہے جسے صرف علماء ہی جانتے ہیں۔
۴- چوتھی تفسیر وہ ہے جسے اللہ تبارک وتعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔

تفسیر معقول کے جواز کے متعلق علمائے کرام کے اقوال: تفسیر بالرأی کا معنی اور اس کی شرائط جاننے کے بعد اب ہم اس کے متعلق علماء کے اقوال اور اس کے جواز اور عدم جواز کے قائلین میں سے ہر ایک کے دلائل ذکر کرتے ہیں؛ تاکہ تپتی دوپہر کے سورج کی طرح حق بالکل ظاہر اور روشن ہو جائے۔ پس ہم اللہ سے ہی مدد طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

رائے سے مراد یہاں اجتہاد ہے، سو اس بنا پر تفسیر بالرأی کا معنیٰ یہ ہوگا کہ کلام عرب اور ان کے باہم اسلوبِ خطاب کو جاننے اور عربی الفاظ اور ان کے طریقہائے دلالت کی معرفت کے بعد مفسر اجتہاد کے ذریعے قرآن کی تفسیر کرتا ہے۔ علماء کے تفسیر معقول کے جواز کے بارے میں دو مکتبِ فکر ہیں:

پہلا مکتبِ فکر: تفسیر معقول کے عدم جواز کا ہے؛ کیوں کہ تفسیر سماع پر موقوف ہے، (جبکہ رائے کا سماع میں کوئی دخل نہیں) اور یہ علماء کے ایک گروہ کی رائے ہے۔

دوسرا مکتبِ فکر: مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ تفسیر معقول کے جواز کا ہے، اور یہ جمہور علماء کی رائے ہے۔

مانعین کے دلائل: تفسیر معقول سے منع کرنے والے حضرات چند دلائل سے استدلال کرتے ہیں جن کا ہم درج ذیل میں خلاصہ پیش کرتے ہیں:

پہلی دلیل: تفسیر معقول بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کی طرف کسی بات کو منسوب کرنا ہے، جبکہ اس سے اللہ کے اس فرمان میں منع کیا گیا ہے: ﴿وأن...﴾

"(شیطان یہ بھی تعلیم کرتا ہے) کہ اللہ کے ذمہ وہ باتیں لگاؤ جس کی تم سند نہیں رکھتے"۔

دوسری دلیل: وہ سخت وعید ہے جو حدیث شریف میں قرآن کی اپنے رائے سے تفسیر بیان کرنے والے کے متعلق آئی ہے، اور وہ آپ علیہ السلام کا یہ ارشاد ہے: "میرے بارے میں حدیث بیان کرنے سے بچو مگر یہ کہ جسے تم جانتے ہو، جس نے جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ باندھا وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے، اور جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے زنی کی تو وہ بھی اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے"۔

تیسری دلیل: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وأنزلنا...﴾

ترجمہ: "اور آپ پر بھی یہ قرآن اتارا ہے تا کہ جو مضامین لوگوں کے پاس بھیجے گئے ان کو آپ ان پر ظاہر کردیں اور تا کہ وہ فکر کیا کریں"۔

چونکہ یہاں اللہ تعالیٰ نے بیان کی نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی ہے تو معلوم ہوا کہ آپ علیہ السلام کے سوا کسی دوسرے کو قرآن کے مفاہیم بیان کرنے کا کوئی حق نہیں۔

چوتھی دلیل: صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا اپنی آراء کے ذریعے قرآن میں کلام کرنے سے گریز کرنا، حتی کہ حضرت أبوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ فرماتے ہیں: "کہ کونسا آسمان مجھ پر سایہ فگن ہوگا؟ اور کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی؟ جب میں قرآن میں اپنی رائے سے بات کروں گا، یا میں اس کے متعلق وہ بات کہوں گا جو میں نہیں جانتا!!"۔

تفسیر معقول کو جائز سمجھنے والوں کے دلائل: جمہور علماء جو کہ تفسیر بالرائی کو جائز قرار دیتے ہیں وہ بھی چند دلائل سے استدلال کرتے ہیں جن کو ہم ذیل میں اختصار کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

پہلی دلیل: اللہ تعالیٰ نے ہمیں قرآن میں غور کرنے پر ابھارا اور اس کی اطاعت کی طرف بلایا ہے، چنانچہ اللہ عزوجل کا فرمان ہے: ﴿کتٰب...﴾

ترجمہ: ''یہ ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس واسطے نازل کیا ہے کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں''۔

اور ارشاد گرامی ہے: ﴿أفلا...﴾

ترجمہ: ''کیا یہ لوگ قرآن میں غور نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں''۔

اور تدبر و تذکر راز ہائے قرآن میں غوطہ زنی اور اس کے معانی سمجھنے میں سعی کرنے سے ہی ممکن ہے، تو کیا یہ عقل میں آنے والی بات ہے کہ اس مطلب کو بیان کرنا جس کو اللہ نے اپنے علم کے ساتھ خاص نہیں کیا علماء پر ممنوع ہو، باوجودیکہ یہ علم و معرفت کا راستہ وطریقہ بھی ہے؟!

دوسری دلیل: اللہ نے انسانوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے: ۱) عوام۔ ۲) علماء۔ اور عوام کو ان علماء کی طرف رجوع کرنے کا حکم دیا ہے جو احکام کا استخراج کرتے ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿وَلَوْ رَدُّوهُ...﴾

ترجمہ: ''اور اگر یہ لوگ اس کو رسول کے اور جو ان میں ایسے امور کو سمجھتے ہیں ان کے اوپر حوالہ رکھتے تو اس کو وہ حضرات تو پہچان ہی لیتے جو ان میں اس کی تحقیق کر لیا کرتے ہیں......''۔

اور استنباط کہتے ہیں کہ لطیف معانی کا بیدار ذہن کے ساتھ استخراج کرنا۔ اور یہ اجتہاد اور اسرارِ قرآنی میں غوطہ زنی سے ہی ممکن ہے، جیسا کہ موتی اور جواہرات نکالنے کے لیے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں تیراک غوطہ خوری کرتا ہے۔

تیسری دلیل: جمہور فرماتے ہیں کہ اگر اجتہاد کے ذریعے تفسیر بیان کرنا جائز نہ ہوتا تو اجتہاد بھی جائز نہ ہوتا، نتیجۃً بہت سارے احکام شرعیہ معطل ہو جاتے، جبکہ یہ باطل ہے

؛ کیوں کہ مجتہد شرعاً ثواب کا مستحق ہے خواہ وہ درستی کو پائے یا خطا کر بیٹھے، بشرطیکہ حق وصواب تک پہنچنے کیلئے اپنی تمام تر کوششیں کرتا رہے اور اپنی پوری طاقت اس میں صرف کر دے۔

چوتھی دلیل: اس میں کوئی شک نہیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن پڑھا اور اس کی تفسیر میں مختلف رایوں میں بٹ گئے، اور یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے جو کچھ بھی قرآن کی تفسیر میں کہا ہے تمام کا تمام نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سنا؛ کیوں کہ آپ علیہ السلام نے اُن سے ہر چیز بیان نہیں کی، بلکہ اس میں سے ناگزیر باتوں کو بیان کیا، اور دوسری بعض باتوں کو چھوڑ دیا جن کی معرفت تک صحابہ رضی اللہ عنھم اپنی عقلوں اور اجتہاد کے ذریعے پہنچے، اور اگر آپ علیہ السلام اُن سے قرآن کے تمام معانی بیان کر دیتے تو ان کے درمیان قرآن کی تفسیر میں کوئی اختلاف واقع نہ ہوتا۔

پانچویں دلیل: نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما کیلئے دعا کرتے ہوئے فرمایا کہ: ''اے اللہ! انہیں دین کی سمجھ عطا فرما اور انہیں علم تفسیر سکھا دے''۔ اگر تاویل قرآن کی طرح سماع اور نقل پر موقوف ہوتی تو یہاں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنھما کو اس دعا کے ساتھ خاص کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا، لہٰذا یہ اس بات پر دال ہے کہ تاویل رائے اور اجتہاد کے ذریعے تفسیر کرنے کا نام ہے۔

مانعین کے دلائل کا جواب: ۱- جمہور علمائے کرام نے غلطی ثابت کرنے والے ناقابل تردید دلائل اور قطعی براہین کی روشنی میں مانعین کے دلائل کا جواب دیا ہے۔ جمہور ان کی پہلی دلیل کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اجتہاد کے ذریعے سے تفسیر کرنا اللہ کی طرف بغیر علم کے بات کو منسوب کرنا نہیں، بلکہ وہ تو شارع علیہ السلام کی جانب سے اجازت یافتہ علم کے ساتھ بات کرنا ہے۔

آپ علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ: ''مجتہد جب اجتہاد کرتا ہے اور درستی کو پا لیتا ہے تو اس کیلئے دو اجر ہیں، اور جب اجتہاد کرتا ہے اور خطا کر بیٹھتا ہے تو اس کیلئے صرف ایک اجر ہے''۔ چنانچہ مجتہد اجر کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اسے اجتہاد کی اجازت ہی نہ ہو؟!

۲- رہی ان کی دوسری دلیل جو کہ یہ حدیث ہے: ''من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار'' تو علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے پانچ دلائل کے ذریعے اس کا جواب دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ تفسیر بالرای کے مطلب کے ماحصل کا خلاصہ پانچ اقوال ہیں:

۱) تفسیر کے جواز کیلئے ضروری علوم کو حاصل کیے بغیر تفسیر کرنا۔

۲) متشابہات کی تفسیر کرنا کہ جن کی مراد اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۳) وہ تفسیر جو مذہبِ فاسد کیلئے طے شدہ ہو، جس میں مسلک کو اصل اور تفسیر کو تابع بنایا جائے۔

۴) بغیر دلیل کے یقینی طور پر یہ فیصلہ کرنا کہ اللہ کی فلاں مراد ہے۔

۵) من چاہی اور اپنی خواہش نفس کے مطابق تفسیر کرنا۔

۳-تیسری دلیل پر رد کرتے ہوئے علماء فرماتے ہیں کہ ٹھیک ہے ہمیں تسلیم ہے کہ نبی اکرم ﷺ بیان پر ماُمور تھے، لیکن جب آپ ﷺ اللہ کے جوارِ رحمت کی طرف منتقل ہو گئے اور امت کیلئے ہر چیز کو تفصیل سے بیان نہ کر سکے تو جس چیز کے متعلق آپ ﷺ کا بیان موجود ہے تو وہی کافی ہے، اور جس کے متعلق آپ ﷺ کا بیان وارد نہیں ہوا تو اس میں اجتہاد اور فکر کو عمل میں لانا ناگزیر ہے، نیز آیت کا آخری حصہ بھی اسی پر دال ہے: ﴿لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ﴾ ''تا کہ وہ فکر کیا کریں''۔ اسی لیے تب تو فکر و اجتہاد ضروری امر ہے۔

۴- چوتھی دلیل کا جواب دیتے ہوئے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کا تفسیر معقول سے باز رہنا تقویٰ، احتیاط اور بالکل درست بات تک نہ پہنچنے کے خوف کی بنا پر تھا، وہ سمجھتے تھے کہ تفسیر اللہ تعالیٰ کے متعلق اس بات کی گواہی ہے کہ اللہ نے لفظ سے یہ معنیٰ مراد لیا ہے، لہٰذا وہ اس بات سے رکے رہے کہ مبادا حق بات اُن کی جانب نہ ہو، لیکن اگر ان کے سامنے راستی کا پہلو راجح ہو جاتا تو وہ تفسیر معقول سے نہ رکتے تھے۔

یہ ابوبکر صدیق ؓ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ﴿كَلَالَة﴾ کے متعلق اپنی رائے سے فتویٰ دے رہے ہیں: ﴿يَسْتَفْتُوْنَكَ قُلِ اللهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلَالَةِ﴾ ''لوگ آپ سے حکم دریافت کرتے ہیں، آپ فرما دیجیے کہ اللہ تعالیٰ تم کو کلالہ کے باب میں حکم دیتا ہے''۔

اور فرماتے ہیں کہ میں اس کے متعلق اپنی رائے سے کہتا ہوں، سو اگر راست نکلا تو اللہ کی جانب سے ہوگا اور اگر راست نہ ہوا تو میری اور شیطان کی طرف سے ہے کہ ''کلالہ'' وہ شخص ہے جس کا باپ بیٹا نہ ہو۔

اس سرسری نظر سے ہمارے سامنے ان لوگوں کے نظریہ کی غلطی ظاہر ہو جاتی ہے

جوقرآن کی تفسیراجتہاد کے ذریعے ناجائز قراردیتے ہیں، اوراسے منقول وماثور پر منحصر کردیتے ہیں۔جمہور کے مضبوط دلائل اوراُن کی طرف سے مانعین کے دلائل کوغلط قراردینے کو بخوبی آپ نے جان لیا،اب ہم یہاں اجتہاد کے ذریعے قرآن کی تفسیر کے جواز کے متعلق امام غزالی رحمہ اللہ کے ارشاد اور پھر راغب اُصفہانی رحمہ اللہ کے قول اورآخر میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ کے نقطۂ نظر کوذکر کرتے ہیں:

امام غزالی رحمہ اللہ کا ارشاد: امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''الإحیاء'' میں فرماتے ہیں کہ قرآن مجید کے معانی کے فہم وادراک کا میدان بڑا وسیع ہے اوراس میں بہت وسعت وگنجائش ہے، اورظاہراً تفسیر میں جومنقول ہے وہ اس میں ادراک کا منتہی نہیں، لہٰذا یہ تفسیر معقول میں سماع کی شرط لگانا باطل ہے۔اوراہل علم میں سے ہرایک کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی فہم اورعقل کے بقدرقرآن کے مطالب ومعانی کا استنباط کرے''۔

امام راغب اُصفہانی رحمہ اللہ کا قول: امام راغب اُصفہانی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کے مقدمہ میں دونوں مذہبوں اوران کے دلائل کوذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ بعض محققین علماء نے ذکر کیا ہے کہ دونوں مذاہب افراط وتفریط پر مبنی ہیں۔اس لیے کہ جس نے صرف تفسیر منقول پر اکتفا کیا تو اس نے بہت سا وہ ضروری حصہ چھوڑ دیا جس کی تفسیر قرآن میں ضرورت پڑتی ہے، اورجس نے ہرایک کوتفسیر میں داخل ہونے کی اجازت دی تو اس نے کتاب اللہ کواختلاط وامتزاج کا نشانہ بنادیا،اوروہ اللہ تعالی کے اس ارشاد کی حقیقت کو نہ سمجھ سکا:﴿لِيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص:۲۹)

ترجمہ:''تاکہ لوگ اس کی آیتوں میں غورکریں،اورتاکہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں''۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ کا نقطۂ نظر: علامہ قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' میں یوں رقم طراز ہیں کہ بعض علماء کا کہنا ہے کہ تفسیر سماع پر موقوف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ ...﴾

ترجمہ:''پھر اگر کسی امرمیں تم باہم اختلاف کرنے لگوتواس امرکواللہ اوراسکے رسول کے حوالہ کردیا کرو''۔

جبکہ یہ نظریہ باطل ہے؛ کیوں کہ تفسیر قرآن سے ممانعت دوباتوں سے خالی نہیں، یا

تو اس سے مراد نقل وسماع پر اقتصار اور استنباط کا ترک کرنا ہے، یا اس سے کوئی دوسری بات مراد ہے۔ اور یہ باطل ہے کہ اس سے مراد یہ ہو کہ قرآن کے متعلق ہر شخص وہی بات کرے جو اس نے رسول علیہ السلام سے سن رکھی ہو؛ کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے قرآن پڑھا اور اس کی تفسیر میں کئی طریقوں میں باہم اختلاف کیا، اور ہر بات جو انہوں نے کہی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن نہ رکھی تھی، اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کیلئے دعا کرتے ہوئے فرمایا: ''اے اللہ! اسے دین میں سمجھ عطا فرما اور اسے علم تفسیر سکھلا دے''۔ اگر تفسیر، قرآن کی طرح نقل پر مبنی ہوتی تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کو اس دعا کے ساتھ خاص کرنے کا کیا فائدہ تھا؟!

علامہ قرطبی رحمہ اللہ مزید فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن سے ممانعت دو صورتوں میں سے کسی ایک پر محمول ہے:

۱- کسی شخص کی ایک معاملہ میں کوئی رائے ہے، اور اسی کی جانب اس کی طبیعت اور خواہش کا بھی میلان ہے، اور پھر وہ قرآن کی تفسیر اپنی خواہش اور رائے کے مطابق کرتا ہے۔

۲- یا اُن آیات کے اندر جن کا تعلق غرائبِ قرآن سے ہے یا ان میں حذف واضمار اور تقدیم وتاخیر ہوئی ہے ایک شخص سماع ونقل کی یاددہانی کے بغیر عربی کے ظاہر الفاظ کو دیکھ کر قرآن کی تفسیر میں جلدی کرنے لگتا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور کریں: ﴿وَاٰتَيْنَا ثَمُوْدَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً فَظَلَمُوْا بِهَا﴾ (الاسراء: ۵۹) اس کا معنی یہ ہے کہ: ''ہم نے قوم ثمود کو واضح معجزہ اور ظاہر نشانی کے طور پر اونٹنی دی تھی، سو انہوں نے اس کو قتل کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا''۔

اب عربی کے ظاہری الفاظ کو دیکھنے والا یہ گمان کرے گا کہ اونٹنی بینا تھی اور وہ یہ نہیں سمجھے گا انہوں نے کس پر ظلم کیا؟ دوسروں پر ظلم کیا یا اپنے نفسوں پر؟ چنانچہ یہ حذف واضمار کی قبیل سے ہے، وراس کے نظائر قرآن میں بہت زیادہ ہیں، ان دونوں صورتوں کے علاوہ دیگر کسی صورت کو ممانعت شامل نہ ہوگی۔

تیسری قسم۔ تفسیر اشاری اور غرائب تفسیر: تفسیر کی تیسری قسم ''تفسیر اشاری'' کہلاتی

ہے، ہم اس بحث میں تفسیر اشاری کا معنیٰ، اس کی شرائط اور اس کے متعلق علمائے کرام کی آراء ذکر کریں گے، اور پھر اس کے بعد تفسیر اشاری کی کچھ مثالوں، اس طرز پر لکھی جانے والی کتابوں اور ان میں موجود محاسن وقبائح کو بیان کریں گے۔

تفسیر اشاری کا معنیٰ: تفسیر اشاری قرآن کی خلافِ ظاہر تفسیر ہے، یہ ایسے مخفی اشارات کی بنا پر کی جاتی ہے جو بعض اہل علم یا اہل طریقت اور مجاہدۂ نفس کرنے والے اُن عارفین باللہ پر ظاہر ہوتے ہیں جن کے قلوب کو اللہ تعالیٰ نے منور کر دیا ہوتا ہے، جس کے سبب وہ قرآن پاک کے رازوں کو پا لیتے ہیں، یا الہامِ الٰہی یا کشفِ ربانی کی بنا پر اُن کے ذہنوں میں بعض دقیق معانی روشن ہو جاتے ہیں، اور ان معانی اور آیاتِ مبارکہ کی ظاہری مراد کے درمیان جمع وتطبیق ممکن ہوتی ہے۔

چنانچہ تفسیر اشاری یہ ہے کہ مفسر ظاہری معنی کے علاوہ کوئی دوسرا معنی خیال کرے جس کا آیت مبارکہ احتمال بھی رکھے، لیکن وہ ہر انسان پر منکشف نہیں ہوتا، بلکہ اس شخص پر ظاہر ہوتا ہے جس کا دل اللہ تعالیٰ نے کھول دیا ہو، اس کی بصیرت کو روشن کر دیا ہو اور اسے اپنے ان نیک بندوں میں داخل کر دیا ہو جن کو اللہ تعالیٰ نے فہم وادراک سے نوازا ہے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت خضر علیہ السلام کے قصہ کے بارے میں ارشاد ربانی ہے: ﴿فَوَجَدَا عَبْدًا...﴾

ترجمہ: ''سو انہوں نے ہمارے بندوں میں سے ایک بندہ (یعنی خضر) کو پایا جن کو ہم نے اپنی خاص رحمت (یعنی مقبولیت) دی تھی اور ہم نے ان کو اپنے پاس سے ایک خاص طور کا علم سکھلایا تھا''۔

علم کی یہ قسم وہ کسبی علم نہیں جو کہ بحث ومذاکرے سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ وہ علم لدنی یعنی وہبی علم ہے جو کہ صلاح وتقویٰ اور استقامت کا ثمرہ ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿واتقوا اللہ...﴾

ترجمہ: ''اور خدا سے ڈرو، اور اللہ تعالیٰ (کا تم پر احسان ہے کہ) تم کو تعلیم فرماتا ہے''۔

تفسیر اشاری کے متعلق علمائے کرام کی آراء: علمائے کرام کے تفسیر اشاری کے

بارے میں مختلف اقوال اور متضاد آراء ہیں، چنانچہ بعض علماء نے تو اسے جائز قرار دیا ہے، اور بعض نے منع کیا ہے، اور بعض نے اسے کامل ایمان اور خالص معرفتِ خداوندی میں شمار کیا ہے، اور بعض نے اسے زیغ وضلال اور دین الٰہی سے انحراف سمجھا ہے۔

جبکہ حقیقت یہ ہے کہ یہ بہت دقیق موضوع ہے جو فہم وبصیرت اور حقیقت کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کا متقاضی ہے؛ تاکہ معلوم ہوجائے کہ اگر تفسیر کی اس قسم سے مقصود خواہشات کی پیروی، اور اللہ کی آیات سے ٹھٹھا اور مذاق کرنا ہو، جیسا کہ فرقۂ باطنیہ نے کیا تو زندقہ اور الحاد کہلائے گا، یا اس سے غرض اگر اس بات کی طرف اشارہ کرنا ہو کہ اللہ تعالیٰ کے کلام کا فکرِ انسانی احاطہ نہیں کرسکتی؛ کیوں کہ وہ طاقتوں اور قدرتوں کے خالق کا کلام ہے، اور کلامِ الٰہی میں متنوع مفاہیم، اسرار، نکتے، باریکیاں اور نہ ختم ہونے والے عجائب ہیں تو یہ خالص معرفت اور کمال ایمان میں سے ہوگا، جیسا کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں:

"بے شک قرآن مختلف انواع واقسام پر مشتمل ہے، اور اس نے کئی ظاہری اور باطنی معانی کو اپنے اندر سمویا ہوا ہے، اس کے عجائب ختم ہونے والی نہیں اور نہ ہی اس (بحر بیکراں) کے کنارہ تک پہنچنا ممکن ہے، جو اس میں نرمی سے داخل ہوگا نجات پائے گا، اور جو اس میں سختی کے ساتھ کودے گا تو ہلاک ہوگا، اس میں اخبار وامثال، حلال وحرام، ناسخ ومنسوخ، محکم ومتشابہ ہیں، اس کا ظاہر وباطن ہے، پس اس کا ظاہر اس کی تلاوت اور اس کا باطن اس کی تفسیر ہے، لہٰذا اس کو لے کر علماء کی مجالس میں بیٹھو، اور جہلاء کی مجالس سے دور رہو"۔

تفسیر اشاری کو جائز کہنے والوں کے دلائل: تفسیر اشاری کے جواز کے قائلین اس روایت استدلال کرتے ہیں جو امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "صحیح بخاری" کے باب التفسیر میں سورۂ نصر کی تفسیر کرتے ہوئے نقل کی ہے، حدیث کے الفاظ یہ ہیں:

"حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجھے بدر کے کبار صحابہ کی مجلس میں داخل کرلیا کرتے تھے تو بعض صحابہ کو یہ بات ناگوار گزری اور حضرت عمر سے رضی اللہ عنہ کہا کہ آپ اس لڑکے کو ہماری مجلس میں کیوں داخل کرتے ہیں، جبکہ اس کے برابر کے تو ہمارے بیٹے ہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ

یہ تو وہ ہے جس کے علم وفضل سے تم اچھی طرح واقف ہو! چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مجھے ایک دن بلایا اوران کی مجلس میں داخل کیا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں سمجھ گیا کہ انہوں نے مجھے صرف اسی لئے بلایا ہے تاکہ انہیں (میرا علم وفضل) دکھا دیں۔ حضرت عمر نے اُن سے دریافت فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾(۱) کے بارے میں تمہاری کیارائے ہے؟" (اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے (یعنی واقع ہوجائے)"۔(ترجمہ حاشیہ میں) بعض نے کہا کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ جب ہمیں مدد اور فتح نصیب ہوگئ تو ہم اللہ کی حمد بیان کریں اور اس سے استغفار کی درخواست مانگیں، بعض دوسرے خاموش رہے اور کچھ بھی نہ کہا۔

آپ رضی اللہ عنہ نے مجھ سے کہا کہ اے ابن عباس! کیا تم بھی یہی کہتے ہو؟ تو میں نے کہا کہ نہیں۔آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ پھر تمہاری کیارائے ہے؟ میں نے کہا کہ یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجل ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلادی، اور فرمایا: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ یعنی: "(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے (یعنی واقع ہوجائے)"۔ تو یہ آپ کی اجل کی علامت ہے: ﴿فَسَبِّحْ...﴾ "پس اپنے رب کی تسبیح وتحمید بیان کیجئے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجئے، وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے"۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں بھی اس آیت کا مطلب وہی جانتا ہوں جو تم نے کہا"۔

لہٰذا ابن عباس رضی اللہ عنہما کے بیان کردہ آیت کے اس مطلب کو بقیہ صحابہ رضی اللہ عنھم نہ سمجھ سکے، اور یہ مطلب صرف حضرت عمر اور ابن عباس رضی اللہ عنہما ہی کی سمجھ میں آسکا، یہ وہ تفسیر اشاری ہے جس کا اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہیں اس پر الہام کرتے ہیں، اور اپنے بعض بندوں کو اس سے آگاہ کرتے ہیں، چنانچہ مذکورہ بالا سورۂ مبارکہ میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر اور اجل کے قریب ہونے کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح کی ایک بات کا ذکر حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن خطبہ ارشاد فرمایا اور خطبہ میں یہ بھی فرمایا: "بے شک اللہ تعالیٰ نے ایک بندہ

کو دنیا اور جو کچھ اس کے پاس ہے اس کے درمیان اختیار دیا (کہ دونوں میں سے جو چاہے پسند کرلے) لیکن بندہ نے اس کو اختیار کیا جو اللہ کے پاس تھا"۔ یہ سن کر حضرت اُبوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے، اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت اُبوبکر نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! ہمارے ماں باپ آپ پر قربان ہوں، راوی کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت اُبوبکر رضی اللہ عنہ کے رونے پر تعجب ہوا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پاگئے تو ہمیں معلوم ہوا کہ آپ ہی عبدِ مُخَیَّر (اختیار دیے گئے بندے) تھے، اور حضرت اُبوبکر رضی اللہ عنہ اشارہ سے وہ بات سمجھ گئے جو تمام صحابہ نہ سمجھ سکے، اور واقعہ اسی طرح ہوا جیسا کہ آپ رضی اللہ عنہ نے خیال کیا تھا۔

علماء کرام کے تفسیر اشاری کے متعلق اقوال: میں یہاں تفسیر اشاری کے بارے میں مختصراً علمائے کرام کے چند اقوال کا ذکر کروں گا، پروردگار سے اس بات کا سوال ہے کرتے ہوئے کہ وہ ہمیں صحیح اور حق راستے کی تلقین کرے، اور ہمیں خطا اور گمراہی سے دور رکھے، پھر ان اقوال کے بعد میں حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ کا ایک مقولہ ذکر کروں گا جو کہ سب کیلئے ختام المسک ہے، سو میں کہتا ہوں اور اللہ ہی سے مدد کا خواستگار ہوں:

علامہ زرکشی رحمہ اللہ کا قول: علامہ زرکشی رحمہ اللہ اپنی کتاب "البرھان" میں فرماتے ہیں کہ تفسیر قرآن کے متعلق صوفیائے کرام کے اقوال کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ تفسیر نہیں ہیں، بلکہ وہ تو ایسے مفاہیم اور احساسات ہیں جو لوگ تلاوت کرتے ہوئے محسوس کرتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے بارے میں بعض صوفیائے کرام کا کہنا ہے کہ ﴿الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ﴾ سے مراد نفس ہے: ﴿قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ﴾ "ان کفار سے لڑو جو تمہارے آس پاس (رہتے) ہیں"۔

ان کا خیال ہے کہ ہمارے قریب کفار سے قتال کی علت قرب ہے، اور انسان کا سب سے زیادہ قریب اس کا نفس ہے۔

علامہ نسفی اور علامہ تفتازانی رحمہما اللہ کا نقطۂ نظر: علامہ نسفی رحمہ اللہ اپنی کتاب "العقائد" میں فرماتے ہیں کہ نصوص قرآنیہ اپنے ظاہر پر محمول ہیں، اور ان سے ایسے معانی کی طرف عدول کرنا جن کا اہل باطل دعویٰ کرتے ہیں نرا الحاد ہے۔

اور تفتازانی رحمہ اللہ "شرح العقائد" میں فرماتے ہیں کہ ملحدین کو باطنیہ اسی وجہ سے

کہا جاتا ہے کہ وہ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ نصوص قرآنیہ اپنے ظاہر پر محمول نہیں بلکہ ان کے ایسے مطالب ومعانی ہیں جنہیں معلم کے سوا کوئی نہیں جانتا، اور اس بات سے ان کا مقصد شریعت کی بالکلیہ نفی کرنا ہے۔

پھر مزید فرمایا کہ البتہ بعض محققین جو اس طرف گئے ہیں کہ نصوص اپنے ظاہر پر محمول ہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں چند ایسے لطائف کی طرف مخفی اشارات بھی ہیں جو اہل طریقت پر منکشف ہوتے ہیں، نیز ان لطائف میں اور ظاہری مرادمیں توفیق وتطبیق ممکن ہوتی ہے تو وہ کمال ایمان اور خالص معرفتِ خداوندی میں سے ہے۔

چنانچہ آپ نے دیکھ لیا کہ علامہ نسفی رحمہ اللہ نے باطنیہ کی طرف اشارہ کرکے بتادیا کہ اُن کا راستہ دینِ خداوندی میں الحاد ہے، جبکہ تفتازانی رحمہ اللہ نے بحث کو تفصیل سے بیان کیا ہے اور موضوع کی خوب وضاحت کی ہے، چنانچہ باطنیہ پر ان کی گمراہی کا رد کیا، اور دقائق کے استنباط اور مخفی اشاروں میں بعض اہل سلوک کے طریقہ کا اعتراف کیا، اور اسے کمال معرفت وایمان میں سے قرار دیا۔

اسی سے ہمارے سامنے تفسیر اشاری (جو کہ بعض عارفین باللہ کی تفسیر ہے) اور تفسیر باطنی (جو کہ مقدس کتابِ الٰہی کے معانی میں تحریف کرنے والے ملحدین اہل باطن کی تفسیر ہے) کے درمیان فرق کھل کر آجاتا ہے، چونکہ اول الذکر حضرات ظاہر کو مراد لینے سے منع نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ یہی اصل وبنیاد ہے اور ظاہری مراد کی تحصیل پر برانگیختہ کرتے ہیں، نیز کہتے ہیں کہ پہلے ظاہر کی معرفت ضروری ہے؛ کیوں کہ جو شخص اسرارِ قرآنی کو سمجھنے کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن ظاہری معنیٰ کو صحیح نہیں بتاتا تو اس کی مثال اس شخص جیسی ہے جو دروازے میں داخل ہونے سے پہلے گھر کی سطح پر پہنچنے کا دعویٰ کرے!

اور رہے باطنیہ تو وہ کہتے ہیں کہ ظاہر سرے سے مراد ہی نہیں بلکہ باطن مراد ہے، اور اس کلام سے ان کا مقصد شریعت کی نفی اور احکام شرعیہ کو باطل قرار دینا ہوتا ہے، اس بات کے دین الٰہی میں الحاد ہونے میں کوئی شک نہیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ان الذین...﴾

ترجمہ: ’’بلاشبہ جو لوگ ہماری آیتوں میں کج روی کرتے ہیں وہ لوگ ہم پر مخفی

نہیں ہیں، سو بھلا جو شخص آگ میں ڈالا جاوے وہ اچھا ہے یا وہ شخص جو قیامت کے روز امن وامان کے ساتھ (جنت میں) آئے، جو جی چاہے کرلو، وہ تمہارا سب کیا ہوا دیکھ رہا ہے"۔

"الاتقان" میں علامہ سیوطی رحمہ اللہ کی تقریر: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاتقان" میں ابن عطاء رحمہ اللہ سے یہ الفاظ نقل کئے ہیں: جان لو کہ کلام الٰہی یا رسول خدا ﷺ کی حدیث کی اس قسم کی تفسیر (یعنی تفسیر اشاری) کرنا ظاہری معنیٰ کو اپنے ظاہر سے پھیرنا نہیں، بلکہ آیت جس معنیٰ کیلئے وارد ہوئی ہے اور عربی زبان کا عرف جس بات پر دلالت کرتا ہے ظاہر آیت سے وہی مفہوم ہوتا ہے، لیکن ان تمام آیات اور احادیث کے کچھ باطنی مفاہیم بھی ہوتے ہیں جو کہ قرآن وحدیث میں اُن حضرات کی سمجھ میں آتے ہیں جن کے سینے اللہ تعالیٰ نے کھول دیے ہوتے ہیں۔

لہٰذا تمہیں اہل سلوک سے یہ معانی حاصل کرنے سے کسی جھگڑالو یا مخالفت کرنے والے کا یہ قول منع نہ کرے کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسول خدا ﷺ کے کلام کو تبدیل کرنا ہے، چنانچہ یہ احالہ نہیں، احالہ تو تب ہوتا کہ صوفیاء کہتے کہ آیت کا اس کے سوا کوئی معنیٰ نہیں ہے، جبکہ وہ حضرات یہ بات نہیں کہتے بلکہ ظاہری الفاظ کو اپنے ظاہر پر برقرار رکھتے ہیں، اور ان سے اُن کے وضع کردہ معانی مراد لیتے ہیں، البتہ اللہ کی طرف سے وہ معانی بھی سمجھ جاتے ہیں جو اُن کی طرف اللہ تعالیٰ الہام فرماتے ہیں۔

مصنف مدظلہ فرماتے ہیں کہ میں یہ کہتا ہوں کہ یہی انصاف کی بات ہے اور شیخ سیوطی رحمہ اللہ نے حق کو اپنی اصل جگہ پر رکھا ہے، اور ظاہری نصوص اور ایک عارف باللہ مؤمن کے دل پر روشن ہونے والے مخفی واردہ معانی کے درمیان تطبیق دے دی ہے، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی یہی معاملہ تھا، یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، چونکہ اللہ جسے چاہتا ہے حکمت سے نوازتا ہے اور دین کی فہم وبصیرت اس میں رکھ دیتا ہے، ارے یہی وہ قرآن ہے جو ہمیں سیدنا داؤد اور سیدنا سلیمان علیہما السلام کی حالت کی ان دونوں پر پیش کیے گئے ایک معاملہ کے اندر خبر دے رہا ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک نے وہ فیصلہ کیا جو دوسرے کے فیصلہ کے مخالف تھا، چنانچہ قرآن کہتا ہے:

﴿ففھمناھا...﴾

ترجمہ: ''سو ہم نے اس فیصلہ کی سمجھ سلیمان کو دے دی، اور (یوں) ہم نے دونوں کو حکمت اور علم عطا فرمایا تھا''۔

تفسیر اشاری کے بارے میں وارد ہونے والی حدیث کا مطلب: یہاں ہمارے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آیت کے ظاہر و باطن، حدِ حرف اور مطلع حرف کے معنی کو بیان کرنے کیلئے تفسیر اشاری کے بارے میں وارد ہونے ولی حدیث کے مطلب کی وضاحت کردیں؛ تاکہ ملحدین اہل باطن اس حدیث کو اپنے باطنی طریقہ پر اور اپنی خواہشات کے مطابق آیات مبارکہ سے ٹھٹھا کرتے ہوئے کلام اللہ کی تفسیر میں اپنے باطل دعوے کی دلیل نہ بنالیں۔

فریابی رحمہ اللہ نے اپنی سند کے ساتھ حضرت حسن رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''ہر آیت کا ایک ظاہر اور ایک باطن ہے، اور حرف کی ایک حد ہے اور ہر حرف کا ایک مطلع ہے''۔

اور طبرانی رحمہ اللہ نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے موقوفاً نقل کیا ہے کہ: ''اس قرآن میں کوئی ایسا حرف نہیں جس کی حد نہ ہو، اور ہر حرف کیلئے ایک مطلع ہے''۔

علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے حدیث شریف کی تفسیر میں ظاہر اور باطن کے معنیٰ کے لیے چند وجوہ کو ذکر کیا ہے، ہم ان میں سے درستی کے زیادہ قریب وجوہات کو ذکر کر لیتے ہیں:

پہلی وجہ: ظاہر سے مراد آیت کا لفظی معنیٰ اور باطن سے مراد اس کی تفسیر ہے۔

دوسری وجہ: ظاہر سے مراد آیت کے وہ معانی ہیں جو ظاہر سے واقف کار علمائے کرام پر منکشف ہوتے ہیں اور باطن سے مراد آیت میں متضمن وہ پنہاں راز ہیں جن پر اللہ تعالیٰ اہل معرفت وحقیقت کو مطلع کرتے ہیں۔

تیسری وجہ: وہ قصے جو اللہ تعالیٰ نے گذشتہ امتوں کے بیان کئے ہیں اور جو سزائیں انہیں دی ہیں، اُن کا ظاہر پہلوں کی ہلاکت کی خبر دینا ہے اور اُن کا باطن دوسروں کو نصیحت کرنا اور پہلوں جیسے افعال کرنے سے ڈرانا ہے؛ تاکہ ان پر بھی وہ عذاب نازل نہ ہوجائے جو پہلوں پر ہوا تھا۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ وجہ درستگی کے زیادہ مشابہ وہم نوا ہے۔

''حد'' سے مراد حلال وحرام کے احکام ہیں، اور ''مطلع'' سے مراد وعدہ اور وعید ہے، اس مراد کی تائید حضرت ابن عباس ؓ کی ذکرکردہ حدیث سے بھی ہوتی ہے: ''ان القرآن ذو شجون وفنون......''۔ اوراس کا تفصیلی ذکر آپ کے سامنے آچکا ہے۔

تفسیر اشاری کے مقبول ہونے کی شرائط: تفسیر اشاری اسی وقت قابل قبول ہوگی جب اس میں ذیل میں ذکرکردہ شرائط پائی جائیں:

۱- نظم قرآن کے ظاہری معنیٰ کے منافی نہ ہو۔

۲- یہ دعویٰ نہ ہو کہ صرف یہی مراد ہے، ظاہری معنیٰ مراد نہیں۔

۳- ایسی پھسپھسی اور نامعقول تفسیر نہ ہو جس کا لفظ احتمال ہی نہ رکھے، جیسا کہ باطنیہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ امام علی ؓ نبی ﷺ کے علم میں اُن کے وارث ہوئے:

﴿وَوَرِثَ سُلَيْمٰنُ دَاوٗدَ﴾ ''اور داود (علیہ السلام کی وفات کے بعد ان) کے قائمقام سلیمان ہوئے''۔

۴- اس تفسیر کا کوئی شرعی یا عقلی معارض موجود نہ ہو۔

۵- اس کے اندر لوگوں کے ذہنوں کو کسی تشویش والجھن میں ڈالنا نہ ہو۔

ان شرائط کے بغیر تفسیر اشاری قابل قبول نہ ہوگی اوراس وقت وہ خواہش اور ممنوعہ رائے کے ذریعے تفسیر میں سے شمار ہوگی، اور اللہ ہی سیدھے راستہ کی طرف رہنمائی کرنے والے اور توفیق بخشنے والے ہیں۔

شیخ زرقانی رحمہ اللہ کی ایک قیمتی بات: ہم یہاں تفسیر اشاری کے بارے میں شیخ محمد عبدالعظیم زرقانی رحمہ اللہ کی ایک قیمتی بات ذکر کرتے ہیں جو کہ اس شخص کے لیے پر از حکمت اور سچی نصیحت ہے جس کے پاس (سمجھنے والا) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو۔

وہ فرماتے ہیں کہ شاید کہ آپ میرے ساتھ اس بات میں غور کریں کہ بعض لوگ ان اشارات وخیالات کی تعلیم کی طرف مائل ہونے کی وجہ سے فتنہ میں مبتلا ہوئے اور ان کے دماغ میں یہ بات جاگھسی کہ کتاب وسنت ہی نہیں بلکہ پورا اسلام ہی تاویلات وتوجہات کی

اس نوع پر مبنی سوچوں اور خیالات کے سوا کچھ نہیں، اور انہوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام کا معاملہ چند تخیلات واوہام کے سوا کچھ نہیں۔ اور مطلوب صرف وہی خیال کے ساتھ طاری ہونے والا حال ہے جہاں بھی وہ طاری ہو جائے۔ چنانچہ انہوں نے احکام شرعیہ کی پابندی کا خیال نہ رکھا اور عربی کلام میں بلیغ ترین کتاب اللہ وسنتِ رسول اللہ ﷺ کے سمجھنے میں عربی زبان کے قوانین کا احترام نہ کیا۔

اس سے بھی بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ خود تو تخیل پرست ہیں دوسرے لوگوں کو بھی یہ باور کراتے ہیں کہ حقیقت پرست تو وہی ہیں کہ انہوں نے آخری حد کو جالیا اور اللہ کے ساتھ اُن کا ایسا ربط وتعلق جڑا کہ اُس ربط نے ان سے شرعی تکلیف کو ساقط کر دیا، اور انہیں اسباب اختیار کرنے کی پستی سے بالا کر دیا (یعنی اسباب کے اختیار کرنے سے بے نیاز کر دیا) وہ بزعم خویش ہمیشہ رب الارباب کے ساتھ ہیں۔

خدا کی قسم! یہ بہت بڑا المیہ ہے جو باطنیہ نے اختیار کیا ہے، تا کہ وہ شریعت کو اس کی جڑوں سے اکھاڑ پھینکیں اور اسلام کا بنی بنائی عمارت کو بنیاد سے ڈھا دیں، اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے فریضۂ نصیحت ہم سے یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم انہیں ان فریبی جالوں میں پھنسنے سے ڈرائیں، اور انہیں یہ مشورہ دیں کہ وہ اس قسم کی پیچیدہ اشاراتی تفاسیر سے دست کش ہو جائیں؛ کیوں کہ یہ تمام تفاسیر ایسے اذواق و وجدانیات سے عبارت ہیں جو بندش و پابندی کے دائرہ سے خارج ہیں، اور بسا اوقات اس میں خیال، حقیقت کے ساتھ اور حق، باطل کے ساتھ مل جاتا ہے، لہٰذا عقلمند و دانا شخص کیلئے یہی مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان پھسلوانوں سے دور رکھے، اور ان شبہات سے اپنے دین کو لے کر دور بھاگ جائے، اس کے سامنے کتاب وسنت اور لغت و شریعت کے قوانین کے مطابق ان دونوں کی شروحات کی صورت میں نخلستان و باغیچے ہیں: ﴿أتستبدلون...﴾

ترجمہ: ''تم عوض میں لینا چاہتے ہو ادنیٰ درجہ کی چیزوں کو ایسی چیز کے مقابلہ میں جو اعلیٰ درجہ کی ہے''۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ کا ارشاد: حجۃ الاسلام امام غزالی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''احیاء علوم الدین'' میں ذکر وتذکیر کی فصل میں یوں فرماتے ہیں کہ جہاں تک ''شطح'' کی

بات ہےتو اس سے ہماری مراد کلام کی وہ دو قسمیں ہیں جنہیں بعض صوفیا نے ایجاد کیا ہے:

پہلی قسم: اللہ کے عشق اور ظاہری اعمال سے بے نیاز کر دینے والے وصال الٰہی کے لمبے چوڑے دعوے، یہاں تک کہ ایک جماعت تو وحدت الوجود، خالق ومخلوق کے درمیان حجاب کے اٹھ جانے، ذات باری تعالیٰ کا دیدار کے ذریعے ادراک اور ان سے روبرو گفتگو کرنے کے دعوے تک جا پہنچی، اوراس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ہمیں اللہ کی طرف سے فلاں بات کہی گئی ہے اور ہم نے فلاں جواب دیا، اس میں وہ ''حسین حلاج'' کے ہمنوا ہیں جسے اس قسم کے کلمات کہنے کی وجہ سے سولی پر چڑھایا گیا تھا، یہ جماعت حلاج کے قول'' أنا الحق'' سے استدلال کرتی ہے۔ یہ کلام کی ایک ایسی قسم ہے جو کہ عوام کے لیے بہت زیادہ نقصان دہ ہے اسی لئے اگر کوئی اس قسم کی بات کرے تو اس کا قتل کرنا دسیوں انسانوں کے زندہ کرنے سے زیادہ افضل ہے۔

دوسری قسم: نہ سمجھ آنے والے وہ کلمات، جن کا ظاہر بڑا پرکشش اوراس کی عبارتیں بڑی زبردست ہوتی ہیں، لیکن ان کے پیچھے کام کی کوئی بات نہیں ہوتی، کلام کی اس قسم کا کوئی فائدہ نہیں مگر یہ کہ وہ دلوں کو پریشان، عقلوں کو مدہوش اور ذہنوں کو حیران کر دیتی ہے، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے بھی کسی قوم سے ایسی بات کہی جسے وہ لوگ نہ سمجھتے ہوں تو وہ ان کیلئے فتنہ بن گئی۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی بات کرو جو وہ سمجھتے ہوں، کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ اوراس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جھٹلایا جائے؟!

باطل تفسیر اشاری کی چند مثالیں: پھر امام غزالی طیب اللہ ثراہ فرماتے ہیں کہ البتہ طاعات میں ہماری ذکر کردہ شطح داخل ہو جاتی ہے، اوراس مقام پر ایک دوسری بات ہے جو ان طاعات کے ساتھ خاص ہے، اور وہ شرع کے الفاظ کو ان کی ظاہری مراد سے ایسے باطنی امور کی طرف پھیرنا ہے جن سے عقلوں کی طرف کوئی فائدہ سبقت نہیں کرتا، تو یہ قسم بھی حرام ہے اوراس کا نقصان بھی بہت زیادہ ہے۔ فتنہ پردازوں کی تفسیر کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى﴾

ترجمہ: ”تم فرعون کے پاس جاؤ اس نے بڑی شرارت اختیار کی ہے“۔

ان میں سے بعض نے یہ کہا ہے کہ اس ارشاد میں دل کی طرف اشارہ ہے، اور فرعون سے دل ہی مراد ہے، اور وہی ہر انسان پر سرکشی اور بغاوت کرتا ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ﴾

ترجمہ: ”آپ اپنا عصا ڈال دیجئے“۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ عصا سے مراد ہر وہ شے ہے جس پر اللہ تعالیٰ کے سوا اعتماد اور بھروسہ کیا جاتا ہے، لہٰذا اسے چاہیے کہ اسے پھینک دے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ”تسحروا فان فی السحور برکۃ“۔ ”سحری کھایا کرو کیوں کہ سحری کے کھانے میں برکت ہے“۔

میں ان لوگوں نے سحور کی تفسیر سحری کے وقت میں استغفار کرنے سے کی ہے، اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں۔

اور یہ سب اس لیے ہے تا کہ یہ لوگ پورے قرآن کو از اول تا آخر تک اس کے ظاہری معنیٰ سے پھیر دیں اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ اور تمام جلیل القدر علماء سے منقول تفسیر میں تحریف وتبدیلی کر ڈالیں، ان میں سے بعض تفاسیر تو ایسی ہیں جن کا ظاہر البطلان ہونا یقینی امر ہے، جیسا کہ فرعون کو بمنزلہ دل کے قرار دینا؛ کیوں کہ فرعون ایک شخص محسوس ہے اور اس کے وجود کے بارے میں روایت ہم تک تواتر سے پہنچ چکی ہے، اور ان میں سے کچھ تفاسیر ایسی ہیں جن کا بطلان غالب گمان سے معلوم ہوتا ہے، یہ تمام کی تمام حرام اور گمراہی پر مبنی تفاسیر ہیں اور لوگوں کے لیے دین میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب ہیں۔

ان شرپسند لوگوں میں سے جو اس قسم کی تفاسیر کو جائز سمجھتا ہے باوجودیکہ وہ جانتا ہے کہ الفاظ قرآن سے یہ معانی مراد نہیں تو وہ اس شخص کے مشابہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ باندھنے اور ہر نئی بات کو ان کی طرف منسوب کرنے کو جائز قرار دیتا ہے، مثلاً وہ شخص جو ہر ایک معاملہ میں جسے وہ مناسب سمجھتا ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے ایک حدیث گھڑ لیتا ہے، سو یہ ظلم، گمراہی اور اس وعید میں داخل ہونے کا سبب ہے: ”مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ“۔۔۔ بلکہ ان الفاظ میں اس قسم کی

تاویل کا نقصان بہت زیادہ اور شدید ہے؛ کیوں کہ یہ شخص الفاظ پر اعتماد کرنے کو باطل اور قرآن سے سمجھنے اور استفادہ کرنے کے طریقہ کو مکمل طور پر ختم کرنے والا ہے، (امام غزالی رحمہ اللہ کا کلام اختتام کو پہنچا)۔

خلاصۂ بحث: ماقبل کلام سے یہ بات ہمارے سامنے واضح ہوگئی کہ تفسیر اشاری کی شرع کی طرف سے تائید موجود ہے، لیکن اس کے اندر بعض فاسد تفاسیر بھی داخل ہوگئی ہیں اور بعض حضرات نے اس تفسیر میں بھی باطنیہ کا راستہ اپنا کر علمائے کرام کی وضع کردہ شرائط کی رعایت نہ رکھی، اور شب کور اونٹنی کی طرح بے راہ چل دیے، بلکہ نوبت بایں جا رسید کہ ہر کس و ناکس نے کتاب اللہ پر دست درازی شروع کردی ہے، اور اس کا خیال ہے کہ یہ تفسیر اشاری ہے جبکہ وہ نری بے وقوفی، جہالت اور گمراہی ہے؛ کیوں کہ یہ کتاب اللہ میں تحریف اور ملحدین اہل باطن کے راستہ پر چلنا ہے۔ یہ اگرچہ نظم قرآن میں تحریف نہیں لیکن معانی قرآن میں تحریف ضرور ہے۔

میں نے خود ایک شخص سے سنا کہ وہ اس آیتِ مبارکہ سے استدلال کر رہا تھا:

﴿قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾ ''آپ کہہ دیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر ان کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجیے''۔

کہ ذکرِ الٰہی کے طالب کے لیے لفظ ''اللہ'' کے ذکر کی ملازمت ضروری ہے، اس نے لفظ ''اللہ'' کو قول کا مقولہ بنا دیا اور مطلب یہ ہوا کہ: ''تم اللہ کہا کرو''۔ اس کوڑھ مغز جاہل کو کیا معلوم کہ اس جملہ کی خبر کو حذف کر دیا گیا ہے اور تقدیری عبارت یہ ہے: ''اللہ أنزله''۔ اس لیے کہ آیتِ مبارکہ کا یہ سیاق اسی پر دال ہے: ﴿وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖۤ اِذْ قَالُوْا مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ تَعْلَمُوْۤا اَنْتُمْ وَلَاۤ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ﴾

ترجمہ: ''اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی جیسی قدر پہچاننا واجب تھی، ویسی قدر نہ پہچانی، جبکہ یوں کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کسی بشر پر کوئی چیز بھی نازل نہیں کی، آپ

یہ کہیے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ لائے تھے؟......آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر ان کو ان کے مشغلہ میں بیہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے''۔

اس قسم کی تخلیط وتلبیس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، چنانچہ علمائے حق کیلئے مناسب نہیں کہ وہ اس قسم کے جہلاء کو کتاب اللہ پر دست درازی اور ظاہر کے خلاف اورحق وراست کے متضاد قرآن کی تفسیر کرنے کا موقع دیں، کیوں کہ ان جاہلوں کا خیال یہ ہے کہ یہ بھی تفسیر اشاری کی ایک قسم ہے، سو تفسیر کی کچھ قیود وشرائط ہیں، اور ہر شخص کیلئے یہ مناسب نہیں کہ وہ اس کے بارے میں اپنی رائے سے کہنے لگے یا اپنی ناتواں عقل کے ذریعے اس کے نصوص میں ٹھٹھا کرے، بے شک شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے سچ فرمایا ہے کہ: ''نیم حکیم جسم کو بگاڑتا ہے جبکہ نیم عالم مذہب کو بگاڑ دیتا ہے۔ (یعنی نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم ملا خطرۂ ایمان ہوتا ہے) اور اللہ تعالیٰ ہی سچ فرماتے ہیں، اور صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

غرائبِ تفسیر: علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں کرمانی رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے ذکر کیا ہے کہ انہوں نے دو جلدوں پر مشتمل ایک کتاب تصنیف فرمائی جس کا نام ''العجائب'' رکھا اور اس میں تفسیر کے ایسے ناپسندیدہ اقوال کو جمع کیا ہے جن کا نہ کہنا جائز ہے اور نہ ہی ان پر اعتماد کرنا؛ کیوں کہ یہ گمراہ لوگوں کے اقوال ہیں۔ کرمانی رحمہ اللہ نے ان اقوال کو صرف اس لیے ذکر کیا ہے تاکہ ان سے بچا جائے، وہ خود فرماتے ہیں کہ ان اقوال کو ذکر کرنے سے میرا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ علم کے دعویداروں میں منجملہ احمق بھی بہت ہیں۔

اب ہم یہاں پر ان اقوال کا ایک حصہ ذکر کریں گے اور اسی طرح باطنیہ سے منقول بعض دوسرے اقوال بھی بیان کریں گے؛ تاکہ اس قسم کے باطل اقوال سے مسلمان پرہیز کریں جو کہ امت اسلامیہ میں اندھے تعصب اور خواہشات کی پیروی کے سبب داخل ہوگئے ہیں۔

ان نادر اقوال کی چند مثالیں: ۱- اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿حٰمٓ عٓسٓقٓ﴾ میں وہ کہتے ہیں

کہ ''ح'' سے مراد حضرت علی و حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کی حرب (یعنی جنگ) ہے، ''م'' سے مراد خلافتِ بنی مروان ہے، ''ع'' سے مراد خلافتِ عباسیہ ہے، ''س'' سے مراد سفیانیوں کی خلافت ہے، ''ق'' سے مراد قُدوہ مہدی (یعنی اسوہ مہدی) اور اسکے علاوہ بھی دیگر بہت سی گمراہ کن باتیں ہیں۔

۲-اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ ''اور فہیم لوگو! (اس قانون) قصاص میں تمہاری جانوں کا بڑا بچاؤ ہے''۔

اس میں اُن کا کہنا ہے کہ قصاص سے مراد قرآن کے قصے ہیں، جبکہ یہ تفسیر از روئے لغت و شرع دونوں اعتبار سے باطل ہے، اور ایسی بات ہے جسے جہلاء ہی کہہ سکتے ہیں۔

۳-اللہ تعالیٰ کا قول ہے: ﴿وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ﴾ ''لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے قلب کو سکون ہو جائے''۔

اس میں وہ کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کے ایک دوست تھے جسے انہوں نے دل سے تعبیر کیا ہے، اور اِن حضرات نے اس آیت کی تفسیر یوں کی ہے: ''لیکن اس غرض سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے دوست کو سکون ہو جائے''۔ جبکہ یہ بہت زیادہ بعید بات ہے۔

۴-اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ ''اے ہمارے رب! اور ہم پر کوئی ایسا بار (دنیا یا آخرت کا) نہ ڈالیے جس کی ہم کو سہار نہ ہو''۔

اس میں انہوں نے کہا ہے کہ اس سے مراد عشق و محبت ہے، چنانچہ انسان جس کی طاقت نہیں رکھتا اس کی انہوں نے یہ باطل تفسیر کر ڈالی، ان کی اس بات کو کواشی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

۵-اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ﴾ ''اور (بالخصوص) اندھیری رات کے شر سے جب وہ رات چھا جائے''۔

اس کی تفسیر میں وہ کہتے ہیں کہ ﴿غاسق﴾ سے مراد آلۂ تناسل ہے جب کہ وہ کھڑا ہو جائے، اور بلا شبہ یہ عجیب و غریب جرأت اور بہت سخت بے حیائی و گستاخی ہے جو کسی بے وقوف اور پرلے درجہ کے احمق ہی سے صادر ہو سکتی ہے۔

۶-فرمانِ الٰہی ہے: ﴿الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ

﴿مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ﴾ ''وہ ایسا (قادر) ہے کہ (بعض) ہرے درخت سے تمہارے لیے آگ پیدا کر دیتا ہے پھر تم اس سے اور آگ سلگا لیتے ہو''۔

اس میں اُن کا کہنا ہے کہ: ﴿الشجر الأخضر﴾ سے مراد حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ﴿نارًا﴾ سے مراد نور یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، ﴿فاذا أنتم منه توقدون﴾ کا معنی ہے کہ ''تم اس سے دین حاصل کرتے ہو! یہ تفسیر نہایت عجیب وغریب ہے کہ جس پر لغت دلالت نہیں کرتی، اور یہ الفاظِ قرآنی کی باطل تفسیر ہے اگر چہ اس کی سلاست عمدہ اور عبارت بہترین ہے۔

شیعوں کی تفاسیر کے چند نمونے: شیعوں کے مختلف فرقے ہیں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی محبت میں غلو کرتے ہیں، ان میں سے بعض تو شیعیت میں اس قدر غرق ہیں کہ کافر قرار دیئے گئے، ان کا سرفہرست لیڈر اور بانی ملعون یہودی ''ابن سبا'' ہے، جس نے اسلام کے ساتھ مکروہ فریب اور اس کے خلاف سازش کے ارادہ سے ہی اسلام قبول کیا، اور ان میں سے ایک فرقہ یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ جبرئیل امین علیہ السلام اترنے میں توازن کھو بیٹھے اور غلطی کر گئے، بایں معنیٰ کہ انہیں نبوت لے کر حضرت علی (رضی اللہ عنہ) پر اترنا تھا لیکن وہ چوک گئے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر جا اُترے، شیعوں کا یہ گروہ ہمیشہ سے مسلمانوں کے خلاف برسرپیکار رہا ہے، یہاں تک کہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بذاتِ خود ان کے کفر وضلال کی بنا پر ان پر پورش کی، ان سے جنگیں لڑیں اور ان پر حملہ آور ہوئے۔

ان میں سے بعض لوگ اعتدال پسند بھی ہیں، جو ابھی تک کفر کے گڑھے میں نہیں گرے، البتہ انہوں نے اہل سنت والجماعت کی مخالفت کی، اور یہ اعتقاد رکھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ تمام صحابہ سے بلکہ حضرت اُبوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے بھی افضل ہیں اور وہی خلافت کے اصل حق دار ہیں؛ کیوں کہ وہ آل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہیں، اور ان کا یہ اعتقاد ہے کہ تینوں خلفاء نے خلافت کا منصب سنبھالنے کی وجہ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حق چھین لیا۔

اور ان میں سے ایک گروہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت کا قائل ہے، اور بعض وہ ہیں جو اس پر صبر نہیں کرتے بلکہ شیخین یعنی حضرت اُبوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کو گالیاں دیتے ہیں اور انہیں گمراہ خیال کرتے ہیں (العیاذ باللہ) جبکہ اللہ تعالیٰ نے

متعدد آیات میں ان کی مدح سرائی فرمائی ہے اور انہیں اپنے پیارے نبی ﷺ کے خاص رفقاء میں سے قرار دیا ہے۔

اب ہم ''اثنا عشریہ'' اور ''سبائیہ'' شیعوں کے دونوں گروہوں کی طرف سے کی گئی کتاب اللہ کی تفاسیر کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

شیعہ اثنا عشریہ کی تفسیریں: ۱- ﴿ثم...﴾ ''پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کردیں''۔

شیعہ اس کی تفسیر یہ کرتے ہیں کہ امام علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات کے ذریعے وہ اپنا میل کچیل دور کردیں۔

۲- ﴿یوم...﴾ ''جس روز ہلا دینے والی چیز ہلا ڈالے گی (مراد نفخۂ اُولیٰ ہے) جس کے بعد ایک پیچھے آنے والی چیز آوے گی (مراد نفخۂ ثانیہ ہے)''۔

﴿الراجفة﴾ سے مراد حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ﴿الرادفة﴾ سے مراد اُن کے والد حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں۔

۳- ﴿انما...﴾ ''تمہارے دوست تو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور ایمان دار لوگ ہیں''۔

ایمان والوں سے مراد بارہ امام ہیں۔

۴- ﴿لا تتخذوا...﴾ ''دو معبود مت بناؤ''۔ یعنی دو امام مت بناؤ امام تو صرف وہی ایک ہیں۔

۵- ﴿وأشرقت...﴾ ''اور زمین اپنے رب کے نور (بے کیف) سے روشن ہوجائے گی''۔

یعنی امام علی رضی اللہ عنہ کے نور سے روشن ہوجائے گی۔

۶- ﴿مثل...﴾ ''جو لوگ اپنے پروردگار کے ساتھ کفر کرتے ہیں اُن کی حالت باعتبار عمل کے یہ ہے کہ جیسے کچھ راکھ ہو جس کو تیزی کے ساتھ ہوا اڑا لے جائے''۔

وہ دریدہ دہن اس کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ جو علی علیہ السلام کی ولایت کا اقرار نہ کرے تو اس کا عمل باطل اور اس راکھ جیسا ہے جسے ہوا اُٹھاتی اور بکھیر دیتی ہے۔

۷- ﴿یلیتنی...﴾ ''کاش! میں مٹی ہوجاتا (تاکہ عذاب سے بچتا)''۔

مطلب یہ ہے کہ کاش! میں اَبوتراب کی جماعت سے ہوتا، یہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے۔

فرقۂ سبائیہ کی تفاسیر کے چند نمونے: ۱- سبائیہ بھی شیعوں کا ایک فرقہ ہے، اُن کا خیال یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ بادلوں میں ہیں، اور ﴿الرعد﴾ یعنی بجلی کی کڑک کی تفسیر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آواز سے کرتے ہیں، اور ﴿البرق﴾ یعنی آسمانی بجلی سے ان کے کوڑے کی چمک یا اُن کی مسکراہٹ مراد لیتے ہیں، اور ان میں سے جب کوئی بجلی کی کڑک کی آواز سنتا ہے تو وہ کہتا ہے: "السلام علیک یا أمیر المؤمنین!"۔ اے أمیر المؤمنین آپ پر سلام ہو!

۲- اُن کے من گھڑت عقائد میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیوی زندگی کی طرف دوبارہ آئیں گے اور اس پر استدلال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے کرتے ہیں:

﴿ان الذی...﴾ "جس خدا نے آپ پر قرآن (کے احکام پر عمل اور اس کی تبلیغ) کو فرض کیا ہے وہ آپ کو (آپ کے) اصلی وطن (یعنی مکہ) میں پھر پہنچائے گا"۔ یعنی وہ آپ کو عنقریب دنیا کی طرف پھر لوٹائے گا۔

۳- اور آیتِ امانت یہ ہے: ﴿انا عرضنا...وحملها...﴾ "ہم نے یہ امانت (یعنی احکام جو بمنزلہ امانت کے ہیں) پیش کی تھی...... اور انسان نے اس کو اپنے ذمہ لے لیا، وہ ظالم اور جاہل ہے"۔

اُن کا زعم باطل یہ ہے کہ ظلوم وجہول أبو بکر رضی اللہ عنہ ہیں (نعوذ باللہ من ذٰلک)۔

۴- اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿کمثل ...﴾ "شیطان کی سی مثال ہے کہ (اول تو) انسان سے کہتا ہے کہ تو کافر ہو جا"۔

اس آیت میں شیطان کی تفسیر عمر رضی اللہ عنہ سے کرتے ہیں۔ (نعوذ باللہ من ذلک)۔

شیعوں کی تفاسیر میں سے ایک کتاب ہے جس کا نام "مرآۃ الأنوار ومشکاۃ الاسرار" ہے، اور یہ چھپ چکی ہے، اس کے مؤلف کو مولیٰ کازلانی نجفی کہا جاتا ہے، یہ تفسیر ایسی تاویلات پر مشتمل ہے جو باطنیہ کی تاویلات سے ملتی جلتی ہیں، چنانچہ وہ "أرض" کی تفسیر دین، أئمہ علیہم السلام، جماعتِ شیعہ، اُن سینوں سے جو علم کا محل اور جائے قرار ہیں، اور سابقہ امتوں کے قصوں سے کرتا ہے...... الخ۔

چنانچہ اللہ کا ارشاد ہے: ﴿ألم تکن...﴾ "کیا خدائے تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی"۔

اس ارشاد میں وہ کہتا ہے کہ ﴿أرض الله﴾ سے مراد دین الٰہی اور کتاب اللہ ہے۔
اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿أفلم...﴾ ''کیا ان لوگوں نے ملک میں چل پھر کر نہیں دیکھا''۔
میں وہ کہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کیا وہ قرآن میں غور نہیں کرتے......الخ۔
تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے ایک ایسے لفظ کو جس کے معنی سے کوئی بھی ناواقف نہیں بغیر کسی دلیل کے نامانوس معانی پر محمول کیا ہے، اور اس بات پر اسے صرف خواہشات اور اپنے مذہب کے اندھے تعصب کے معجون نے ہی اکسایا ہے، اس بات کی گمراہی میں کوئی شک نہیں جو کہ باطنیہ اور بہائیہ فرقوں کی گمراہی سے کسی قدر کم نہیں۔
باطنیہ کی تفاسیر: باطنیہ ایک ایسی قوم ہے جو قرآن کے ظاہری معنیٰ کو لینے سے انکار کرتی ہے اور کہتی ہے کہ قرآن ظاہر و باطن پر مشتمل ہے، اور یہ اعتقاد رکھتی ہے کہ اس میں مراد صرف باطن ہے نہ کہ ظاہر، اُن کا استدلال اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ہے:
﴿فضرب...﴾ ''پھر ان (فریقین) کے درمیان میں ایک دیوار قائم کردی جائے گی جس میں ایک دروازہ (بھی) ہوگا (جس کی کیفیت یہ ہے کہ) اس کے اندرونی جانب رحمت ہوگی اور بیرونی جانب کی طرف عذاب ہوگا''۔
باطنیہ کے فرقے: باطنیہ کے بہت سے فرقے ہیں جن میں سے ہم چند خاص فرقوں کا ذکر کرتے ہیں:
۱- **اسماعیلیہ:** یہ فرقہ جعفر صادق رحمہ اللہ کے بڑے بیٹے اسماعیل کی طرف منسوب ہے، اور اسے امام گردانتا ہے۔
۲- **قرامطہ:** واسط کے ایک گاؤں ''قرمط'' کی طرف منسوب ہے، ان کا لیڈر ''قرمط'' کا ایک آدمی تھا جس کا نام ''حمدان'' تھا۔
۳- **سبعیہ:** ''سبعة'' یعنی سات کی طرف منسوب ہے؛ کیوں کہ ان کا اعتقاد ہے کہ ان میں سے ہر سات میں ایک امام ہونا ضروری ہے جس کی اقتدا کی جائے۔
۴- **حرمیہ:** حرمت کی طرف منسوب ہے؛ کیوں کہ یہ لوگ حرام کردہ اشیاء اور فواحش کو جائز سمجھتے ہیں۔

باطنیہ کی تفسیروں سے چند مثالیں: ۱- فرمان الٰہی ہے: ﴿لترکبن...﴾ ''تم کو ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچنا ہے''۔

اُن کا کہنا ہے کہ انبیاء کے بعد اُوصیاء سے غداری کرنے کی طرف اشارہ ہے، یعنی مطلب یہ ہے کہ تم انبیاء کے بعد اماموں سے غداری کرنے میں ضرور اپنے سے پہلے لوگوں کے رستے پر چلو گے۔

۲- اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ﴾ ''تو یہ لوگ جن کو ہمارے پاس آنے کا کھٹکا نہیں ہے (آپ سے) یوں کہتے ہیں کہ اس کے سوا کوئی (پورا) دوسرا قرآن ہی لائیے یا (کم سے کم) اس میں کچھ ترمیم کر دیجئے''۔

﴿أو بدّله﴾ کی تفسیر میں کہتے ہیں کہ علی کو بدل دیجئے جبکہ ظاہر ہے کہ حضرت علی کا ما قبل میں ذکر نہیں ہوا۔

۳- اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿ان الذین...﴾ ''بلاشبہ جو لوگ مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کافر ہو گئے پھر مسلمان ہوئے پھر کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ تعالیٰ ایسوں کو ہرگز نہ بخشیں گے اور نہ ان کو (منزل مقصود یعنی بہشت کا) راستہ دکھلائیں گے''۔

اُن کا کہنا ہے کہ یہ آیت اُبوبکر، عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے بارے میں نازل ہوئی کہ انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلے ایمان لایا پھر جب حضرت علی کی ولایت ان پیش کی گئی تو انہوں نے کفر کیا پھر علی کی بیعت پر ایمان لائے پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کے بعد دوبارہ کافر ہو گئے پھر تمام امت سے بیعت لینے کی وجہ سے کفر میں بڑھتے چلے گئے۔

۴- ارشاد پاک ہے: ﴿ان الله...﴾ ''حق تعالیٰ تم کو حکم دیتے ہیں کہ تم ایک بیل ذبح کرو''۔

ان کا کہنا ہے کہ ﴿بقرۃ﴾ سے مراد 'عائشہ' ہیں اور ﴿اضربوہ ببعضها﴾ میں مقتول سے مراد طلحہ و زبیر ہیں۔

۵- اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ﴾ ''بے شک شراب اور جوا''۔

ان کا کہنا ہے کہ ﴿الخمر﴾ اور ﴿المیسر﴾ سے مراد ابوبکر و عمر ہیں! خدا اِن کو غارت کرے (دین حق سے) کہاں پھرے چلے جاتے ہیں؟! مختصر یہ کہ باطنیہ کا مسلک ایک سخت قسم کی وباء اور گمراہی ہے جو ان کی طرف مجوسیوں سے منتقل ہو کر آئی ہے۔

یہ لوگ جنابت کی تفسیر راز کے فاش کرنے سے، غسل کی تفسیر تجدیدِ عہد سے، تیمم کی تفسیر ماذون سے اخذ کرنے سے، روزے کی تفسیر افشائے راز سے منع کرنے سے کرتے ہیں، اور اس کے علاوہ بھی ان کی گمراہ کن تفاسیر اور غلاظت سے بھری ہوئی باتیں ہیں!

ان بدبختوں کی یہ باطل تفسیریں اسلام اور مسلمانوں کو پہنچنے والی مصیبتوں میں سب سے زیادہ سخت اور مجروح کن ہیں؛ کیوں کہ یہ شریعت کی عمارت کو ایک ایک اینٹ کر کے توڑنے کا سبب ہیں، اور قرآن کو اِن چوپایوں کے ہاتھوں میں بازیچہ بنا دیتی ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ ان کی کتابیں منظر عام پر نہیں آتیں اور وہ لوگ انہیں اپنے سینوں میں چھپاتے رہتے ہیں، اور وقتاً فوقتاً اس زہر کو اگلتے رہتے ہیں، اور انشاء اللہ یہ لوگ دن بدن زوال اور فنا کی طرف رواں دواں ہیں: ﴿وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ”اور اللہ تعالیٰ اپنے کام پر غالب ہیں لیکن اکثر آدمی نہیں جانتے“۔

تفسیر منقولی، تفسیر معقولی اور تفسیر اشاری کی مشہور کتابیں اور ان کے مؤلفین کا مختصر تعارف

مشہور کتبِ تفسیر بالدرایة

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مؤلف کا نام	تاریخ وفات	تفسیر کا مشہور نام
۱	جامع البیان فی تفسیر القرآن	محمد بن جریر طبری	۳۱۰ھ	تفسیر طبری
۲	بحر العلوم	نصر بن محمد سمرقندی	۳۷۳ھ	تفسیر سمرقندی
۳	الکشف والبیان	احمد بن ابراہیم ثعلبی نیشاپوری	۴۲۷ھ	تفسیر ثعلبی

۴	معالم التنزیل	حسین بن مسعود بغوی	۵۱۰ھ	تفسیر بغوی
۵	المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز	عبدالحق بن غالب اندلسی	۵۴۶ھ	تفسیر ابن عطیہ
۶	تفسیر القرآن العظیم	اسماعیل بن عمرو دمشقی	۷۷۴ھ	تفسیر ابن کثیر
۷	الجواھر الحسان فی تفسیر القرآن	عبدالرحمن بن محمد ثعالبی	۸۷۶ھ	تفسیر جواہر
۸	الدر المنثور فی التفسیر الماثور	جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ	تفسیر سیوطی

کتب تفسیر بالماثور کا تعارف

۱-تفسیر ابن جریر: اس کے مؤلف ابن جریر طبری ہیں، ان کنیت اَبوجعفر ہے، ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۳۱۰ھ میں انتقال ہوا، ان کی یہ تفسیر کتب تفاسیر ماَثورہ میں سب سے زیادہ بلند مرتبہ کی حامل، صحیح اور صحابہ وتابعین رضی اللہ عنھم کے اقوال کی جامع ترین کتاب ہے، اور مفسرین کا پہلا مرجع سمجھی جاتی ہے۔ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ''علم تفسیر میں ابن جریر کی کتاب جیسی کسی نے نہیں لکھی''۔

تفسیر ابن جریر کی خصوصیات: ۱- نبی اَکرم ﷺ، صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول اقوال پر اعتماد کرنا۔

۲- اَسانید اور اَقوال مرویہ کو پیش کرنا اور روایات کو ترجیح دینا۔

۳- ناسخ ومنسوخ آیات کا احاطہ کرنا اور صحیح وضعیف روایتوں کے طرق کو پہچاننا۔

۴- وجوہِ اعراب اور آیاتِ مبارکہ میں احکام شرعیہ کے استنباط کا ذکر کرنا۔

آخری بات یہ ہے کہ یہ ایک عظیم اور بلند پایہ کتاب ہے، جو کئی امتیازی خصوصیات کی جامع ہے، مگر یہ بات ہے کہ وہ کبھی غیر صحیح اسانید کے ساتھ روایات ذکر کر لیتے ہیں مگر ان کے ضعف پر تنبیہ نہیں کرتے، اسی طرح وہ بعض اسرائیلی روایات کو بھی لاتے ہیں۔ ان کی یہ تفسیر مطبوع شدہ ہے، چاردانگ اس کا چرچا ہے اور اکثر مفسرین کا سہارا ہے۔

۲-تفسیر سمرقندی: اس کے مؤلف نصر بن محمد سمرقندی ہیں، ان کی کنیت اَبواللیث ہے، ۳۷۳ھ میں وفات پائی، کتاب کا نام ''بحر العلوم'' ہے، یہ تفسیر بالماَثور ہے، آپ اس میں

صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال کو بہت زیادہ ذکر کرتے ہیں، البتہ اسانید کا ذکر نہیں کرتے، یہ دو جلدوں پر مشتمل غیر مطبوع کتاب ہے، اور اس کا ایک قلمی نسخہ مکتبۂ ازہر میں بھی موجود ہے۔

۳۔تفسیر ثعلبی: اس کے مؤلف أحمد بن ابراہیم ثعلبی نیشاپوری ہیں، آپ قاری اور مفسر تھے، آپ کی کنیت أبو اسحاق ہے، ۴۲۷ھ میں وفات ہوئی، تاہم آپ کی تاریخ ولادت کا صحیح طور پر علم نہیں، کتاب کا نام "الکشف والبیان عن تفسیر القرآن" ہے۔

قرآن کی تفسیر اسلاف سے منقول کلام کے ذریعے کرتے ہیں، اور دیباچۂ کتاب میں اسانید کے ذکر کو کافی سمجھتے ہوئے مختصر طور پر اسناد کا ذکر کرتے ہیں، نحوی اور فقہی ابحاث کو خوب پھیلا کر بیان کرتے ہیں، اور قصوں اور کہانیوں کے بہت دلدادہ ہیں، اس لئے ہم ان کی تفسیر میں نہایت ہی عجیب وغریب اسرائیلی روایات کو بھی پاتے ہیں، بلکہ ان میں سے بعضے تو سرے سے ہی باطل ہیں۔

علامہ ابن تیمہ رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ثعلبی میں فی نفسہ تو بھلائی اور دین ہے، لیکن وہ رات میں لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح (ہر قسم کی روایات کو لے لیتے) ہیں۔ ان کی تفسیر ایک مخطوطہ کی شکل میں نامکمل ہے جو کہ سورۂ فرقان پر ختم ہوتی ہے۔ یہ بھی مکتبۂ ازہر میں موجود ہے، جبکہ بقیہ کتاب لاپتہ ہے۔

۴۔تفسیر بغوی: اس کے مؤلف حسین بن مسعود فراء بغوی ہیں، آپ فقیہ، مفسر اور محدث تھے، "محیی السنۃ" کے لقب سے مشہور ہیں، کنیت أبو محمد ہے، ۵۱۰ھ میں اسی سال سے زائد عمر میں وفات پائی، آپ جلیل القدر امام، متقی، زاہد اور علم وعمل کے جامع شخص تھے۔ علامہ سبکی رحمہ اللہ نے آپ کو شافعی علماء کے چوٹی کے عالموں میں شمار کیا ہے۔ علامہ ابن تیمہ رحمہ اللہ اصول تفسیر کے بیان میں اپنی کتاب کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ بغوی اپنی تفسیر میں ثعلبی سے زیادہ اختصار کرتے ہیں، لیکن ان کی تفسیر من گھڑت روایات اور اختراعی اقوال سے محفوظ ہے۔

یہ تفسیر تفسیر ابن کثیر کے ساتھ مل کر چھپی ہے جیسا کہ تفسیر خازن کے ساتھ بھی طبع کی گئی ہے، اور ان کی اس تفسیر میں بعض اسرائیلی روایات بھی ہیں، لیکن مجموعی لحاظ سے وہ بہت ساری تفسیر بالمأثور کی کتابوں سے بہترین اور محفوظ ترین کتاب ہے۔

۵-تفسیر ابن عطیہ: اس تفسیر کے مؤلف عبدالحق بن غالب بن عطیہ اندلسی، مغربی، غرناطی ہیں، کنیت اَبومحمد ہے، ۴۸۱ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۶ھ میں وفات پائی۔ آپ بڑے نحوی، لغوی، اَدیب، شاعر اور ذکاوت و معاملہ فہمی کے اعلی درجہ پر فائز تھے، اسلام کے سنہری دور میں اندلس میں قاضی رہے۔

ان کی تفسیر کا نام "المحرر الوجیز في تفسیر الکتاب العزیز" ہے، مؤلف نے اس تفسیر میں وہ اقوال جمع کیے ہیں جو علمائے تفسیر بالماثور نے ذکر کیے ہیں، اور ان اقوال میں بھی جو صحت کے زیادہ قریب ہیں ان کے جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ تفسیر ابن عطیہ اور تفسیر زمخشری میں موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تفسیر ابن عطیہ، تفسیر زمخشری سے بہت بہتر نقل و بحث کے اعتبار سے صحیح ترین اور بدعت سے کوسوں دور ہے، اگرچہ وہ بعض اختراعات پر بھی مشتمل ہے لیکن تفسیر زمخشری سے پھر بھی کئی درجے بہتر ہے، بلکہ شاید کہ وہ ان تفاسیر میں راجح ترین تفسیر ہے۔

یہ تفسیر اپنی بے حد شہرت اور انفرادی خصوصیات کے باوجود آج تک غیر مطبوع ہے، یہ دس بڑی بڑی جلدوں پر مشتمل ہے، شاید کہ اللہ تعالیٰ کسی کو توفیق دے دیں کہ وہ ہمارے لئے اس قیمتی خزانے کو نکال کر اسے طبع کرادے تاکہ اس کا نفع اس کے ذریعے عام ہو جائے۔

۶-تفسیر ابن کثیر: اس کے مؤلف حافظ عمادالدین اسماعیل بن عمرو بن کثیر قرشی دمشقی ہیں، کنیت اَبوالفداء ہے، ۷۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۷۷۴ھ میں وفات پائی۔ آپ تمام علوم میں اور خاص طور پر تاریخ، حدیث اور تفسیر میں عظیم پہاڑ اور بحر بیکراں تھے۔ اور جلیل القدر امام اور تحریر و تصنیف میں بہت بڑے ماہر تھے۔ علامہ ذہبی رحمہ اللہ ان کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ امام، مفتی، باکمال محدث، ماہر فقیہ، مضبوط محدث اور عظیم نقل نویس مفسر ہیں، اور آپ کی بہت سی مفید تصانیف ہیں۔

آپ کی اس تفسیر کا نام "تفسیر القرآن العظیم" ہے، یہ کتاب تفسیر بالمأثور میں تصنیف کی جانے والی کتابوں میں سب سے زیادہ مشہور ہے، اسے تفسیر طبری کے بعد دوسرے درجہ پر سمجھا جاتا ہے، اس میں مؤلف نے مفسرین اسلاف سے روایت کرنے کا اہتمام کیا ہے، چنانچہ آثار و روایات کو ان کے اَصحاب تک سند کے ساتھ روایت کیا ہے، اور بعض

کے متعلق جرح وتعدیل بھی فرمائی ہے، ان میں سے منکر اور ضعیف روایات پر رد فرمایا ہے، اسی لئے ان کی تفسیر تفسیر بالمأثور میں لکھی جانے والی کتابوں میں سب سے زیادہ بہتر کتاب سمجھی جاتی ہے۔

تفسیر میں ان کا طریقۂ کار یہ ہے کہ آیت کو ذکر کر کے اس کی بالکل آسان اور مختصر عبارت سے تفسیر کرتے ہیں اور پھر دوسری آیات سے اس کے لیے شواہد بیان کرتے ہیں، اور پھر ان آیات کے درمیان موازنہ کرتے ہیں؛ تاکہ معنی ظاہر اور مراد صاف ہوجائے۔ اور تفسیر کی اس نوع کا بہت زیادہ اہتمام کرتے ہیں جسے علمائے کرام ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کہتے ہیں۔ میں ان کی تفسیر کے دیباچہ میں ذکر کردہ کلام کا ایک حصہ ذکر کرتا ہوں:

علامہ ابن کثیر طیب اللہ ثراہ فرماتے ہیں کہ: ''اگر کوئی کہنے والا یہ کہے کہ تفسیر کا بہترین طریقہ کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں صحیح ترین طریقہ یہ ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن سے کی جائے؛ کیوں کہ جو بات ایک جگہ مجمل ہے تو دوسری جگہ اس کی تفصیل بیان کردی گئی ہے، پھر اگر یہ بات آپ کو تھکا دے اور آپ اس سے عاجز آجائیں تو تم پر سنت کو لینا لازم ہے؛ کیوں کہ سنت قرآن کی شارح اور اسے وضاحت کے ساتھ بیان کرنے والی ہے، بلکہ امام شافعی رحمہ اللہ نے تو یہاں تک فرمادیا کہ جس بات کا بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بیان کیا ہے وہ آپ علیہ السلام نے قرآن سے سمجھا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''بیشک ہم نے آپ کے پاس یہ نوشتہ بھیجا ہے واقع کے موافق؛ تاکہ آپ لوگوں کے درمیان اس کے موافق فیصلہ کریں جو کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو بتلادیا ہے''۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''باخبر رہو کہ مجھے قرآن اور اس کے مثل اور بھی عنایت کیا گیا ہے''۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ کی امتیازی خوبی یہ ہے کہ وہ تفسیر بالمأثور میں موجود اسرائیلیات میں سے ناقابل تسلیم باتوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان سے ڈراتے ہیں، مختصر یہ ہے کہ ابن کثیر رحمہ اللہ کا علم ان کی تفسیر وتاریخ کا مطالعہ کرنے والے پر خوب چمکتا ہے، اور آپ کی تفسیر وتاریخ آپ کی تصنیفات وتالیفات میں سب سے افضل اور بہتر ہیں، آپ کی یہ تفسیر تفاسیر مأثورہ میں اُصح ترین تفسیر ہے، اگرچہ یہ خود تمام کی تمام

أصح نہیں ہے [1]۔

۷-تفسیر جواہر: اس تفسیر کے مؤلف جلیل القدر امام عبدالرحمن بن محمد بن مخلوف ثعالبی، جزائری، مغربی ہیں، ۸۷۶ھ میں وفات پائی، ان کی یہ تفسیر تفسیر ماثور کی قبیل سے ہے، اس میں انہوں نے سلفِ صالحین کے اقوال کونقل کیا ہے، اور کھرے اور کھوٹے میں تمیز کی ہے، آپ کی یہ تفسیر چھپ چکی ہے۔

۸-تفسیر سیوطی: اس تفسیر کے مؤلف حجت، ثقہ، امام جلال الدین سیوطی ہیں، مشہور کتابوں کے مؤلف ہیں، ۸۴۹ھ میں ولادت ہوئی اور ۹۱۱ھ میں وفات پائی، آپ کی تفسیر کا نام ''الدر المنثور في التفسير بالمأثور'' ہے، دیباچۂ کتاب میں فرماتے ہیں کہ انہوں نے اس کتاب کی ''ترجمان القرآن'' سے تلخیص کی ہے۔

اس تفسیر کی اسناد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچتی ہے، یہ تفسیر مصر میں چھپ چکی ہے، اور آپ نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں ذکر کیا ہے کہ انہوں نے ایک ایسی تفسیر شروع کی ہے جو تفاسیر منقولہ، اقوال معقولہ، استنباط، اشارات، وجوہ اعراب، لغات، نکات بلاغت اور محاسن بدیع وغیرہ ہر ضروری چیز کو جامع ہوگی، اور اس کا نام ''مجمع البحرين و مطلع البدرين'' رکھا ہے، اور یہ تفسیر اس تفسیر کے علاوہ ہے جس کا نام ''الدر المنثور'' ہے۔

میں نے ان کی تالیفات کو شمار کیا تو وہ ۵۰۰ کے قریب پہنچ گئیں، علم کی راہ میں پیش کی جانے والی خدمات کی بنا پر اللہ تعالیٰ ان پر ڈھیروں رحمتیں نازل فرمائے (آمین!)

مشہور کتبِ تفسیر بالرائے

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مؤلف کا نام	تاریخ وفات	تفسیر کا مشہور نام
۱	مفاتيح الغيب	محمد بن عمر بن حسین رازی	۶۰۶ھ	تفسیر رازی
۲	انوار التنزيل وأسرار التاويل	عبداللہ بن عمر بیضاوی	۶۸۵ھ	تفسیر بیضاوی
۳	لباب التاويل فی معانی التنزيل	عبداللہ بن محمد المعروف بالخازن	۷۴۱ھ	تفسیر خازن
۴	مدارک التنزيل وحقائق التاويل	عبداللہ بن احمد نسفی	۷۰۱ھ	تفسیر نسفی

(۱) تفسیر ابن کثیر، تفسیر ابن جریر کا بہترین خلاصہ اور معیاری نچوڑ ہے جو تفسیر ابن جریر سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

۵	غرائب القرآن ورغائب الفرقان	نظام الدین الحسن محمد نیشاپوری	۷۲۸ھ	تفسیر نیشاپوری
۶	ارشاد العقل السلیم	محمد بن محمد مصطفی طحاوی	۹۵۲ھ	تفسیر أبی سعود
۷	البحر المحیط	محمد بن یوسف بن حیان اندلسی	۷۴۵ھ	تفسیر أبی حیان
۸	روح المعانی	شہاب الدین محمد آلوسی بغدادی	۱۲۷۰ھ	تفسیر آلوسی
۹	السراج المنیر	محمد شربینی الخطیب	۹۷۷ھ	تفسیر خطیب
۱۰	تفسیر الجلالین	۱۔جلال الدین محلی	۸۴۶ھ	
		۲۔جلال الدین سیوطی	۹۱۱ھ	تفسیر جلالین

کتبِ تفسیر بالرّائی کا تعارف

۱۔تفسیر فخر رازی: اس تفسیر کے مؤلف حضرت علامہ شیخ محمد بن عمر رازی ہیں، ۶۰۶ھ میں وفات پائی، ان کی تفسیر کا نام "مفاتیح الغیب" ہے، آپ نے اپنی اس تفسیر میں حکمائے تھیالوجی کی روش اپنائی ہے اور اپنے دلائل کو مباحثِ الٰہیات (تھیالوجی) کے سانچہ میں ڈھالا ہے، معتزلہ اور دیگر گمراہ فرقوں پر نا قابل تردید دلائل اور براہین قاطعہ کے ذریعے رد کیا ہے، اور منکرین وجاحدین کے شبہات کا نقض وابطال کے ذریعے سے سامنا کیا ہے، آپ کی تفسیر علم کلام کے موضوع میں وسیع ترین تفسیر ہے، جیسا کہ آپ خود سائنسی اور کائناتی علوم میں بہت بڑے امام ہیں، آپ نے اس تفسیر میں افلاک، برجوں، آسمان وزمین، حیوان ونباتات اور انسان کے اجزاء کے بارے میں سیر حاصل بحث کی ہے، اور اس سے آپ کی غرض حق کی نصرت، وجود باری تعالیٰ پر دلائل قائم کرنا اور اہل زیغ وضلال پر رد کرنا ہے۔

۲۔تفسیر بیضاوی: اس تفسیر کے مؤلف جلیل القدر عالم شیخ عبداللہ بیضاوی ہیں، ۶۸۵ھ میں وفات پائی، تفسیر کا نام "أنوار التنزیل" ہے، یہ ایک نہایت بلند پایہ، دقیق اور جامع المعقول والمنقول تفسیر ہے، اس میں آپ اہل سنت کے مسلک مضبوط دلائل قائم کرتے ہیں، آپ حجت اور ثبت عالم ہیں۔آپ نے ہر سورت کو اس کی فضیلت کے بارے میں مروی احادیث پر ختم کرنے کا التزام کیا ہے، البتہ یہ بات ضرور ہے کہ آپ نے صحیح حدیث

لینے کی سعی نہیں کی، اس تفسیر کے مختلف حواشی ہیں جن میں سب سے زیادہ مشہور حاشیہ شہاب خفاجی اور سعدی آفندی کا حاشیہ ہے۔

۳۔تفسیر خازن: اس تفسیر کے مؤلف امام عبداللہ بن محمد المعروف بالخازن ہیں، ۷۴۱ھ میں وفات پائی، ان کی تفسیر کا نام ''لباب التأویل فی معانی التنزیل'' ہے، یہ تفسیر بالمأثور کی مشہور ترین تفسیر ہے، مگر یہ کہ وہ اس میں سند کا ذکر نہیں کرتے، اس کی عبارت بہت سہل ہے جس میں نہ کوئی پیچیدگی ہے اور نہ ہی ابہام، وہ قصوں اور کہانیوں کو وسعت دینے کے بڑے دلدادہ ہیں، کبھی تو وہ اپنی تفسیر میں کوئی اسرائیلی روایت کا ذکر کرتے ہیں تاکہ اس میں موجود غلط بات کی نشاندہی کریں، چنانچہ وہ طویل قصہ لاتے ہیں پھر اس پر ضعیف یا جھوٹ ہونے کا حکم لگاتے ہیں، البتہ بعض اوقات ان قصوں کے بارے میں گفتگو کرنے سے سکوت اختیار کرتے ہیں جس سے قاری کو یہ گمان ہونے لگتا ہے کہ یہ قصہ صحیح ہے، تاہم آپ کی تفسیر بہت عمدہ اور بہترین ہے بشرطیکہ اس میں ان روایات اور قصوں کی بہتات نہ ہوتی جن کا ذکر کرنا مناسب نہیں؛ کیوں کہ وہ قصے یا تو ضعیف ہیں یا پھر من گھڑت۔

۴۔تفسیر نسفی: اس تفسیر کے مؤلف عالم زاہد شیخ عبداللہ بن احمد نسفی ہیں، ۷۰۱ھ میں وفات پائی، ان کی تفسیر کا نام ''مدارک التنزیل وحقائق التأویل'' ہے، یہ ایک جلیل القدر، متداول ومشہور، سہل اور دقیق تفسیر ہے، دیگر تفاسیر معقولہ کے مقابلہ میں یہ تفسیر مختصر اور متوسط سمجھی جاتی ہے، صاحبِ کشف الظنون اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ:

''یہ تفاسیر میں ایک متوسط، وجوہِ اعراب اور وجوہِ قراءت کو جامع، علم بدیع واشارت کے دقائق پر مشتمل، اہل سنت والجماعت کے اقوال کو قابل اعتبار بنانے والی، اور اہل بدعت وضلالت کی خرافات سے پاک کتاب ہے، وہ نہ ہی اکتا دینے والی طویل کتاب ہے اور نہ ہی معنیٰ میں بگاڑ پیدا کرنے والی مختصر کتاب ہے''۔

۵۔تفسیر نیشاپوری: اس تفسیر کے مؤلف شیخ نظام الدین الحسن محمد نیشاپوری ہیں، ۷۲۸ھ میں وفات پائی، تفسیر کا نام ''غرائب القرآن ورغائب الفرقان'' ہے، یہ تفسیر اپنی عبارت کے سہل ہونے، الفاظ کی تحقیق، نیز زائد اور پیچیدہ ابحاث سے خالی ہونے کی وجہ سے منفرد وممتاز ہے، آپ نے اس میں دو باتوں کا بہت اہتمام والتزام کیا ہے: ا۔قراءتوں

پر بحث۔ ۲۔ تفسیر اشاری پر کلام۔

یہ تفسیر ابن جریر کے حاشیہ پر عمومی طور پر چھپی ہوئی ملتی ہے، اور یہ بہت ساری اصلاحات کے اضافہ کے ساتھ امام فخر الدین رازی کی تفسیر کا اختصار ہے۔

۶۔ تفسیر اَبی سعود: اس تفسیر [1] کے مؤلف مشہور عالم، لغوی، مضبوط حجت، قاضی محمد بن محمد بن مصطفی طحاوی ہیں، جو کہ اَبو سعود کے لقب سے معروف ہیں، ۹۵۲ھ میں وفات پائی، ان کی تفسیر کا شمار بہترین اور جامع ترین تفاسیر میں ہوتا ہے، کیونکہ وہ طرز نگارش اور حسن تعبیر میں کمال تک پہنچی ہوئی ہے، آپ نے اس میں قرآنی بلاغت اور ربانی حکمتوں کے سربستہ رازوں کو کھول کر رکھ دیا ہے، اس کی حسن تعبیر آپ کو اپنا دلدادہ بنا دے گی، اور اس کی سلامت فکر آپ کو بھلی محسوس ہوگی، ذوق کی سلامتی، عقائد اہل سنت کی موافقت اور زائد وطوالت سے دوری کے ساتھ ساتھ قرآنی بلاغت کو روشن کرنے، اعجاز قرآنی کے بیان میں خصوصی توجہ دینے جیسے امتیازات آپ کو حیرت میں ڈال دیں گے، ان کی تفسیر انتہائی دقیق ہے، اس کے سمجھنے کے لیے خواص اہل علم کی ضرورت ہے۔

۷۔ تفسیر اَبی حیان: اس تفسیر کے مؤلف شیخ محمد بن یوسف بن حیان اَندلسی ہیں، ۷۴۵ھ میں وفات پائی، تفسیر کا نام "البحر المحیط" ہے، آٹھ ضخیم جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں مؤلف نے نحو، صرف، بلاغت، فقہی احکام اور دیگر مختلف علوم کی انواع کو جمع کیا ہے، اس تفسیر کو مآخذ تفاسیر میں بہت اہم ماخذ سمجھا جاتا ہے، اس کی عبارت انتہائی سہل ہے، کوئی پیچیدگی اور ابہام نہیں، اور اس کا نام آپ نے "البحر المحیط" اس وجہ سے رکھا ہے کہ اس میں مضمون تفسیر سے متعلق مختلف علوم کی بہتات ہے۔

۸۔ تفسیر آلوسی: اس تفسیر کے مؤلف ماہر عالم امام شہاب الدین سید محمود آلوسی ہیں، ۱۲۷۰ھ میں وفات پائی، آپ مفتی بغداد، حجۃ الادبائ، قدوۃ العلماء اور مرجع اہل فضل ومعرفت تھے، آپ فہم، علم اور وسیع معلومات میں بڑی قدر ومنزلت رکھتے تھے، آپ کی

---

(۱) اس کا پورا نام: "ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم" ہے، یہ بسا اوقات زمخشری کی کشاف سے بے نیاز کردیتی ہے۔

کتاب کا نام "روح المعانی"(۱) ہے، یہ کتاب اسلاف کی آراء مرویہ ومعقولہ کو جامع، اہل علم کے اقوال پر مشتمل اور گذشتہ تمام تفاسیر کا جامع خلاصہ ہے، آپ اسرائیلی روایات پر بہت زیادہ تنقید کرتے ہیں، جبکہ تفسیر اشاری اور بلاغت وبیان کی وجوہ کا اہتمام کرتے ہیں، آپ کی تفسیر کو تفسیر منقولی، تفسیر معقولی اور تفسیر اشاری کے علم میں بہتر مرجع گردانا جاتا ہے(۲)۔

---

(۱) اس تفسیر کا پورا نام: "روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی" ہے۔ علامہ بنوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ روح المعانی میرے نزدیک قرآن کریم کی ایسی تفسیر ہے جیسے کہ صحیح بخاری کی شرح فتح الباری، صرف فرق یہ ہے کہ فتح الباری ایک مخلوق کے کلام کی شرح ہے، اس لئے اس نے شرح صحیح بخاری کا جو قرضہ امت پر تھا اسے چکا دیا ہے، جبکہ اللہ کا کلام اس سے بلند وبرتر ہے کہ کوئی انسان اس کا حق ادا کر سکے، اگرچہ اس میں اپنی تمام تر توانیاں صرف کردے" (یتیمۃ البیان)۔

(۲) "السراج المنیر" اور "تفسیر الجلالین" کا تعارف مصنف نے ذکر نہیں کیا، ہم اجمالاً ان کا تذکرہ کردینا مناسب سمجھتے ہیں:

السراج المنیر: اس تفسیر کا پورا نام: "السراج المنیر فی الاعانۃ علی معرفۃ بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر" ہے، یہ علامہ شمس الدین محمد بن شیربینی قاہری شافعی (متوفی: ۹۷۷ھ) کی تالیف ہے، تفسیر میں اُصح الاقوال، ضروری اعرابات، قراآتِ متواترہ، اشکالات کے جوابات، آیات کے درمیان مناسبت اور فقہی مسائل ذکر کرتے ہیں، احادیثِ ضعیفہ وموضوعہ میں علامہ زمخشری اور علامہ بیضاوی کا تعقب بھی کرتے ہیں، یہ تفسیر نہ تو زیادہ طویل ہے اور نہ ہی بالکل مختصر، بلکہ اختصار وجامعیت کا حسین امتزاج ہے۔

تفسیر الجلالین: اس تفسیر کو لکھنے والے دو جلیل القدر ائمہ ہیں، امام جلال الدین محلی (متوفی: ۸۶۴ھ) نے اس کی ابتدا فرمائی اور سورۂ کہف سے لے کر آخر قرآن اور پھر سورۂ فاتحہ کی تفسیر لکھی، لیکن پھر مکمل نہ کر سکے، اور امام جلال الدین سیوطی (متوفی: ۹۱۱ھ) نے اپنے استاذ کی تفسیر کا تتمہ لکھنا شروع کیا، اور سورۂ بقرہ سے شروع کر کر کے سورۂ اسراء پر اختتام فرمایا، اس تفسیر کا شمار ان تفاسیر میں ہوتا ہے جو انتہائی مقبول ومتداول اور کثیر النفع ہیں۔ آیات کی بقدرِ ضرورت ایسی تفسیر بیان کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ باہم مربوط ہو جاتی ہیں، لغت، قراءت، ناسخ ومنسوخ، مفردات کی وضاحت اور جملوں کی اعرابی حیثیت بھی بیان کرتے ہیں، یہ تفسیر منقول معقول کا بہترین ذخیرہ ہے، البتہ بعض جگہوں میں اس میں موضوع احادیث پر بھی اعتماد کیا گیا ہے اور شان نزول میں من گھڑت قصے اور کہانیاں بھی موجود ہیں، اس کے مطالعہ کے وقت تفسیر ابن کثیر کا سامنے ہونا ضروری ہے تاکہ موضوع اور ضعیف روایات کی تصحیح ہو سکے۔

آیات الاحکام کی مشہور تفاسیر

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مؤلف کا نام	مذہب	تاریخ وفات	تفسیر کا مشہور نام
۱	أحکام القرآن (۱)	احمد بن علی رازی جصاص	حنفی	۳۷۰ھ	تفسیر جصاص
۲	أحکام القرآن (۲)	علی بن محمد طبری کیا الہراسی	شافعی	۵۰۴ھ	تفسیر کیا الہراسی
۳	الاکلیل فی استنباط التنزیل	جلال الدین سیوطی	شافعی	۹۱۱ھ	تفسیر سیوطی
۴	أحکام القرآن (۳)	محمد بن عبداللہ اندلسی	مالکی	۵۴۳ھ	تفسیر ابن العربی
۵	الجامع لاحکام القرآن (۴)	محمد بن احمد بن فرح قرطبی	مالکی	۶۷۱ھ	تفسیر قرطبی

(۱) یہ تفسیر ابوبکر احمد بن علی رازی متوفی: ۳۷۰ھ معروف بہ امام جصاص کی ہے، فقہی تفسیروں میں اہم تفسیر مانی جاتی ہے، خصوصاً احناف کے ہاں، اس کی تبویب فقہی ترتیب کے مطابق کی گئی ہے، فقہی اختلاف بیان کر کے فقہِ حنفی کو ترجیح دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ امام طحاوی کی ''أحکام القرآن'' بھی فقہائے حنفیہ کی زبردست تفسیر ہے جو دو جلدوں میں استنبول سے چھپی ہے۔ نیز دور حاضر میں حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کے افادات وافکار کے مطابق ''أحکام القرآن'' نہایت عمدہ اور معتدل آیاتِ احکام کی تفسیر ہے، جو علامہ ظفر احمد عثمانی، مفتی شفیع دیوبندی، مولانا ادریس کاندھلوی رحمھم اللہ کی بہترین کاوش ہے، جو تعصب سے کوسوں دور، دلائل و براہین سے مزین فقہِ حنفی کی بہترین ترجمان ہے، البتہ اس کی ترتیب ایک معمہ ہے جس کی طرف توجہ انتہائی ضروری ہے۔

(۲) یہ علامہ کیا الہراسی شافعی متوفی ۵۰۴ھ کی تالیف ہے، شافعیہ کے نزدیک اہم تفسیر شمار ہوتی ہے، جس طرح امام جصاص حنفی مسلک کی حمایت وطرف داری میں معروف ہیں اسی طرح مؤلف بھی ہر جگہ شافعی فقہ کی تائید کرتے ہیں۔

(۳) یہ محمد بن عبداللہ اندلسی مالکی (متوفی: ۵۴۳ھ) کی تالیف ہے تفسیر ابن العربی سے مشہور ہے، ابن العربی کبھی تو اعتدال سے کام لیتے ہیں اور مخالف مذہب والے پر برس پڑتے ہیں، اسرائیلی روایات بلکہ احادیثِ ضعیفہ کو بھی پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور ان سے اجتناب کرتے ہیں۔

(۴) اس کا پورا نام: ''الجامع لأحکام القرآن، والمبین لما تضمنہ من السنۃ وآی الفرقان'' ہے، تفسیر قرطبی کے نام سے مشہور ہے، مشہور محقق علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد بن ابی بکر قرطبی (متوفی: ۶۷۱ھ) کی تصنیف ہے، اصل موضوع قرآن کریم سے فقہی مسائل کا استنباط ہے، لیکن اس ضمن میں آیتوں کی لغت، اعراب، بلاغت، اور روایات کے اعتبار سے بھی خوب تفسیر بیان کی ہے، خاص طور پر روزمرہ کی زندگی کے لیے قرآن کریم کی ہدایات کو واضح فرمایا=

۶	کنز العرفان	مقداد بن عبداللہ سیوری	شیعی	۹ھ	تفسیر سیوری
۷	الثمرات الیانعۃ	یوسف بن أحمد ثلاثی	زیدی	۸۳۲ھ	تفسیر زیدی

تفسیر اشاری کی مشہور کتب

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مؤلف کا نام	تفسیر کا مشہور نام
۱	تفسیر القرآن الکریم (۱)	سہل بن عبداللہ تستری	تفسیر تستری
۲	حقائق التفسیر (۲)	أبو عبدالرحمن سلمی	تفسیر سلمی
۳	الکشف والبیان	أحمد بن ابراہیم نیشاپوری	تفسیر نیشاپوری
۴	تفسیر ابن عربی (۳)	محی الدین بن عربی	تفسیر ابن عربی
۵	روح المعانی (۴)	شہاب الدین محمود آلوسی	تفسیر آلوسی

= ہے، مالکی مسلک ہونے کے باوجود گروہی تعصب پاک نظر آتے ہیں اور دلیل و برہان کی پیروی کرتے ہیں، البتہ اس میں بعض ضعیف اور موضوع احادیث بھی موجود ہیں جن کی امام قرطبی نے نشاندہی نہیں فرمائی۔

(۱) یہ ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری (متوفی: ۲۸۳ھ) کی تالیف ہے، یہ پورے قرآن کریم کی تفسیر نہیں بلکہ چیدہ چیدہ آیاتِ قرآنیہ کی تشریح و توضیح ہے، جو ان کے شاگرد ابو بکر محمد بن احمد بلدی نے جمع کی ہے، ایک جلد پر مشتمل اور مطبوع ہے، اس کے مؤلف ایک عظیم عارف باللہ بزرگ تھے۔

(۲) اس کے مؤلف ابو عبدالرحمن محمد بن حسین ازدی سلمی (متوفی: ۴۱۲ھ) ہیں، صوفیاء کے بڑے فاضل اور شیخ تھے، ان کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ ثقہ نہ تھے اور صوفیہ کے لیے احادیث وضع کیا کرتے تھے، یہ ایک بڑی جلد پر مشتمل مخصوص آیات کی تفسیر ہے، اس کا قلمی نسخہ مکتبہ ازہر میں محفوظ ہے۔

(۳) یہ تفسیر دو جلدوں میں الگ بھی طبع ہوئی ہے اور عرائس البیان کے حاشیہ پر بھی موجود ہے، اس کی نسبت شیخ ابن عربی (متوفی: ۶۳۸ھ) کی طرف کی جاتی ہے، جبکہ بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ یہ تفسیر عبدالرزاق قاشانی (متوفی: ۷۳۰ھ) کی ہے جو کہ مشہور باطنی تھا، شیخ محمد عبدہ اور علامہ رشید رضا کی بھی یہی رائے ہے، اس میں ظاہری تفسیر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے، اس تفسیر کی بنیاد وحدۃ الوجود کے مسئلہ پر رکھی گئی ہے۔

(۴) اس سلسلہ میں موجودہ زمانہ میں سب سے عمدہ اور بہتر تصنیف حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ''مسائل السلوک من کلام ملک الملوک'' ہے، جس کا ترجمہ بھی حضرت نے خود ہی ''رفع الشکوک فی ترجمۃ مسائل السلوک'' کے نام سے کیا ہے، یہ دونوں ''بیان القرآن'' کے حاشیہ پر مطبوع ہیں، اس میں مسائل سلوک و =

معتزلہ اور شیعہ کی مشہور تفاسیر

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مؤلف کا نام	مذہب	وفات	تفسیر کا مشہور نام
۱	تنزیہ القرآن عن المطاعن	عبدالجبار بن أحمد ہمدانی	معتزلی	۴۱۵ھ	تفسیر ہمدانی
۲	أمالی الشریف المرتضیٰ	علی بن أحمد الحسین	معتزلی	۴۳۶ھ	تفسیر مرتضیٰ
۳	الکشاف	محمود بن عمر زمخشری	معتزلی	۵۳۸ھ	تفسیر زمخشری
۴	مرآۃ الأنوار ومشکاۃ الأسرار	عبداللطیف کازرانی	شیعی	نامعلوم	تفسیر مشکاۃ
۵	تفسیر العسکری	حسن بن علی ہادی	شیعی	۲۶۰ھ	تفسیر عسکری
۶	مجمع البیان	فضل بن حسن طبرسی	شیعی	۵۳۸ھ	تفسیر طبرسی
۷	الصافی فی تفسیر القرآن	محمد بن شاہ مرتضیٰ کاشی	شیعی	۱۰۹۰ھ	تفسیر کاشی
۸	تفسیر القرآن	عبداللہ بن محمد علوی	شیعی	۱۲۴۲ھ	تفسیر علوی
۹	بیان السعادہ	سلطان بن محمد حیدر خراسانی	شیعی	۱۳۱۵ھ	تفسیر خراسانی

عصر حاضر کی مشہور کتب تفسیر

نمبر شمار	تفسیر کا نام	مؤلف کا نام	تفسیر کا مشہور نام
۱	تفسیر القرآن الکریم	محمد رشید رضا	تفسیر منار
۲	تفسیر المراغی	أحمد مصطفی مراغی	تفسیر مراغی
۳	محاسن التأویل	جمال الدین قاسمی	تفسیر قاسمی
۴	فی ظلال القرآن	سید قطب شہید	تفسیر ظلال
۵	التفسیر الواضح	محمد محمود حجازی	تفسیر واضح
۶	تفسیر الجواھر	طنطاوی جوہری	تفسیر جوہری
۷	تیسیر التفسیر	شیخ عبدالجلیل عیسیٰ	تفسیر عیسیٰ

ے تصوف کو قرآن سے ثابت کیا گیا ہے۔

۸	المصحف المفسر	محمد فرید وجدی	تفسیر وجدی
۹	الھدایۃ والعرفان	اَبوزید دمنھوری	تفسیر دمنھوری
۱۰	صفوۃ البیان	حسنین مخلوف	تفسیر مخلوف
۱۱	فتح البیان	صدیق حسن خان	تفسیر حسن خان

اور یہاں ان مذکورہ تفاسیر کے علاوہ بھی دیگر بہت سی تفسیریں ہیں (۱) جن کا ہم نے

(۱) مؤلف موصوف نے عصر حاضر کی جن تفاسیر کا تذکرہ فرمایا ہے ان کی افکار ونظریات سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے، بلکہ بعض مقامات پر از حد ضروری ہے، تاہم سمجھدار اور دانا شخص کے لیے اس سے استفادہ کی راہیں کھلی ہوئی ہیں، عصر حاضر میں مفسرین نے قدیم طریقۂ تفسیر کو چھوڑ کر ادبی، بلاغی اور اجتماعی طرز واسلوب اختیار کیا ہے، اور جدت پسندی سے بھی بسا اوقات کئی حضرات مرعوب نظر آتے ہیں، خاص طور پر شیخ محمد عبدہ اور ان کے شاگرد سید رشید رضا اور شیخ مصطفی مراغی وغیرہ قرآن کریم کی تفسیر میں کسی خاص فقہی مسلک کو پیش نظر نہیں رکھتے، احادیثِ موضوعہ یا ضعیفہ کو بالکل جگہ نہیں دیتے، نہ مبہماتِ قرآن کی تعیین کرتے ہیں اور نہ مفسرین کے اقوال ذکر کرتے ہیں اور نہ علوم وفنون کے اصول وقواعد کا تذکرہ کرتے ہیں، لیکن آزادانہ طرز وفکر بڑی حد تک معتزلہ سے ملتی جلتی ہے اور عقل انسانی کو مطلق العنان سمجھتے ہیں، عقائد کے باب میں صحیح حدیث کو بھی تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ شیخ جوہری طنطاوی نے بھی علوم جدیدہ، فنون حاضرہ اور اسرارِ کونیہ کو اپنا موضوع بحث بنایا ہے، جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ قرآن سائنس یا فلکیات کی کتاب ہے۔

ہمارے دور میں ہمتیں پست اور عزائم کمزور ہیں، اس لیے جو حضرات ضخیم تفاسیر کا باقاعدہ مطالعہ نہیں کر پاتے ان کے لئے ہمارے اکابر درج ذیل تفاسیر کے مطالعہ کا فرماتے ہیں، جو بڑی حد تک دوسری کتب سے بے نیاز کردیتی ہیں: ۱۔تفسیر ابن کثیر، ۲۔تفسیر کبیر، ۳۔تفسیر قرطبی، ۴۔تفسیر اَبی السعود، ۵۔تفسیر روح المعانی۔ ان میں سے پہلی دو شوافع کی ہیں، تیسری مالکیہ کی اور آخری دو حنفیہ کی ہیں۔

اور اگر کوئی علوم جدیدہ، فنون حدیثہ اور کائنات کے سربستہ رازوں کی واقفیت کا خواہش مند ہو تو وہ جوہری طنطاوی کی ''جواہر القرآن'' کا مطالعہ کرے، اور اگر قرآن کے اغراض ومقاصد کو جدید عصری اسلوب میں دیکھنا چاہتا ہے تو سید رشید رضا کی تفسیر ''المنار'' کا مطالعہ کرے۔ اور اگر عدیم الفرصتی کی بنا پر صرف دو تفاسیر دیکھنا چاہتا ہے تو نظام الدین نیشاپوری کی ''غرائب الفرقان'' جو کہ تفسیر رازی کا مفید خلاصہ ہے اور ''تفسیر ابی سعود'' جو کہ تفسیر کشاف کی نعم البدل ہے کو لازم پکڑ لے، اور اگر صرف ایک تفسیر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے اور اختصار مطلوب ہے تو عبدالرحمن ثعالبی کی تفسیر ''الجواہر الحسان'' کا مطالعہ کرے جو کہ تفسیر ابن عطیہ کا خلاصہ ہے اور اگر تفصیل مطلوب =

طوالت کے خوف سے تذکرہ نہیں کیا اور اللہ ہی توفیق دینے والے اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں۔

☆☆......☆☆

= ہے تو روح المعانی میں غوطہ زنی فرمائے (یتیمۃ البیان ملخصاً مع تغییر)۔

یہ تو عربی تفاسیر کے حوالے سے کلام تھا، اردو زبان میں اہم اور مفید تفاسیر یہ ہیں:

۱۔ بیان القرآن: یہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی گراں قدر تفسیر ہے اور حل فہم قرآن کے سلسلہ میں جس طرح یہ مفید ہے، شکوک و شبہات کے ازالہ کے لیے بھی زمانۂ حاضرہ کی تفاسیر میں اس کو امتیازی اور خصوصی مقام حاصل ہے، اس کے حکیمانہ اسلوب اور محققانہ طرز استدلال سے مطالب قرآنیہ آسانی سے دل نشین ہوجاتے ہیں، تصوف و سلوک کے جو مسائل آیات سے مستنبط ہوتے ہیں ان کا ذکر بھی ذیل میں مسائل سلوک کے نام کردیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمہ اللہ اس تفسیر کو اردو تفاسیر کا سرتاج گردانتے تھے، البتہ زبان اس کی علمی اور اصطلاحی ہے، عام اردو داں طبقہ کو اس کے سمجھنے میں دشواری ہوسکتی ہے۔

۲۔ معارف القرآن: یہ حضرت مولانا مفتی شفیع دیوبندی صاحب رحمہ اللہ کی تالیف ہے، یہ بیان القرآن کا خلاصہ اور تسہیل بھی ہے اور عصر حاضر کے جدید اور معاشرتی مسائل پر بھی سیر حاصل بحث ہے، الفاظ وکلمات کے معانی عام فہم اور سلیس زبان میں کیے گئے ہیں۔ عوام وخواص ہر ایک کے لیے یکساں مفید ہے۔

۳۔ معارف القرآن: یہ حضرت مولانا ادریس کاندھلوی صاحب رحمہ اللہ کی بلند پایہ تفسیر ہے، شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے لفظی ترجمہ کے بعد رواں ترجمہ ہے جس میں ضروری تشریحات بھی ہیں اور متقدمین و متاخرین کی تفاسیر کا خلاصہ بھی ہے، ربطِ آیات، تفسیری نکات اور ملاحدہ کے اشکالات کا مسکت جواب بھی ہے، سورۂ صافات تک پہنچ کر مصنف علیہ الرحمۃ کی وفات ہوگئی، پھر سورۂ ص سے لے کر آخر تک بطورِ تکملہ ان کے فرزندِ رشید مولانا محمد مالک کاندھلوی رحمہ اللہ نے مولانا ہی کے طرز پر اسے مکمل فرمایا۔

۴۔ تفسیر عثمانی: اس کا ترجمہ ''موضح فرقان'' کے نام سے حضرت شیخ الہند محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کا ہے، جو درحقیقت شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ کے ترجمہ کو بامحاورہ اور سلیس کیا گیا ہے، سورۂ نساء تک اس کے حواشی بھی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ نے تحریر فرمائے، پھر ان حواشی کی تکمیل ان کے نامور شاگرد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے کی، اور انہیں کے نام سے مشہور ہوگئے۔ یہ حواشی اپنے ایجاز و اعجاز کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہیں، اس تفسیر کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ سعودی گورنمنٹ نے لاکھوں کی تعداد میں اسے چھپوا کر اردو خواں طبقے میں مفت تقسیم کیا ہے۔

آٹھویں فصل

مفسرین تابعین کرامؒ

اگر تابعینؒ میں سے مفسرین حضرات کا تذکرہ کیا جائے تو ان کا عدد شمار بہت زیادہ ہو جاتا ہے اور ان کی تعداد مفسرین صحابہؓ سے بہت زیادہ بیان کی جاتی ہے، یہ اس بناء پر ہے کہ جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تفسیر کی خدمت میں معروف ہوئے، جیسا کہ علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الاتقان'' میں ذکر کیا ہے، دس سے زیادہ نہیں، ہمارے سامنے ان کے اسمائے گرامی گزشتہ بحث میں آچکے ہیں، اور ہم نے ان میں سے مشہور حضرات کے حالات کا کچھ تذکرہ بھی ماقبل میں کرلیا ہے، لیکن تابعین میں مفسرین کی تعداد بہت زیادہ رہی، انہوں نے بہت بڑی شہرت پائی، اور ان میں ایسی نابغۂ روزگار ہستیاں ظاہر ہوئیں جنہوں نے کتاب اللہ کی تفسیر کا بہت زیادہ اہتمام کیا، مفسرین حضرات نے ان کی افکار کا ایک بڑا حصہ روایت کیا ہے، مفسرین تابعینؒ تین طبقات میں منقسم ہیں:

۱۔ اہل مکہ کا طبقہ ۲۔ اہل مدینہ کا طبقہ ۳۔ اہل عراق کا طبقہ۔

۱۔ پہلا طبقہ: وہ اہل مکہ کا طبقہ ہے، انہوں نے اپنے علوم کو امام المفسرین، ترجمان القرآن سیدنا حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حاصل کیا، علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے ابن تیمیہ رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں: ''لوگوں میں سب سے زیادہ تفسیر کو جاننے والے مکہ والے ہیں، کیونکہ وہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تلامذہ اور رفقاء ہیں''۔

پھر ان میں سے ایک بڑی جماعت نے شہرت پائی، اور ان میں یکتائے روزگار شخصیتیں ظاہر ہوئیں، ان کے سرخیل حضرت مجاہد، حضرت عطائ، حضرت عکرمہ، حضرت طاؤس اور حضرت سعید بن جبیر رحمہم اللہ ہیں، اب ہم ان ممتاز اور سرخیل علماء کے مختصر حالاتِ زندگی ذکر کرتے ہیں:

حضرت مجاہد بن جبر رحمہ اللہ: حضرت مجاہد رحمہ اللہ ۲۱ رہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۰۴ رہجری میں وفات پائی، آپؒ کا نام ''مجاہد بن جبر''، کنیت ''ابوالحجاج'' تھی اور مکہ کے رہنے والے تھے، تفسیر میں ان کا شمار مشہور علماء میں ہوتا ہے، علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ بغیر کسی شک وشبہ کے امام القراء والمفسرین ہیں، انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے علم تفسیر حاصل کیا ہے۔ اور آپؒ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے خاص شاگردوں اور ان سے نقل کرنے والوں میں سے سب سے قابل اعتماد شخص ہیں، اسی وجہ سے امام بخاری رحمہ اللہ اکثر ان کی تفسیر پر اعتماد کرتے ہیں، جیسا کہ اکثر مفسرین ان کی روایت پر اعتماد کرتے ہیں۔

علم کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے رہے، اور کوفہ میں جا کر سکونت اختیار کی، کسی بھی حیرت انگیز خبر کے متعلق سنتے تو ادھر جا کر اسے دیکھ لیتے، حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کتاب اللہ کی تفسیر کا علم اپنے عظیم استاذ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے حاصل کیا اور آپؒ نے اپنے استاذ سے انتہائی غور وفکر اور قرآنی آیتوں میں سے ہر ایک آیت پر ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھا، ان سے اس آیت کا معنی اور اس کے اسرار کو دریافت کرتے، فضیل بن میمونؒ نے حضرت مجاہد رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں:

''عُرَضْتُ الْقُرْاٰنَ عَلَى ابْنِ عَبَّاسٍ ثَلَاثَ عَرَضَاتٍ، أَقِفُ عِنْدَ كُلِّ اٰيَةٍ مِنْهُ أَسَاأُلُهُ مِنْهَا: فِيمَ أُنْزِلَتْ أَوْ كَيْفَ أُنْزِلَتْ؟''

ترجمہ: ''میں نے تین مرتبہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے قرآن کا دور کیا، ہر آیت پر میں ٹھہر جاتا اور اس کے متعلق دریافت کرتا کہ یہ کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے؟ اور کیسے نازل کی گئی؟''۔

حضرت مجاہد رحمہ اللہ کا اپنے جلیل القدر استاذ کے ساتھ یہ دور کرنا صرف قرآن کی تفسیر کرنے، اس کے رازوں اور باریکیوں کو سمجھنے اور اس کی حکمتوں اور احکام کو جاننے کیلیے ہی تھا، اسی بناء پر امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اگر آپ کے پاس تفسیر مجاہدؒ کے واسطے سے آئی ہو تو وہی آپ کے لیے کافی ہے'' یعنی یہ تفسیر کافی ہوگی اور دیگر تفاسیر سے بے نیاز کردے گی جبکہ اس کو روایت کرنے والے امام مجاہد رحمہ اللہ ہوں۔

حضرت عطاء بن أبی رباح رحمہ اللہ: حضرت عطاء بن أبی رباح رحمہ اللہ ۲۷ر ہجری میں پیدا ہوئے اور ۱۱۴ر ہجری میں وفات پائی، مکہ میں پرورش پائی اور اہلِ مکہ کے مفتی اور محدث تھے، تابعین میں ان کا شمار ممتاز فقہاء میں ہوتا تھا، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرنے میں وہ معتمد اور ثقہ آدمی ہیں، امام اعظم أبوحنیفہ نعمان رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ عطاء بن أبی رباح سے بہتر شخص میں نے نہیں پایا۔ اور قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تابعین میں سب سے بڑے عالم چار ہیں: عطاء بن أبی رباحؒ مناسکِ حج کے سب سے بڑے عالم ہیں، اور سعید بن جبیرؒ علم تفسیر کے سب سے زیادہ جاننے والے ہیں ....

۸۷ برس کی عمر میں آپؒ نے مکہ میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت عکرمہ مولی ابن عباس رضی اللہ عنہم: حضرت عکرمہ رحمہ اللہ کی ولادت ۲۵ر ہجری میں ہوئی، اور ۱۰۵ر ہجری میں انتقال فرما، امام شافعی رحمہ اللہ ان کے بارے میں فرماتے ہیں: ''کتاب اللہ کا سب سے بڑا عالم عکرمہؒ کے سوا کوئی بھی باقی نہیں رہا''۔ آپؒ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام تھے، اپنے علم کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے حاصل کیا، اور ان سے قرآن وسنت کی تعلیم پائی اور آپ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے دو تختیوں کے درمیان (مصحف کے دو گتوں کے درمیان یعنی قرآن) کی تفسیر بیان کی ہے، اور ہر وہ چیز جو میں تمہیں قرآن کے متعلق بتاتا ہوں وہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے''۔

کتاب ''الاعلام'' میں آپؒ کا تعارف ان الفاظ سے کیا گیا ہے: عکرمہ بن عبداللہ البربری المدنی، أبوعبداللہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے آزاد کردہ غلام تھے، تفسیر و مغازی کے سب سے بڑے عالم تھے، مختلف ملکوں کے چکر لگائے، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد تین سو کے قریب ہے، جن میں سے ستر سے زیادہ تابعین ہیں، دیارِ مغرب کی طرف سفر کیا اور علماءِ مغرب سے استفادہ کیا، پھر مدینہ منورہ واپس لوٹ آئے، حاکمِ مدینہ نے انہیں طلب کیا تو آپؒ اس سے روپوش ہو گئے اور اسی روپوشی کی حالت میں انتقال فرمایا، آپؒ کی اور مشہور شاعر ''کثیر عزہ'' کی وفات مدینہ منورہ میں ایک ہی دن میں ہوئی تو کہا گیا: ''مات أعلم الناس وأشعر الناس.'' ''لوگوں میں سب سے بڑے عالم اور سب سے بڑے شاعر کا انتقال ہو گیا''۔

حضرت طاؤس بن کیسان یمانی رحمہ اللہ: حضرت طاؤس رحمہ اللہ ۳۳ ھجری میں پیدا ہوئے، اور ۱۰۶ ھجری میں انتقال ہوا، آپؒ کا نام "طاؤس بن کیسان الیمانی" تھا، کتاب اللہ کی تفسیر میں شہرت پائی، آپ قوتِ حافظہ، کمالِ مہارت اور ذکاوت کا اچھا نمونہ اور زہد، صلاح وتقویٰ کا ایک اعلیٰ شاہکار تھے۔ پچاس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی آپؒ نے زیارت کی، خلقِ کثیر نے آپؒ سے استفادہ کیا، بڑے عابد وزاہد شخص تھے، مروی ہے کہ آپؒ نے چالیس حج کیے اور آپؒ مستجاب الدعوات بھی تھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے آپ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ میں طاؤس کو جنتی سمجھتا ہوں۔

کتاب "الاعلام" میں آپؒ کا تعارف ان الفاظ سے کیا گیا ہے: طاؤس بن کیسان الخولانی الھمدانی، أبوعبدالرحمن، آپؒ کا شمار فہمِ دین، روایتِ حدیث، زاہدانہ زندگی اور خلفاء اور حکام کو بے دھڑک وعظ ونصیحت کرنے میں سرخیل تابعین میں ہوتا ہے، آپؒ اصلاً ایرانی تھے اور آپ کی جائے پیدائش وسکونت یمن تھی، حج کی حالت میں مزدلفہ میں آپؒ کی وفات ہوئی، جبکہ خلیفہ ہشام بن عبدالملک بھی اس سال حج کے لیے آئے ہوئے تھے، انہوں نے آپؒ کی نمازِ جنازہ پڑھائی، طاؤس رحمہ اللہ خلفاء اور امراء کے قرب کو ناپسند کرتے تھے، ابن عیینہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: بادشاہوں سے پرہیز کرنے والے تین شخص ہیں: حضرت أبوذرؓ، طاؤسؒ اور ثوریؒ۔

حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ: حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ کی ولادت ۴۵ ھجری میں ہوئی، ان کا شمار علم وتقویٰ میں بلند پائے کے تابعین میں ہوتا ہے، آپؒ نے کتاب اللہ کی تفسیر میں بہت شہرت پائی، آپؒ علم وعمل کے بلند پہاڑ اور روشن منارے تھے، پیادوں نے آپؒ کے علم کو نقل کیا اور قافلے آپؒ کے ذکر کو لے کر چل پڑے، سفیان ثوری رحمہ اللہ کا قول ہے: "تفسیر کو چار بندوں سے حاصل کرو: سعید بن جبیرؒ، مجاہدؒ، عکرمہؒ اور ضحاکؒ سے"، اور حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں: "سعید بن جبیر تفسیر کے سب سے بڑے عالم تھے"۔

قوت حافظہ میں ایک اعلیٰ شاہکار تھے، جو سنتے یاد کر لیتے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اُن کی قوتِ حافظہ کا اعتراف کیا، حتیٰ کہ ایک مرتبہ اُن سے فرمایا: "دیکھو تم کیسے مجھ سے حدیث نقل کرتے ہو، کیونکہ تم نے مجھ سے بہت ساری احادیث زبانی یاد کر لی ہیں؟"۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی آنکھوں کی بینائی چلے جانے کے بعد جب کوفہ کے باشندے آپؓ سے مسئلہ پوچھنے آتے تو آپؓ فرمایا کرتے کہ تم مجھ سے دریافت کرتے ہو جبکہ تمہارے درمیان اُمّ دھماء کا بیٹا موجود ہے، یعنی حضرت سعید بن جبیر رحمہ اللہ، آپؒ بڑے عابد وزاہد شخص تھے، ہر دو راتوں میں ایک قرآن ختم فرماتے اور ایک مرتبہ تو کعبہ میں پورا قرآن ایک رکعت میں پڑھ ڈالا۔

کتاب ''الاعلام'' میں ان کے حالاتِ زندگی ان الفاظ کے ساتھ آئے ہیں: سعید بن جبیر الأسدی، الکوفی، أبو عبداللہ تابعی ہیں، آپؒ علی الاطلاق سب سے بڑے عالم تھے، اصلاً حبشی ہیں، حضرت ابن عباس اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے علم حاصل کیا، جب عبدالرحمن بن أشعثؒ نے عبدالملک بن مروان کے خلاف خروج کیا تو حضرت سعید بن جبیر بھی اُن کے ساتھ تھے، پھر جب عبدالرحمن مارے گئے تو حضرت سعیدؒ مکہ چلے گئے، لیکن وہاں کے حاکم خالد قسری نے انہیں گرفتار کر کے حجاج کی طرف بھیج دیا، اور بالآخر حجاج کے ہاتھوں شہید ہوئے، حجاج آپؒ کو سعید بن جبیر کے بجائے شقی بن کسیر کہہ کر پکارتا تھا، امام أحمد بن حنبل رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''قتل الحجاج سعیداً، وما علی وجہ الأرض أحد إلا وھو مفتقر الی علمہ''۔ ''حجاج نے حضرت سعیدؒ کو ایسے وقت میں شہید کیا جب روئے زمین پر کوئی شخص ایسا نہ تھا جسے اس کے علم کی ضرورت نہ ہو''۔

اور روایت میں آتا ہے کہ جب حجاج نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو جلاد کو حکم دیا کہ اسے لے جا کر اس کی گردن اڑا دے، تو حضرت سعیدؒ نے اس سے کہا کہ مجھے چھوڑ دو تا کہ میں دو رکعتیں پڑھ لوں، حجاج نے جلاّد سے کہا کہ یہ کیا کہتا ہے؟ تو جلاّد نے کہا کہ نماز پڑھنا چاہتا ہے، لیکن حجاج نے اسے صرف مشرق (نصاریٰ کے قبلہ) کی طرف نماز پڑھنے کی اجازت دی (یعنی حجاج نے اسے مسلمانوں کے قبلہ کی طرف نماز پڑھنے کی اجازت نہ دی) پھر حجاج نے جلاد کو حکم دیا کہ اس کی گردن اڑا دے، اور اس کا رخ قبلہ سے موڑ دے، تو انہوں نے آپؒ کے چہرے کو پھیر دیا، اس وقت حضرت سعیدؒ نے یہ آیت تلاوت فرمائی: ﴿فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ﴾ ''پس تم لوگ جس طرف منہ کرو (اُدھر ہی) اللہ تعالیٰ کا رخ ہے''۔

پھر اسی حالت میں آپؒ کی گردن اڑا دی گئی، جبکہ آپؒ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' کا

وردفرمارہے تھے، اور آپؒ کی بَری اور پاکیزہ روح اپنے پروردگار کی جانب حجاج کے ظلم کی شکایت لے کر پرواز کرگئی، اور یوں اپنے سانسوں کو اپنے عقیدہ اور دین کی راہ میں قربان کردیا، اللہ تعالیٰ اُن پر رحمت فرمائے اور انہیں اپنے وسیع باغات میں جگہ دے لامین۔

۲- اہلِ مدینہ کا طبقہ: ان میں سے بھی ایک بڑی تعداد نے تفسیر میں شہرت پائی، ان میں نمایاں اور ممتاز حضرت محمد بن کعب قرظی، حضرت اُبوالعالیہ ریاحی اور حضرت زید بن اسلم رضی اللہ عنہم جمیعاً ہیں، اب ہم اہلِ مدینہ میں سے ان تین حضرات کا ذکر کریں گے جو تفسیر کی خدمت میں خوب مشہور ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے علوم فقہ، حدیث یا تفسیر کو نقل کرنے ان کا عظیم کردار رہا، اگرچہ ان کے علاوہ بھی مدنی تابعین میں سے بعض حضرات نے شہرت پائی ہے، لیکن ان کی شہرت سب سے زیادہ اور ان کا اثر سب سے نمایاں رہا۔

حضرت محمد بن کعب قرظی رحمہ اللہ: علامہ عسقلانی رحمہ اللہ کی کتاب ''تہذیب التہذیب'' میں ان کا تعارف ان الفاظ سے کیا گیا ہے: آپؒ کا پورا نام محمد بن کعب القرظی، اُبوحمزہ المدنی ہے، قبیلہ اوس کے حلیف تھے، ابتداء میں آپؒ کوفہ میں مقیم رہے، بعد میں مدینہ طیبہ آگئے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی جماعت سے خصوصاً حضرت علی بن اَبی طالب، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سے انہوں نے روایات نقل کی ہیں۔

ابن سعد رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''آپؒ ثقہ، کثیر الحدیث، متقی اور صالح عالم تھے''۔

عون بن عبداللہ رحمہ اللہ کہتے ہیں: ''میں نے تفسیرِ قرآن کا ان سے بڑا عالم نہیں دیکھا''۔

امام بخاری رحمہ اللہ نے ان کو ''قرظی'' کے نام سے موسوم کرنے کی وجہ ذکر کی ہے کہ آپؒ کے والد ان لوگوں میں سے تھے جو غزوۂ بنی قریظہ میں نابالغ ہونے کی بناء پر چھوڑ دیئے گئے تھے، اور یہ اس لیے ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنوقریظہ کی عہد شکنی اور غداری پر ان کے مردوں سے قتال کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان میں سے لڑنے والوں کے لیے قتل اور بچوں، نابالغ لڑکوں اور عورتوں کے لیے امان کا حکم صادر فرمایا۔

آپؒ کا شمار اہلِ مدینہ میں علم وفقہ کے اندر بڑے علماء میں ہوتا تھا، آپؒ ایک مرتبہ مسجد میں بیان کررہے تھے کہ آپؒ پر اور آپؒ کے ساتھیوں پر چھت گر پڑی، اور ملبہ کے نیچے آنے کی وجہ سے وفات پاگئے، یہ واقعہ ۱۱۷ھ ہجری میں پیش آیا، رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ۔

حضرت اَبوالعالیہ الریاحی رحمہ اللہ: آپؒ کا نام رفیع بن عمران، کنیت اَبوالعالیہ، قبیلہ بنی ریاح کی ایک عورت کے آزاد کردہ غلام تھے، آپؒ ثقہ، تابعی ہیں، بصرہ کے باشندے تھے، فقہ اور تفسیر میں مشہور ہوئے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زیارت کی ہے، حضرت اُبی بن کعب وغیرہ رضی اللہ عنہم سے قرآن پڑھا، حضرت عمر، حضرت ابن مسعود، حضرت علی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور ان کے علاوہ دیگر صحابہؓ سے روایات سنی ہیں، ان سے یہ قول مروی ہے کہ: ''میں نے تمہارے نبی کی وفات کے دس سال بعد قرآن پڑھا''۔

آپؒ کم عمری سے ہی علم کی جانب راغب اور اسے طلب کرنے میں منہمک رہے، یہاں تک کہ خوب مہارت حاصل کی، اور اپنے ہم عمروں سے خصوصاً تفسیر میں سبقت لے گئے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ان کو اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتے تھے جبکہ دوسرے قریشی حضرات نیچے تشریف فرما ہوتے، اور فرمایا کرتے کہ ''علم اسی طرح شریف انسان کے شرف میں اضافہ کرتا ہے اور غلاموں کو تخت پر بٹھا دیتا ہے''۔ آپؒ کی وفات ۹۳ رہجری میں ہوئی جبکہ عمر ۸۰ ربرس کے قریب قریب تھی، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت زید بن اسلم رحمہ اللہ: آپؒ کا نام زید بن اسلم العدوی، العمری اور کنیت اَبواُمامۃ ہے، آپؒ اہل مدینہ کے فقیہ اور محدث تھے، حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کی خلافت کے زمانہ میں ان کے ساتھ رہے، ولید بن یزید نے فقہاء مدینہ کی ایک جماعت کے ساتھ کسی مسئلہ کے پوچھنے کے لیے انہیں بھی دمشق بلایا، آپؒ ثقہ اور کثیر الحدیث عالم تھے، مسجدِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں آپؒ کا حلقہ درس ہوا کرتا تھا، تفسیر میں آپؒ کی ایک کتاب بھی ہے، آپؒ کے بیٹے عبدالرحمن نے اسے روایت کیا ہے، آپؒ ایک رعب دار شخص تھے، ابن عجلان رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ''میں کسی سے اتنا مرعوب نہیں ہوا جتنا کہ حضرت زید بن اسلمؒ سے مرعوب ہوا''۔

ایک مرتبہ آپؒ نے حدیث بیان کی اور اس کی سند ذکر نہیں کی تو ایک شخص نے پوچھا کہ اے اَبواُسامہ! یہ حدیث کس سے مروی ہے؟ تو آپؒ نے فرمایا کہ اے میرے بھتیجے! ہماری بیٹھک بے وقوف لوگوں کے ساتھ نہیں رہی ہے، مسجد نبوی میں آپؒ کا بہت بڑا حلقۂ درس لگتا تھا، حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ بھی آپؒ کی مجلس میں بیٹھتے، آپؒ کی باتیں غور سے

سنتے اور اپنی قوم کی مجالس کو چھوڑ رکھا تھا، لہٰذا اُن سے اس بارے میں سوال کیا گیا کہ آپ اپنی قوم کی مجالس کو چھوڑ کر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ایک غلام کی مجلس کیوں اختیار کرتے ہیں؛ کیونکہ آپؒ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے؟ تو حضرت علی رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ انسان اسی شخص کی مجلس میں بیٹھتا ہے جو اس کے دین کے لیے نافع ہو، آپؒ رحمہ اللہ کی وفات ۱۳۶ھ ہجری میں مدینہ منورہ میں ہوئی۔

۳- اہل عراق کا طبقہ: اہل عراق کی بھی ایک بڑی تعداد نے تفسیر میں شہرت پائی، ان کے سرخیل: حضرت حسن بصری، حضرت مسروق بن اجدع، حضرت قتادہ بن دعامہ، حضرت عطاء بن ابی مسلم خراسانی اور حضرت مرۃ ہمذانی رحمہم اللہ ہیں، اب ہم ان بلند پایہ علماء کا مختصر سا تعارف پیش کرتے ہیں، سو ہم اللہ ہی سے مدد طلب کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ: آپؒ کا نام حسن بن یسار البصری ہے، اہل بصرہ کے امام اور اپنے زمانہ کے حبر الامت (زبردست عالم) تھے، آپؒ کی کنیت ابوسعید ہے، آپؒ عالم، فصیح، بہادر اور زاہد شخص تھے، مدینہ منورہ میں ولادت ہوئی اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پرورش میں جوان ہوئے، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں خراسان کے گورنر ربیع بن زیاد نے آپ کو اپنا کاتب اور محرر بنایا تو آپؒ نے بصرہ میں سکونت اختیار کرلی، لوگوں کے دلوں میں آپؒ کا رعب بہت زیادہ تھا، لہٰذا آپؒ حکمرانوں کے پاس آتے، نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے منع کرتے، حق کے راستہ میں کسی ملامت کرنے والی کی ملامت سے نہ ڈرتے، ایک سو بیس صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی زیارت کی، آپؒ باشندگانِ بصرہ میں سب سے زیادہ فصیح، عبادت گزار اور فقیہ شخص تھے۔

علامہ غزالی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ حسن بصریؒ کا کلام لوگوں میں سب سے زیادہ انبیاء کے کلام کے مشابہ تھا اور اُن کا طریقہ سب سے زیادہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے قریب تھا، وہ فصاحت کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، حکمت ان کے منہ سے بہتی تھی۔

ایوب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ میری آنکھوں نے ایسے آدمی کو کبھی بھی نہیں دیکھ پایا جو حسن بصری سے بڑا فقیہ ہو، وہ حکمت کو محفوظ کرتے اور اس کے ذریعے ہی بات فرماتے تھے، جب وعظ فرماتے تو حاضرین کو رُلا دیتے، ایسا محسوس ہوتا کہ وہ عالمِ آخرت میں تھے،

پھر وہاں سے آئے ہیں اور ان باتوں کی خبر دے رہے ہیں جنہیں خود دیکھا اور مشاہدہ کیا ہے، آپؒ نے وعظ میں بہت شہرت پائی، رقیق القلب اور فصیح زبان کے مالک تھے، آپؒ احادیث نبویہ بیان کرتے رہتے لیکن جب حضرت علی بن اَبی طالب رضی اللہ عنہ کے واسطے سے کوئی حدیث ذکر کرتے تو حجاج کی گرفت کے خوف سے ان کا نام ذکر نہ کرتے۔ یونس بن عبید رحمہ اللہ فرماتے ہیں: میں نے حضرت حسنؒ سے عرض کرتے ہوئے کہا کہ اے اَبوسعید! آپ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبکہ آپ نے رسول اللہ ﷺ کا زمانہ نہیں پایا؟ تو حضرت حسنؒ نے جواب دیا کہ اے بھتیجے! آپ نے مجھ سے ایسی چیز کا سوال کیا ہے کہ اس سے پہلے اس کے متعلق کسی نے بھی مجھ سے نہیں پوچھا، اگر آپ کی قدرومنزلت میرے ہاں نہ ہوتی تو میں تمہیں نہ بتاتا، میں جس زمانہ میں ہوں آپ دیکھ رہے ہو، ہر وہ شئی جو آپ نے مجھ سے سنی ہے کہ میں کہتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تو وہ حضرت علی بن اَبی طالب رضی اللہ عنہ کے واسطے سے ہی ہوتی ہے، لیکن میں ایک ایسے زمانہ میں ہوں کہ حضرت علیؓ کا ذکر نہیں کرسکتا۔

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کو خلافت ملی تو انہوں نے آپؒ کو لکھا کہ مجھے اس آزمائش میں ڈالا گیا ہے، آپ میرے لیے ایسے مددگار دیکھیں جو اس معاملہ میں میری مدد کریں، تو حضرت حسن رحمہ اللہ نے جواب دیا: جہاں تک دنیاداروں کی بات ہے تو آپ انہیں نہیں چاہتے، اور رہے آخرت کے عاشقین تو وہ آپ کو نہیں چاہتے، لہٰذا اللہ سے ہی اپنے معاملہ میں مدد طلب کریں۔ آپ کی وفات ۱۱۰ھ/ہجری میں بصرہ میں ہوئی، اور وہیں دفن ہوئے، رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً۔

حضرت مسروق بن اَجدع رحمہ اللہ: حضرت مسروق بن اَجدع الہمدانی کوفہ کے رہنے والے تھے، ثقہ تابعی ہیں، حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے اُن شاگردوں میں سے ہیں جنہوں نے سیرتِ رسول ﷺ کو ہم تک پہنچایا، آپؒ عابد، فقیہ شخص تھے، آپؒ کی کنیت ابوعائشہ ہے، تفسیر اور روایتِ حدیث میں مشہور ہوئے، آپؒ کے والدین یمن کے بہترین شہسواروں میں سے تھے اور آپؒ کے ماموں حضرت عمر بن معدیکرب رضی اللہ عنہ ہیں۔

آپؒ نے قضاء کا عہدہ سنبھالا، لیکن قضاء پر کوئی تنخواہ نہ لیتے تھے، قناعت پسند، زاہد

اور اللہ تعالیٰ کی تقسیم پر راضی رہنے والے تھے، باوجودیکہ آپؒ بال بچوں والے تھے، ایک دن آپؒ کی بیوی آپؒ کے پاس آئی اور کہا کہ: اے اُبو عائشہ! آج آپ کے اہل خانہ کے لیے کھانا نہیں ہے؟ تو اس پر مسکرائے اور فرمایا کہ اللہ کی قسم! اللہ ضرور انہیں رزق دے گا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں کثیر رزق سے نوازا۔

اُن سے مروی ہے کہ وہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے ملے تو انہوں نے فرمایا کہ آپ کا کیا نام ہے؟ تو آپؒ نے کہا کہ "مسروق بن اُجدع"، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اُجدع" شیطان ہے، آپ مسروق بن عبدالرحمن" ہیں، اس کے بعد آپؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں "مسروق بن عبدالرحمن" ہوں۔

بخاری رحمہ اللہ کے استاذ حضرت علی بن مدینی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگردوں میں سے کسی ایک کو بھی "مسروق" سے افضل نہیں سمجھتا، انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں نماز پڑھی ہے، اور حضرت عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما کی زیارت کی ہے۔

آپ جنگ قادسیہ میں اپنے تین بھائیوں سمیت شریک ہوئے، چنانچہ تینوں بھائی تو اس دن قادسیہ میں شہید ہوگئے جبکہ حضرت مسروقؒ زخمی ہوئے جس کی وجہ سے ہاتھ شل ہوگیا، آپؒ کا وعظ و نصیحت میں بہترین طریقہ تھا، ایک دن آپؒ اپنے بعض شاگردوں سمیت باہر نکلے اور انہیں کوفہ کے ایک کوڑا کرکٹ پر لے کر چڑھ گئے اور فرمایا: کیا میں تمہیں دنیا نہ بتاؤں؟ یہی ہے وہ دنیا لوگوں نے اسے کھایا اور ختم کردیا، اسے پہنا اور پرانا کردیا، اس پر سواری کی اور کمزور کردیا، اس میں ایک دوسرے کے خونوں کو بہایا، باہم حرام کردہ چیزوں کو حلال سمجھا، اور اپنے رشتوں کو توڑا، ایک دن آپؒ سے کسی نے شعر کے ایک مصرعے کے بارے میں پوچھا تو آپؒ نے فرمایا کہ میں پسند نہیں کرتا کہ اپنے اعمال نامے میں کسی شعر کو پاؤں۔

حضرت قتادہ بن دِعامہ رحمہ اللہ: یہ "قتادہ، اُبو الخطاب السدوسی البصری" ہیں، ۶۱ھ ہجری میں بصرہ میں پیدا ہوئے اور ۱۱۷ھ ہجری میں ۵۵ برس کی عمر میں وفات پائی، حضرت اُنس بن مالک اور حضرت سعید بن مسیب اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت سے روایت کرتے ہیں، قوی حافظے اور زبردست ذکاوت کے مالک تھے، اُن سے مروی ہے کہ وہ

فرماتے ہیں: میں نے کبھی کسی محدث سے حدیث کو دوبارہ سنانے کی فرمائش نہیں کی اور میرے کانوں نے کوئی ایسی بات نہیں سنی جسے میرے دل نے یاد نہ کیا ہو''۔

اور روایت میں آتا ہے کہ آپؒ حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ کے پاس آئے اور چند دنوں تک اُن سے پوچھتے رہے اور ان پر سوالات کی بھرمار کرلی، تو حضرت سعیدؒ نے آپؒ سے کہا: کیا جو بھی آپ نے مجھ سے پوچھا ہے وہ تمہیں یاد ہے؟ آپؒ نے کہا: جی ہاں! حضرت سعید رحمہ اللہ کو اس بات سے تعجب ہوا، تو قتادہؒ نے اُن سے کہا: میں نے آپ سے فلاں سوال کیا تو آپ نے فلاں جواب دیا، اور میں نے فلاں بات پوچھی تو آپ نے فلاں جواب دیا، یہاں تک کہ جو بھی سنا تھا تمام انہیں بتادیا، حضرت سعید رحمہ اللہ نے اُن سے فرمایا: ''میں گمان نہیں کرتا کہ اللہ نے آپ جیسا کوئی دوسرا بھی پیدا کیا ہوگا''۔ اور ایک مرتبہ اُن کے متعلق فرمایا: ''میرے پاس قتادہ سے بہتر کوئی عراقی بھی نہیں آیا، میں نے ایک مرتبہ اس پر جابر رضی اللہ عنہ کا صحیفہ پڑھا تو اس نے اسے یاد کرلیا''۔ آپ مادرزاد نابینا اور اندھے تھے، کیونکہ جب آپؒ کی ولادت ہوئی تو آپ بینائی سے محروم تھے، لیکن حفظ وذکاوت اور کمالِ مہارت میں ایک عمدہ نمونہ تھے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ آپؒ کی بہت زیادہ تعریف اور مدح بیان کرتے اور آپؒ کے علم وفقہ کو پھیلاتے تھے، تفسیر وفقہ میں امام تھے، لیکن ان پر بعض حضرات نے جرح کی ہے کہ وہ ہر ایک سے روایت لیتے ہیں، یہاں تک امام شعبی رحمہ اللہ نے اُن کے متعلق فرمایا کہ قتادہ رات میں لکڑیاں جمع کرنے والے کی طرح ہے (یعنی رطب ویابس ہر طرح کی بات لے لیتا ہے) بصرہ میں آپؒ کی وفات ہوئی اور وہیں دفن ہوئے جبکہ آپ کی عمر ۵۵ برس تھی، اور جب آپؒ کی وفات ہوئی تو اہل بصرہ کے آنسوں نکل پڑے۔

حضرت عطاء الخراسانی رحمہ اللہ: حافظ اصبہانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: آپؒ کی ولادت ۵۰ رہجری اور وفات ۱۲۵ رمیں ہوئی، آپؒ کا نام ''عطاء بن ابی مسلم الخراسانی'' ہے کنیت ''ابوعثمان'' ہے، آپ ثقہ، نہایت راست گو، عابد وزاہد، بہت زیادہ عبادت گزار اور خلوت پسند تھے، راتوں کو تہجد اور نوافل سے بیدار رکھتے۔

عبدالرحمن بن یزید رحمہ اللہ نے روایت کی ہے کہ آپؒ راتوں کو نماز سے زندہ رکھتے

اور جب رات کا ایک تہائی یا آدھا حصہ گزر جاتا تو ہمیں آواز دیتے: اے فلاں! اور اے فلاں! اٹھو، وضو کرو اور نماز پڑھو، کیونکہ رات کا قیام اور دن کا روزہ پیپ کے پینے سے زیادہ آسان ہے۔

علم کی نشر واشاعت سے بہت محبت کرتے تھے، لہٰذا اگر اپنے شاگردوں میں سے کسی کو حدیث سنانے کے لیے نہ پاتے تو علم کو چھپانے والے کے بارے میں وارد وعید کے ڈر سے فقیروں کے پاس چلے جاتے اور انہیں حدیث سناتے، فقہ، حدیث اور تفسیر میں معروف ہوئے، اور آپؒ زہد وتقویٰ کے اعلیٰ درجہ پر فائز تھے، رحمہ اللہ۔

حضرت مُرّۃ الھمدانی رحمہ اللہ: آپؒ کا نام "مُرّۃ بن شرحبیل الھمدانی" ہے، بہت زیادہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی آپؒ نے زیارت کی، آپؒ کی کنیت "ابو اسماعیل" ہے، اور "مرۃ الطیب" اور "مرۃ الخیر" کے لقب سے معروف تھے، آپؒ کو یہ لقب آپؒ کی کثرتِ عبادت کی وجہ سے دیا گیا، آپؒ عابد، متقی اور زاہد وصالح شخص تھے، عجلی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آپؒ دن اور رات میں پانچ سو رکعت نماز پڑھتے تھے، آپؒ ثقہ تابعی ہیں"۔ ۷۶ ہجری میں آپؒ کا انتقال ہوا۔ رحمه الله رحمةً واسعةً، وأسكنه فسيح جناته۔

یہ وہ تابعین میں سے بڑے بڑے مفسرین تھے جنہوں نے اپنے علوم ومعارف کو صحابۂ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے حاصل کیا، اور پھر اُن سے تبع تابعین اور بعد میں آنے والے علماء عاملین نے استفادہ کیا، اور اس طرح نسل درنسل تلقی اور تلقین کے طریقہ سے اللہ کا دین اور اس کی کتاب وشریعت اور اس کے علوم ومعارف محفوظ وسالم رہے، کیونکہ فرمانِ باری تعالیٰ ہے: ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُونَ﴾ (الحجر: ۹)

ترجمہ: "ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم اس کے محافظ ہیں"۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس علم کے بارے میں بالکل سچ فرمایا کہ:

"اس علم کے حاملین ہر بعد میں آنے والوں میں سے اُن کے عادل لوگ ہوں گے، جو اس علم سے حد سے تجاوز کرنے والوں کی تحریف، باطل لوگوں کے جھوٹ اور جاہلوں کی تاویل کو دور کرتے رہیں گے"۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان بلند پایہ شخصیات اور مستند علماء کی حفاظت کرنے کے

ذریعے اپنی کتاب کی حفاظت فرمائی کہ جنھوں نے اپنی کوششوں کو علم و دین کی خدمت کے لیے وقف کر لیا تھا، اللہ تعالیٰ انہیں اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے بہترین بدلہ عطا فرمائیں اور انہیں اپنی جنت کے باغوں کی وسعتوں میں جگہ دیں، آمین۔

تنبیہ: حضرات تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ کی تفاسیر پر تبصرہ کیا جاتا ہے کہ اُن کے اقوال میں بعض اسرائیلی روایات داخل ہوگئیں اور صحیح روایات ضعیف روایات سے خلط ملط ہوگئیں اور اُن کی زبانی بعض ایسی روایتیں نقل کی گئیں ہیں جو ثابت نہیں، لہٰذا اُن کے اقوال کو نقل کرتے وقت صحیح روایات سے باخبر کرنا ضروری ہے، اور آدمی کے لیے مناسب ہے کہ وہ کتبِ معتبرہ میں سے قابل اعتماد مصادر کی طرف رجوع کرے، مثلاً تفسیر ابن جریر اور دوسری مستند تفاسیر وغیرہ۔ علامہ سیوطی رحمہ اللہ اپنی کتاب: ''الاتقان'' میں تابعین میں سے مشہور مفسرین کے ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

> ''اور یہ متقدمین مفسرین ہیں، ان کے اکثر اقوال وہ ہیں جن کا انہوں نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے استفادہ کیا ہے، پھر اس طبقہ کے بعد ایسی تفاسیر لکھی گئیں جن میں صحابہ اور تابعین رضی اللہ عنہم کے اقوال کو جمع کیا گیا، مثلاً: ''تفسیر سفیان بن عیینہ''، ''تفسیر وکیع بن جراح''، ''تفسیر شعبہ بن حجاج''، ''تفسیر یزید بن ہارون' وغیرہ، پھر ان کے بعد علامہ ابن جریر طبری رحمہ اللہ آئے، اُن کی کتاب تفاسیر میں سب سے عظیم اور بڑھ کر ہے''۔

☆☆......☆☆

نویں فصل

اعجازِ قرآن

قرآن کریم کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ: تاریخِ انسانی میں امتوں میں سے کسی امت میں بھی یہ نہیں ہوا کہ اس نے اپنی آسمانی کتاب پر اتنی توجہ دی ہو جتنی توجہ اس امتِ محمدیہ نے دی ہے، ہم نے کسی مقدس کتاب کے بارے میں نہیں سنا کہ اُس نے حفاظت واہتمام اور عظمت و بزرگی کا وہ مقام پایا ہو جو اس مقدس کتاب، محمد ﷺ کے ابدی معجزہ، کامل برہان، اور پوری انسانیت کے لئے اس کی اس دعوتِ عامہ نے پایا ہے۔

اور اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ قرآن پاک نے اس رفیع الشان مقام کو حاصل کیا اور مسلمانوں کے دلوں میں اس عظیم مرتبہ تک پہنچا، یہ اس وجہ سے ہوا کہ وہ حوادث وواقعات جو اس مقدس کتاب کے ساتھ منسلک رہے ہیں انہوں نے اس کتاب کو تمام کتبِ سماویہ کے درمیان صدارت کے مرتبہ پر فائز کر دیا ہے، اور اسے انبیاء ومرسلین علیہم الصلوٰۃ والسلام کی لائی ہوئی ہدایت واصلاح، تعلیم وتربیت، اور رفعت وتشریع (قانون) پر فوقیت دے رہے ہیں۔ شاعر نے کیا ہی خوب اور عمدہ بات کہی ہے۔

اَللّٰهُ أَكْبَرُ اِنَّ دِيْنَ مُحَمَّدٍ   وَكِتَابُهٗ أَهْدٰى وَأَقْوَمُ قِيْلَا
لَاتَذْكُرُوا الْكُتُبَ السَّوَالِفَ عِنْدَهٗ   طَلَعَ الصَّبَاحُ فَأَطْفِىءِ الْقِنْدِيْلَا

اللہ اکبر بے شک حضرت محمد ﷺ کا دین گزشتہ کتابوں کا اس کے سامنے تذکرہ مت کیا کرو اور اس کی کتاب سب سے عظیم رہنما اور خوب سیدھی بات ہے اس لیے کہ سپیدۂ سحر نمودار ہو چکا ہے، لہٰذا چراغوں کو بُجھا دو

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ابدی معجزۂ قرآن: ازل سے حکمتِ الٰہیہ یہ رہی ہے کہ اللہ اپنے انبیاء اور رسولوں کی ایسے روشن معجزات، واضح نشانیوں اور نا قابل تردید براہین ودلائل

کے ذریعے تائید کرتے رہے ہیں جو اُن کی صداقت، اور عزیز وقدیر ذاتِ باری تعالیٰ کی طرف سے اُن کے رسول اور پیغمبر ہونے پر دلالت کرتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے پیارے نبی ﷺ کو قرآن کریم جیسے عظیم معجزہ سے مختص فرمایا۔

یہ وہ نورِ ربانی اور آسمانی وحی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے سینۂ اطہر پر ایسے عربی قرآن کی صورت میں نازل کیا جس میں کوئی کجی نہیں، آپ ﷺ اسے دن اور رات کے پہروں میں پڑھتے رہتے تھے، اور یہی وہ کتاب ہے جس کے ذریعے سے آپ ﷺ نے بے شمار ایسی اقوام کو عدم سے وجود میں لایا جن کا شمار مردوں میں ہوتا تھا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کے ذریعے مردہ دل قوموں میں روح پھونکی، اُن کی بالکل صحیح راستہ کی طرف رہنمائی کی اور انہیں پستیوں سے نکال کر ایسی بہترین امت میں بدل ڈالا جو لوگوں کی نفع رسانی کے لیے نکالی گئی۔

اللہ تعالیٰ نے یقیناً سچ فرمایا ہے: ﴿أومَن كان ميتاً...﴾ (الأنعام: ۱۲۲)

ترجمہ: ''ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ بنا دیا، اور ہم نے اس کو ایک ایسا نور دے دیا کہ وہ اس کو لیے ہوئے آدمیوں میں چلتا پھرتا ہے، کیا ایسا شخص اُس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جس کی حالت یہ ہو کہ وہ تاریکیوں میں ہے، اُن سے نکلنے ہی نہیں پاتا، اسی طرح کافروں کو ان کے اعمال مستحسن معلوم ہوا کرتے ہیں''۔

قرآن نے ایسی ایسی قوموں کو حیاتِ نو بخشی اور ایسا معاشرہ وجود میں لایا اور ایسی نسل تیار کی کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، چنانچہ قرآن نے اس عرب قوم سے جو اونٹوں اور بکریوں کو چرائی تھی اقوام وملل کے سرداروں کو پیدا کر کے انہیں دنیا کا حاکم بنا دیا، یہاں تک کہ وہ آباد دنیا کی آخری حدوں تک حکومت کرنے لگے، اور یہ تمام اس قرآن اور خاتم الأنبیاء والمرسلین ﷺ کے معجزہ کے فضل سے ہی ہوا۔

اور اسی کے بارے میں سید الشعراء کہتے ہیں ؎

أَخُوكَ عِيسَى دَعَا مَيْتًا فَقَامَ لَهُ   وَأَنْتَ أَحْيَيْتَ أَجْيَالاً مِنَ الْعَدَمِ

ترجمہ: ''آپؐ کے بھائی عیسیٰ نے مردہ کو پکارا تو وہ اس کے لیے اٹھ کھڑا ہوا جبکہ

آپؑ نے بے شمار نسلوں کو عدم سے نیا وجود بخشا''۔

یقیناً گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے معجزے ''حسّی معجزے'' تھے، جس دور اور زمانہ میں انہیں مبعوث کیا گیا اس کے مناسب تھے، جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ کہ ''ید بیضاء اور عصا'' تھا، کیونکہ وہ ایسے زمانہ میں بھیجے گئے جس میں جادوگروں کی کثرت تھی اور جادو عام تھا۔

اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ''مردوں کو زندہ کرنا، مادر زاد اندھوں اور برص کے بیماروں کو شفایاب کرنا اور بعض مخفی امور کی خبریں دینا'' تھا، کیونکہ آپؑ کی بعثت ایسے زمانہ میں ہوئی جس میں طب وحکمت کا شہرہ تھا اور ماہر معالج موجود تھے، چنانچہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام اُن کے پاس مریضوں کو شفاء دینے، مردوں کو زندہ کرنے اور اندھوں، گونگوں اور بہروں کو ٹھیک کرنے جیسے معجزات لے کر تشریف لائے جنہوں نے انہیں حیران اور عاجز کر کے رکھ دیا۔

میں تو کہتا ہوں کہ اگر گزشتہ انبیاء علیہم السلام کے معجزات ''مادّی اور حسّی معجزات'' تھے تو محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ''روحانی اور عقلی معجزہ'' ہے، اللہ نے آپ کو معجزۂ قرآن کے ساتھ مختص فرمایا جو کہ حوادثِ زمانہ کے باوجود باقی رہنے والا عقلی معجزہ ہے، تاکہ اُصحاب قلب وبصیرت اسے دیکھیں، اس کی روشنی سے منور ہوں اور اس کی ہدایت سے حال و مستقبل میں فائدہ حاصل کریں۔

سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہر نبی کو جس قدر معجزات اور نشانیوں سے نوازا گیا اسی قدر لوگ ان پر ایمان لائے، بلاشبہ مجھے جو معجزہ عطاء کیا گیا ہے وہ وحی الٰہی (قرآن) ہے جسے اللہ نے میری طرف نازل کیا ہے، پس میں امید کرتا ہوں کہ انبیاء میں سب سے زیادہ پیروکاروں والا ہوں گا۔

جی ہاں...... یہ وہ آسمانی وحی ہے جسے اللہ نے اپنے امین نبی کے قلبِ اُطہر پر اتارا، تاکہ وہ تمام جہاں والوں کے لیے روشنی اور رحمت ہو، قرآن اسلام کا ابدی معجزہ اور باقی رہنے والی دلیل ہے جو دنیا کے لئے منہ بولتا ثبوت پر ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر گواہ، اسلام کی عظمت اور اس دین کی ابدیت کے گن گاتی ہے، جبکہ حسّی معجزات اپنے کائناتی واقعات کے ساتھ ہی گزر کر ختم ہو گئے، اور اُن انبیاء کرام علیہم السلام کی وفات کے

بعد جو انہیں لے کر آئے تھے اُن کا وجود نہ رہا، لہٰذا ان کا وجود و بیان نہیں ملتا سوائے اس قرآن پاک میں کہ جو ان کی خبر دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم تمام معجزاتِ سابقہ ولاحقہ پر ایک بہت بڑی فضیلت رکھتا ہے، شاعر نے کیا ہی خوب بات کہی ہے ۔

جَاءَ النَّبِيُّوْنَ بِالْاٰيَاتِ فَانْصَرَمَتْ[1] وَجِئْتَنَا بِكِتَابٍ غَيْرِ مُنْصَرِمِ

اٰيَاتُه كُلَّمَا طَالَ الْمَدیٰ جُدُد يُزَيِّنُهن جمالُ العِتق والقِدَمِ

ترجمہ: ''انبیائے کرام معجزات لے کر آئے جو اُن کے ساتھ چلے گئے اس کی آیات ہر دراز ہوتے زمانے کے ساتھ نئی ہیں اور آپؐ ہمارے پاس ایسی کتاب لے کر آئے جو ختم ہونے والی نہیں انہیں عمدگی اور قدامت کا جمال زینت بخش رہا ہے''۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''اور یہاں ہم توجہ دلاتے ہیں کہ قرآن کے لیے بمع ان کثیر معجزات کے جن پر وہ مشتمل ہے ابدیت کی مہر لگ چکی ہے، چنانچہ وہ گردشِ ایام کے ساتھ نہ ہی ختم ہوا، اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ کی رحلت سے اسے موت آئی، بلکہ وہ اب بھی دنیا کے سامنے کھڑا ہے، ہر جھٹلانے والے سے جھگڑتا، ہر منکر کو چیلنج دیتا ہے، اور تمام اقوامِ عالم کو اپنے اندر سموئی ہوئی اسلام کی ہدایت اور بنی آدم کی سعادت کی طرف بلا رہا ہے۔

اور اسی سے نبی اکرم ﷺ کے معجزہ اور آپؐ کی انبیاء برادری (علیہم اَزکیٰ الصلوٰۃ واَتم التسلیم) کے معجزات کے درمیان فرق واضح ہوجاتا ہے، کیونکہ حضرت محمد ﷺ کے معجزات صرف قرآن ہی میں ہزاروں لاکھوں میں ہیں، اور قرآن آج بھی اور آج کے بعد بھی بقاء سے متصف رہے گا، یہاں تک کہ اللہ زمین اور اس پر موجود اہلِ زمین کے وارث و مالک بن جائیں (یعنی قیامت تک) لیکن تمام انبیاء کے معجزات محدود تعداد میں اور قلیل مدت کے لیے تھے، اُن کے زمانہ بعثت کے گزرنے سے وہ بھی چلے گئے اور اُن کی رحلت سے انہیں بھی موت آ گئی، اور جو شخص بھی اب ان کا طلب گار ہو تو انہیں ماضی کی خبروں میں ہی پا سکتا ہے، اور اس کے مُتلاشی کے لیے ان معجزات پر گواہ صرف قرآن ہی باقی و سالم ہے، اور

(۱) آیات سے مراد معجزات ہیں، آیت کی جمع ہے بمعنی معجزہ، ''انصرمت'' کا معنی ہے انبیاء کے جانے سے وہ بھی چلے گئے (از مصنف)۔

یہ ایک ایسا احسان ہے جسے قرآن نے تمام کتابوں، انبیاء اور صحیح مذاہب پر فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتَابِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ﴾ (المائدۃ:۴۸)

ترجمہ: ''اور ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے اور اس سے پہلے جو کتابیں ہیں ان کی بھی تصدیق کرتی ہے اور ان کتابوں کی محافظ ہے''۔

اور اللہ پاک کا ارشاد ہے: ﴿آمَنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ كُلٌّ آمَنَ بِاللَّهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ﴾ (البقرۃ:۲۸۵)

ترجمہ: ''اعتقاد رکھتے ہیں رسول (ﷺ) اس چیز کا جو اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور مؤمنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اُس کے فرشتوں کے ساتھ اور اُس کی کتابوں کے ساتھ اور اُس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے''۔

اسی بناء پر سید الانبیاء ﷺ کا معجزہ ''حسی معجزہ'' نہ تھا، جو حس کو دستک دیتا ہے اور نفوس پر چھا جاتا ہے، چنانچہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا (لاٹھی) کی طرح کوئی عصا نہ تھا جو سانپ بن جاتا، اور نہ ہی جس آگ میں حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کو پھینکا گیا اُس جیسی آگ تھی کہ وہ ٹھنڈی اور سلامتی والی بن جاتی، اور نہ ہی وہ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کی مانند اونٹنی تھی جو بنجر چٹان سے نکلتی اور اس کی بلبلاہٹ اور آواز ہوتی، اور نہ ہی وہ مریض تھا جو شفایاب ہو جائے یا اندھا تھا جو ٹھیک ہو جائے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا، بلکہ وہ عقلی اور ابدی معجزہ تھا، کیونکہ وہ پیغاماتِ الٰہیہ کا خاتمہ تھا، چنانچہ جب تک زمانہ رہے گا وہ بھی رہے گا، اور جب تک انسان باقی ہے وہ بھی باقی ہوگا۔

شیخ محمد البناء اپنے الفاظ میں یوں فرماتے ہیں: ''اور جیسا کہ صحیح احادیث میں وارد ہے کہ نبی ﷺ کے ہاتھ پر قرآن کے علاوہ بھی خرقِ عادت معجزات صادر ہوئے ہیں، لیکن نبی ﷺ نے اُن کے ذریعے چیلنج نہیں دیا، بلکہ چیلنج صرف قرآن کے ذریعے دیا گیا، اسی بناء

پر قرآن رسول کا ایسا معجزہ ہے جو اُن کی رسالت کی تائید کرتا ہے اور آپ ﷺ کی اتباع کرنے والے مؤمنین کے دلوں میں چمکتا دمکتا اور انہیں منور کرتا ہے...... نبی ﷺ کی رسالت عام اور ابدی ہے، کیونکہ وہ تمام رسالتوں کا خاتمہ ہے، تو حکمت یہی تھی کہ آپؐ کا معجزہ آپؐ کی نوعِ رسالت کے ہمنوا ہو، کیونکہ پہلے ہر نبی موجود ہ قوم کے لیے رسالت لے کر آتا اور یہ رسالت اپنے بعد آنے والی رسالتوں کے ذریعے ختم ہو جاتی، اور یہ ممکن نہ تھا کہ خاتم النبیین ﷺ کا معجزہ بھی ایک حسی چیز ہوتی جسے اس کے وقوع کے وقت ایک جماعت دیکھتی، اور جب رسول اللہ ﷺ رفیق اعلیٰ سے جا ملتے تو یہ محسوس چیز بھی ختم ہو جاتی، اور آپ ﷺ کے بعد کوئی اسے نہ دیکھ پاتا، کیونکہ اشیائے محسوسہ رسالت کی اس نوع اور اس کی ابدیت کی موافق نہیں تھیں، قرآن تمام انسانوں کے لیے معجزہ تھا، اور اسی لیے وہ سابقہ معجزات کے طریقے کے علاوہ ایک دوسرے طریقے سے آیا، اور وہ دنیا کے سامنے بشری شعور اور فکر انسانی کی تکمیل کے لیے بعد ہی اترا، کیونکہ سیدنا محمد ﷺ کی رسالت انسانیت کی رفیق اس وقت بنی جب اس نے اپنے شعور کو پایا اور تمام انسانیت میں عقلی بڑھوتری کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا آپ ﷺ کے معجزہ کا ادراک عقل کے ذریعے ہوا، اور کسی قسم کی حس کا محتاج نہ رہا، چنانچہ یہ وہ ابدی حقائق ہیں جس کی بلندی کا ادراک ہر دور میں انسان کرسکتا ہے، اور یہ قرآن ایک ایسا معجزہ ہے جس کے ذریعے تمام انسانوں کو خطاب فرمایا گیا ہے''۔

اعجازِ قرآن کا مطلب: اعجاز عربی زبان میں کہتے ہیں: ''دوسرے کی طرف عجز کی نسبت کرنا''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ﴾ (المائدة: ۳۱) ''کیا میں اس سے بھی گیا گزرا کہ اس کوّے ہی کے برابر ہوتا اور اپنے بھائی کی لاش کو چھپا دیتا''۔

معجزہ کو بھی معجزہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ انسان اس کی مثل لانے سے عاجز ہوتے ہیں، کیونکہ وہ مافوق العادت ایک امر ہوتا ہے جو کہ اسبابِ معروفہ کی حدود سے خارج ہوتا ہے، اور اعجازِ قرآن کا معنیٰ: ''انسانوں کا انفرادی اور اجتماعی طور پر قرآن کی مثل لانے سے عاجز ہونے کو ثابت کرنا'' ہے، اور اعجازِ قرآن کا مطلب انسان کی تعجیز برائے تعجیز (یعنی اُن کو بتلانا کہ وہ قرآن کی مثل لانے سے عاجز ہیں) نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ہر عاقل شخص کو

معلوم ہے، بلکہ اس کا مقصد اس بات کا اظہار ہے کہ یہ کتاب سچی ہے اور اس کو لے کر آنے والے رسول سچے رسول ہیں، اسی طرح انبیاء کرام علیہم السلام کے وہ تمام معجزات جن کی مثل لانے سے انسان عاجز ہے اُن سے مقصود صرف انبیاء کی صداقت کا اظہار اور اس بات کا اثبات ہوتا ہے کہ وہ جو پیغام لے کر آئے ہیں وہ حکیم وعلیم ذات کی طرف سے وحی اور معبود وقادر ہستی کی جانب سے نازل کردہ ہے، اور وہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام فقط اللہ کے پیغامات کو پہنچانے والے ہیں، اور ان کا کام صرف بتانا اور پہنچانا ہے۔

چنانچہ معجزات تب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی طرف اپنے انبیاء اور رسولوں کی سچائی پر دلائل ہوں گے، گویا کہ اللہ تعالیٰ اس معجزہ کے توسط سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے نے جو میری طرف سے پیغام پہنچایا ہے، اُس میں وہ سچا ہے، اور میں نے اسے تمہارے پاس پیغام پہنچانے کے لئے بھیجا ہے، اور اس کی سچائی پر دلیل یہ ہے کہ میں اس کے ہاتھ پر ایسے خوارقِ عادات امور جاری کروں گا کہ تم میں سے کوئی بھی اس کی مثل لانے کی استطاعت نہیں رکھے گا اور نہ ہی کسی بھی انسان کی قدرت میں یہ بات ہے کہ وہ اس جیسے عجیب کام میں انہیں جاری کر سکے، یہ ہے اعجاز کا معنی اور یہی معجزہ کا مفہوم ہے۔

اعجاز کا تحقق کب ہوگا؟ اعجاز اسی وقت ثابت ہوگا جبکہ ان تین امور کی فراوانی ہوگی، ہم درج ذیل میں ان کا اجمالاً ذکر کرتے ہیں:

(الف) اُمرِ اوّل: چیلنج کرنا، یعنی مقابلہ اور معارضہ کا طلب کرنا۔

(ب) اُمرِ دوم: چیلنج کو رد کرنے کا سبب موجود ہونا۔

(ج) اُمرِ سوم: کسی مانع کا نہ پایا جانا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم تینوں امور کی بعض مثالوں سے وضاحت کرلیں، سو ہم کہتے ہیں کہ:

☆- یہ قرآن پاک محمد ﷺ کا وہ عظیم معجزہ ہے جس کے ذریعے اللہ نے عرب کو خصوصاً اور تمام لوگوں کو عموماً چیلنج کیا، اسے ایک امی نبی لے کر آتا ہے جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا، اور نہ ہی اس نے کسی مدرسہ میں پڑھا اور نہ ہی اس نے اپنے علوم کو بڑی یونیورسٹیوں میں سے کسی یونیورسٹی میں حاصل کیا ہے، اور اُس سے یہ بھی ثابت نہیں کہ اس نے کسی ماہر

عالم سے یا تعلیم وتہذیب کے فنون میں کسی ممتاز شخصیت سے علوم ومعارف کا کوئی حصہ حاصل کیا ہو، اور نہ ہی وہ اہل کتاب ''یہود ونصاریٰ'' کے کسی عالم سے وابستہ رہے کہ وہ سابقہ امتوں کی خبروں، اور گزشتہ انبیاء کی باتوں سے واقف ہوتے۔

آپ اُن کے پاس اِس مقدس کتاب کو لے کر تشریف لائے، اور اہلِ عرب کے اُئمہ فصاحت اور شہسوارِ بلاغت ہونے کے باوجود انہیں چیلنج کیا، اور اُن سے ایسی مستحکم عبارتوں اور کچوکے لگانے والے لہجوں کے ذریعے قرآن کا معارضہ طلب کیا جو انہیں (مثل لانے کے لیے) پختہ ارادہ پر برانگیختہ کرتے، اور مقابلہ کی طرف دھکیلتے، اور آپ ﷺ نے ان سے پورے قرآن کو لانے کے چیلنج سے اس کی مثل دس سورتوں کے چیلنج کی طرف اور پھر اس کی مثل ایک سورت لانے کے چیلنج کی جانب عدول کرتے گئے، جبکہ وہ لوگ ان تمام صورتوں میں خاموش رہے، اور لب کشائی نہ کرسکے، اور اس چیلنج کے باوجود عجز در عجز اور شکست در شکست میں گرتے چلے گئے، آیا اس میں اعجاز قرآن پر سب سے بڑی دلیل اور حجت نہیں؟؟!!!!

چیلنج کرنے میں قرآن کا اسلوب: قرآن کریم میں ایسی متعدد صورتوں اور مختلف اسالیب میں چیلنج آتا ہے جو عربوں کی باڈی اور وجود کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور انہیں مناظرہ کے میدان کی طرف جا دھکیلتا ہے، وہ بھی ایسے مسحور کن اور دلکش انداز کے ساتھ کہ جو اپنی سحر انگیزی اور حسن وجمال کے ذریعے ان کے شعور پر قابو پالیتا ہے، اور ان کے دلوں پر غالب آجاتا ہے، انہیں قرآن کی مثل لانے کا چیلنج دیا، لیکن شہسوارِ فصاحت اور شہنشاہِ بیان ہونے کے باوجود وہ عاجز آگئے اور پشت پھیر لی، پھر انہیں علی سبیل التنزل اس کی مثل دس من گھڑت سورتیں لانے کا کہا، لیکن انہیں شکست وریخت کا سامنا کرنا پڑا اور ان دس سورتوں کے لانے میں بے بس ہوکر رہ گئے۔

پھر انہیں مزید تنزل کے طور پر سب سے آسان اور سہل ترین چیز کا چیلنج دیا، یعنی قرآن کی تمام سورتوں میں سے صرف ایک سورت کی مثل لانے کا کہا، لیکن کوئی ایک بھی میدان کے اکھاڑے کی طرف قدم نہ بڑھا سکا، اسی کے ساتھ قرآن نے ان کی بے بسی اور شکست کو ریکارڈ کرلیا، اور ناخواندہ نبی محمد ﷺ کا معجزہ ثابت ہوگیا کہ یہ قرآن دونوں جہاں

کے پروردگار کا نازل کردہ ہے: ﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ﴾ (الشعراء: ۱۹۲۔۱۹۵)

ترجمہ: ''اور یہ قرآن ربّ العالمین کا (بتدریج) بھیجا ہوا (کلام) ہے، اس کو امانت دار فرشتہ لیکر آیا ہے، آپ کے قلب پر صاف عربی زبان میں، تا کہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں''۔

اور اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے: ﴿قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُثَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ﴾ (النحل: ۱۰۲،۱۰۳)

ترجمہ: '' آپ فرما دیجیے کہ اس کو روح القدس آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں؛ تا کہ ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور ان مسلمانوں کے لئے ہدایت اور خوشخبری ہو جائے''۔

چیلنج کی اقسام: قرآن کریم میں آنے والے چیلنج کی دو قسمیں ہیں:

۱...... عمومی چیلنج ۲...... خصوصی چیلنج

۱...... **عمومی چیلنج:** چیلنج کی پہلی قسم تمام مخلوق کے لیے آئی، جن میں فلاسفہ، نابغۂ روزگار ہستیاں، علماء اور حکماء تمام داخل ہیں، اور وہ کسی عربی یا عجمی، گورے یا کالے، مؤمن یا کافر کی تخصیص کے بغیر سب انسانوں کے لیے آئی، سورۂ اسراء میں آنے والے اس بانگ دہل چیلنج کی طرف دھیان کریں: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء: ۸۸)

ترجمہ: '' آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات اس بات کے لیے جمع ہو جاویں کہ ایسا قرآن بنا لاویں تب بھی ایسا نہ لا سکیں گے، اور اگر چہ ایک دوسرے کا مددگار بھی بن جاوے''۔

۲...... **خصوصی چیلنج:** جو صرف عرب کے لیے اور ان میں سے بھی خاص طور پر کفار قریش کے لیے وارد ہوا، یہ چیلنج بھی دو طرح سے وارد ہوا ہے:

۱...... کلی چیلنج ۲...... جزئی چیلنج

۱۔ **کلی چیلنج:** یہ تمام قرآن کے ساتھ اُس کے احکام وحسن اور بلاغت و بیان کے بارے میں

چیلنج کا نام ہے۔

۲- جزئی چیلنج: یہ قرآن کی سورتوں میں سے کسی ایک سورت کی مثل لانے کے چیلنج کو کہتے ہیں، اگر چہ وہ قرآن کی سب سے چھوٹی سورتوں میں سے کوئی ایک سورت ہو جیسے سورۂ کوثر۔

چنانچہ پہلی قسم کی مثال اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے: ﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ﴾ (الطور: ۳۴) ''تو یہ لوگ اس طرح کا کوئی کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعویٰ میں) سچے ہیں''۔

اس آیتِ مبارکہ میں حدیث سے مراد ''مثلی قرآن'' ہے یعنی وہ ایسا قرآن لے کر آئیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے لائے ہوئے قرآن جیسا ہو، اور جس کے بارے میں اُن کا خیال ہے کہ آپ ﷺ نے اسے اپنی طرف سے گھڑا اور اللہ پر جھوٹ باندھا ہے۔

اسی طرح سورۂ قصص میں بھی اللہ تعالیٰ کے کلام میں پورے قرآن کے ذریعے چیلنج کا ذکر آیا ہے: ﴿قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِّنْ عِندِ اللَّهِ هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا أَتَّبِعْهُ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ (القصص: ۴۹)

ترجمہ: ''آپ کہہ دیجیے کہ اچھا تو (علاوہ تورات و قرآن) تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لے آؤ جو ہدایت کرنے میں ان دونوں سے بہتر ہو، میں اس کی پیروی کرنے لگوں گا اگر (تم اس دعوے میں) سچے ہو''۔

سو ان سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ اس مقدس کتاب کے علاوہ کوئی دوسری کامل کتاب لے آئیں، پس جب وہ لوگ اس پکار کا جواب نہ دے سکے تو معلوم ہوا کہ وہ متعصب لوگ ہیں، خواہشات پرست ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتے۔

۲- جزئی چیلنج: یہ چیلنج سورۂ ہود کے اندر اللہ کے اس فرمان میں آیا ہے: ﴿أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ ۖ قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ وَادْعُوا مَنِ اسْتَطَعْتُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ فَإِلَّمْ يَسْتَجِيبُوا لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ وَأَن لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ ۖ فَهَلْ أَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ (ہود: ۱۳،۱۴)

ترجمہ: ''کیا (اس کی نسبت) یوں کہتے ہیں کہ (نعوذ باللہ) آپ نے اس کو (اپنی طرف سے) خود بنا لیا ہے؟ آپ (جواب میں) فرما دیجیے کہ (اگر یہ میرا بنایا ہوا

ہے) تو (اچھا) تم بھی اس جیسی دس سورتیں (جو تمہاری) بنائی ہوئی (ہوں) لے آؤ، اور (اپنی مدد کے لیے) جن جن غیر اللہ کو بلا سکو، بلالو، اگر تم سچے ہو"۔

اسی طرح اس سے بھی کم میں چیلنج وارد ہوا کہ انہیں قرآن کی سورتوں میں سے ایک چھوٹی سورت لانے کا چیلنج دیا، اور یہ چیلنج حاضر اور مستقبل میں کھلی بے بسی کے اظہار کے ساتھ ملا ہوا، اور اُن کے نام اس ناکامی کو ریکارڈ کرتے ہوئے وارد ہوا، جو اُن کی غیرت کو اُبھار رہا تھا، اور انہیں معارضہ کی صعوبت اٹھانے پر برانگیختہ کر رہا تھا، خاص طور پر اُن کے اس قبیح قول اور جھوٹے دعوے کے بعد کہ جب انہوں نے کہا: ﴿لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ﴾ (الأنفال: ۳۱) "اگر ہم ارادہ کریں تو اس کے برابر ہم بھی لاویں، یہ تو کچھ بھی نہیں، صرف بے سند باتیں ہیں جو پہلوں سے منقول چلی آرہی ہیں"۔

سورۂ بقرہ میں اللہ کے اس کلام میں اُن کو چیلنج کیا گیا:

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرة: ۲۳،۲۴)

ترجمہ: "اور اگر تم کچھ خلجان میں ہو اس کتاب کی نسبت جو ہم نے نازل فرمائی ہے اپنے بندۂ خاص پر تو اچھا پھر تم بنالاؤ ایک محدود ٹکڑا جو اس کا ہم پلہ ہو، اور بلالو اپنے حمایتیوں کو جو خدا سے الگ (تجویز کر رکھے) ہیں اگر تم سچے ہو، پھر اگر تم یہ کام نہ کر سکے اور قیامت تک بھی نہ کر سکو گے تو پھر ذرا بچتے رہو دوزخ سے جس کے ایندھن آدمی اور پتھر ہیں، تیار رکھی ہوئی ہے کافروں کے واسطے"۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ اپنی تفسیر "الجامع لأحكام القرآن" میں فرماتے ہیں: "اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿فان لم تفعلوا﴾ کا مطلب ہے کہ اگر تم ماضی میں یہ کام نہ کر سکے، اور ﴿ولن تفعلوا﴾ کا معنی ہے کہ مستقبل میں بھی نہ کر سکو گے، اس میں ان کے عزائم کو برانگیختہ کیا گیا، اور ان کو اشتعال دلایا گیا ہے، تاکہ ان کی بے بسی اس کے بعد زیادہ اچھوتی ہو، اور یہ ان مخفی باتوں میں سے ہے جس کی قرآن نے ان کے قبل از وقوع خبر دی ہے۔

☆-رہا دوسرا امر جو کہ اہلِ عرب میں مقابلہ اور معارضہ کے سبب و مقتضی کا قائم ہونا ہے، تو وہ موجود اور حاصل تھا؛ کیونکہ نبی ﷺ اُن کے پاس ایک نیا دین لے کر آئے تھے، جس کے ضمن میں آپ ﷺ نے اُن کے دین کو غلط قرار دیا، ان کی عقول کو کم تر ٹھہرایا، اُن کے معبودوں اور بتوں کا مذاق اڑایا، اور ان معبودانِ باطلہ کو لوگوں کے درمیان مضحکہ بنا دیا، اور انہیں اپنی پیروی کرنے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے رسول ہونے کا اعتقاد رکھنے کی دعوت دی، اور اُن سے فرمایا کہ میری سچائی پر یہ کتاب دلیل ہے جسے اللہ تعالیٰ نے میری طرف نازل کیا ہے، لہٰذا تم اگر اس بات میں میری تصدیق نہیں کرتے ہو تو میں تمہیں چیلنج دیتا ہوں کہ اس کتاب کے مثل کوئی کتاب یا اس کی کسی ایک سورت کے مثل کوئی سورت لے آؤ، اور جب تم اس میں بے بس اور عاجز ہو تو یہی میری سچائی کی علامت اور تمہاری طرف مبعوث ہونے کی دلیل ہے۔

چنانچہ اہلِ عرب خاص طور پر اس کھلے چیلنج اور اُن کی عقلوں، ان کے معبودان باطلہ اور بتوں کے ساتھ انتہائی شرمناک مذاق کے بعد قرآن کی مثل لانے کے کس قدر محتاج تھے؟! میں کہتا ہوں کہ آپ علیہ السلام کے دعوے کی تردید کرنا، اور اُن کے رسول اللہ ہونے کو باطل کرنا اُن کے لئے بہت ضروری اور اہم تھا، اور یہ کام آپ علیہ السلام کے دعوے کو رد کرنے کے لیے بالکل آسان طریقہ اختیار کرنے اور بہت قریبی دروازہ سے داخل ہونے سے ممکن تھا، اور یہ ایسے طریقہ سے تھا جس میں وہ ماہر اور اس کی عمدگی و مضبوطی میں معروف تھے، ہاں وہ طریقہ کلام میں بلاغت اور زبان میں فصاحت کا تھا، اور یہ طریقہ اُن کے لیے زیادہ نفع بخش تھا بہ نسبت اُس جنگ سے جس کے مصائب کو انہوں نے چکھا اور اُس کے شدائد میں کود پڑے، یہاں تک کہ انہوں نے غموں کے جام نوش کئے اور جلد باز موت کو گھونٹ گھونٹ کر پینا پڑا، لیکن انہوں نے نیزہ بازی اور تیراندازی کو ترجیح دی اور مناظرہ کے لیے میدان میں آنا گوارا نہ کیا۔ قاضی باقلانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''یہ کیسے ممکن ہوگیا کہ وہ قرآن کے معارضہ پر قادر ہوں جو کہ اُن کے لئے نسبتاً آسان تھا، پھر یہ بات قرآن کی حجت کو بے اثر، اس کی دلالت کو فاسد اور اس کے معاملہ کو باطل کردے، لیکن وہ اس معارضہ سے رُخ موڑ کر اُن باتوں کی طرف

چلے جائیں کہ جھگڑے اور دشمنی میں اُن سے زیادہ نہیں ہوسکتا، اور ایک آسان سی بات کو وہ چھوڑ دیں؟ یہ ایسی بات ہے کہ عادتاً اس کا واقع ہونا ممتنع ہے، اور دانش مندلوگوں کا اس سے اتفاق ناممکن ہے"۔

☆-اَمرِ سوم قرآن کے مقابلہ سے اُن کے لیے کوئی مانع نہ ہونا ہے؛ کیونکہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا، جو اُن کی اپنی زبان تھی، اور اُس کے الفاظ عربوں کے الفاظ اور اُس کی عبارتیں اسلوبِ عرب کیمطابق تھیں، نیز وہ لوگ خود زبان وبیان کے مالک اور فصاحت وبلاغت کے امام تھے، اُن کے اشعار، تقاریر اور دانشمندانہ کلام اُن کے اس فن میں باکمال ہونے پر دلالت کرتے ہیں، انہوں نے فصاحت وبلاغت کے میدانوں میں سبقت کے عَلَم گاڑے، جیسا کہ زمانہ بھی توثیق کرتا ہے کہ وہ شعر ونثر میں فوقیت اور آکاشِ فصاحت میں پرواز کی طاقت اور استطاعت رکھتے تھے۔

جی ہاں! قرآن کی زبان ہی اُن کی حقیقی زبان تھی جو اُن کے فخر وناز کا سبب، محفلوں کے انعقاد کا ذریعہ اور مجالس میں جمع ہونے کا محرک تھی، تا کہ وہ بہترین قصائد اور تقاریر سنیں، اور عمدہ الفاظ اور عبارتیں بنائیں، پھر نہ ہی اُن کی قادر کلامی میں کوئی نقص تھا، اور نہ ہی ان کی عقلوں میں کمی تھی، بلکہ اُن کی قدرت وافر مقدار میں موجود اور استطاعت مشہور تھی، نیز وہ صاحب عقل ودانش بھی تھے، لیکن اس سب کے باوجود قرآن نے انہیں دعوت دی کہ وہ جس سے چاہیں مدد طلب کریں، اور سابقہ مذاہب والوں سے اپنے اندر موجود علمی کمی کو مکمل کریں، اور جادوگروں، کاہنوں، اور افرادِ انس وجن میں سے جس کو چاہیں اس کے ساتھ مل کر تیار کردہ کلام سامنے لائیں۔

سو اُن کے سامنے کوئی مانع موجود نہ تھا، اور نبی ﷺ نے اُن کے لیے معارضہ کی کوئی مدت اور مقابلہ کا کوئی متعین وقت بھی بیان نہیں کیا، تا کہ اُن سے میں کوئی شخص یہ نہ کہتا کہ یہ مدت کافی نہیں اور اس میں تنگی ہے، جیسا کہ قرآن یکبارگی نازل نہیں ہوا کہ وہ اس کے ذریعہ استدلال کرتے، بلکہ ۲۳ سال کے عرصہ میں بتدریج نازل ہوا، ہر ایک نازل شدہ مجموعے اور دوسرے مجموعے کے درمیان اتنا وقت رہتا جس میں اگر اُن کی قدرت میں ہوتا تو وہ مقابلہ اور اس کی مثل لانے کے لیے کافی تھا، سو جب وہ عاجز آ گئے تو معلوم ہوا کہ یہ

رب العباد کا نازل کردہ ہے اور یہی بات دلیل و برہان کے لیے کافی ہے۔

اعجاز قرآن پر ایک مثال: علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''مناہل العرفان'' میں ایک نفیس کلام ذکر کیا ہے، ہم اُسے انہی کے الفاظ کے ساتھ ذکر کرتے ہیں، علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے معجزہ کی تعریف کے بیان میں مندرجہ ذیل کلام فرمایا ہے:

''معجزہ خارج از عادت، اسبابِ معروفہ کی حدود سے جدا ایک امر ہے، اللہ تعالیٰ اسے مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر دعوئے نبوت کے وقت اس کی سچائی پر بطورِ گواہ پیدا فرماتے ہیں، چنانچہ جب بھی کوئی انسان اٹھ کھڑا ہو اور دعویٰ کرے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی مخلوق کی طرف مبعوث کیا گیا ہے، اور اللہ کے بندوں کی طرف اس کا رسول ہے، اور کہے کہ میرے دعوے کے اندر میری سچائی کی علامت یہ ہے کہ جس اللہ نے مجھے بھیجا ہے میرے ہاتھ پر اپنے عادی امور میں سے کسی عادی امر کو تبدیل فرمائیں گے، اور کائنات میں اپنے عمومی طریق کار میں سے کسی طریقہ کو اب چھوڑ دیں گے، اور پھر کہے کہ عنقریب اللہ تعالیٰ اس حیرت انگیز کام کو ایسے طریقہ سے لے کر آئیں گے جس میں تم اپنے آپ کو ماہر سمجھتے ہو، اور اس پر خوب قدرت رکھتے ہو، اور میں تمہیں چیلنج دیتا ہوں کہ تم سب مل کر یا تنہا تنہا اس آیت کی مثل لے آؤ، اور تمہارے سامنے دروازہ کھلا ہے جیسا کہ تمہارا اعتقاد ہے اور تمہیں جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے اس میں مکمل مہارت بھی حاصل ہے، پھر تم سب ایک طرف ہو اور میں اکیلا ہوں۔

وہ یہ بات پر اعتماد لہجہ میں کہے اور اس کھلے چیلنج کے لیے ہمیں ایسے وقت میں للکارے کہ جس میں وہ ہمارے عقائد و عادات اور اخلاق پر حملہ کر رہا ہو اور ہماری عقلوں اور ہماری مانند ہمارے آباواجداد کی عقلوں کو بھی غلط ٹھہرا رہا ہو، جبکہ ہم اپنی عزت کے دفاع اور اپنی محبوب چیز کی مدد کی خاطر اس وقت میں بہت زیادہ خواہشمند ہوں کہ اسے عاجز و خاموش کر دیں اور اس پر غلبہ و کامیابی حاصل کر لیں، پھر بلا کسی تاخیر کے وہ بھی اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور ہم بھی، وہ بھی اپنا پختہ ارادہ کرتا ہے اور ہم بھی لیکن ہم تو سب کے سب تمام تر جدوجہد اور کوششوں کے بعد بھی استطاعت نہ رکھ سکیں کہ اس کے لائے ہوئے کا مثل لے آئیں، چہ جائیکہ اس سے عظیم اور افضل ہو، باوجودیکہ ہم ایک جماعت ہیں اور وہ تنہا ہے،

نیز وہ ہمارے پاس ہماری نگاہ میں سہل ترین راستہ اور ہمارے زمانہ کے مشہور ترین فن کے ساتھ آیا ہے، اور ساتھ ساتھ اس نے ہمیں اپنے مقابلہ کا کافی موقع بھی فراہم کیا ہے، اور اپنی طرف سے ہمارے ساتھ مکمل طور پر انصاف کیا ہے۔

کیا تھوڑی سی بھی عقل رکھنے والا اس بلند و بالا اور فائق انسان، اپنی رسالت میں صادق اور اپنی دعوت میں سچے شخص کے بارے میں شک کر سکتا ہے؟! خصوصاً جبکہ اس تمام باتوں کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو کہ اس نے ہمارے درمیان اپنے بچپنے اور کم عمری کے زمانے سے لے کر اپنی بعثت و رسالت کے زمانہ تک سچائی، امانت اور بہترین اخلاق کے ساتھ پرورش پائی ہے!!، اگر وہ معجزہ ایسے طریقہ سے لے کر آتے جسے ہم نہ جانتے تو ہم کہہ سکتے کہ یہ تو ایسا شخص ہے جس نے فنون میں ایسے فن میں مہارت حاصل کر لی ہے جسے ہم نہیں جانتے، یا وہ کاریگریوں میں سے ایسی کاریگری سے واقف ہے جس کی ہمیں خبر نہیں، لیکن وہ تو ہمارے پاس ایسی جہت سے آیا جس میں ہم اپنے لیے فوقیت وسبقت کے معترف ہیں، لہٰذا جب تک ہم انصاف کرتے رہیں گے تو ہمارے لیے اُن کی اتباع اور اُن کے لائے ہوئے دین پر ایمان کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔

ہم آپ کے سامنے ایک مثال بیان کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی لکڑی کی لاٹھی کا معجزہ لے کر آئے،، جس میں روح تھی نہ حرکت اور نہ ہی نرمی اور تری تھی، پھر جس ذات نے انہیں بھیجا تھا اُس کا نام لے کر اسے پھینک دیا، تو وہ خدا کی قدرت سے ایک دوڑتا ہوا سانپ بن گیا، جبکہ وہ قوم جس کو آپؑ نے اس بات کا چیلنج دیا تھا سحر میں فائق اور ماہر اور اس میں بلند مقام اور وافر حصہ رکھتی تھی، خصوصاً جبکہ وہ لوگ ایک قوم اور آپ ایک فرد تھے، اور انہیں جادو میں ید طولیٰ بھی حاصل تھا، جبکہ آپ علیہ السلام کے بارے میں اُن کے درمیان پرورش پانے کے باوجود کسی دن بھی جادو کرنے کا علم نہ ہو سکا، تو کیا شک کا کوئی ادنیٰ پر تو باقی رہ جاتا ہے بعد ازاں کہ موسیٰ علیہ السلام کا عصا ڈالنا تھا کہ:

﴿فَإِذَا هِيَ تَلْقَفُ مَا يَأْفِكُونَ﴾ ''اُس نے اژدھا بن کر ان کے سارے بنے بنائے کھیل کو نگلنا شروع کر دیا''، ﴿فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ [1] ''(پس)

(۱) (الاعراف: ۱۱۷۔۱۱۸)

اس وقت حق (کا حق ہونا) ظاہر ہوگیا، اور انہوں نے جو کچھ بنایا تھا، سب آتا جاتا رہا''،

﴿فَغُلِبُوْا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوْا صٰغِرِيْنَ ۝ وَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سٰجِدِيْنَ ۝ قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ رَبِّ مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ﴾ ''پس وہ لوگ اس موقع پر ہار گئے، اور خوب ذلیل ہوئے، اور جو جادوگر تھے سجدہ میں گر گئے (اور پکار پکار کر) کہنے لگے کہ ہم ایمان لائے رب العالمین پر، جو موسیٰ اور ہارون کا بھی رب ہے''۔ (۱)

حق ضرور آشکارا ہوتا ہے، اسی بناء پر سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے والے خود جادوگر تھے؛ کیونکہ وہ جادو، اس کے مبادی اور نتائج کو زیادہ جاننے والے تھے، اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ یہ معجزہ اس جادو کی کسی بھی نوع میں داخل نہیں جسے وہ جانتے ہوں، آپ اسی طرح ہر اللہ کے بھیجے ہوئے رسول کے معجزے کے بارے میں کہہ سکتے ہیں، آپ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا طب میں کامل مہارت رکھنے اور ید طولیٰ رکھنے والی قوم کے روبرو اُن کا مادرزاد اندھے اور برص (جذام) کے بیمار کو اچھا کردینے، مردوں کو زندہ کردینے اور خدا کے حکم سے پرندے جیسی شکل بنادینے کے بارے میں بھی یہی کہیے۔

اور اسی طرح بلکہ اس سے بھی بڑھ کر آپ خاتم الانبیاء سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی لائی ہوئی روشن نشانیوں اور واضح معجزات کے بارے میں بھی کہہ سکتے ہیں، اور آپ کیلئے صرف قرآن ایک روشن دلیل بلکہ کئی روشن دلائل کے طور پر کافی ہے، اس میں سے ہر تین آیتوں کے بقدر کلام ایک قطعی دلیل ہے جو دنیا کے سامنے قیامت کے دن تک کیلئے کھڑی دنیا کو اپنے اندر سموئے ہوئے فصاحت و بلاغت اور علوم و معارف کے رازوں، غیب کی خبروں اور حق کے دلائل کے ذریعے للکار رہی ہے۔

معجزۂ الٰہیہ کی شرائط: معجزہ کی پانچ شرائط ہیں جن پر علماء نے تنبیہ فرمائی ہے، لہٰذا اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی جائے تو معجزہ ''معجزہ'' نہ رہے گا:

۱......**پہلی شرط:** معجزہ ان امور میں سے ہو جن پر اللہ رب العزت کے سوا کوئی قادر نہیں ہوسکتا۔

---

(۱) (الاعراف: ۱۲۰-۱۲۲)

۲...... دوسری شرط: وہ خارقِ عادت ہو اور تکوینی طریق کار کے مخالف ہو۔
۳...... تیسری شرط: اس کے ذریعے مدعیٔ رسالت اپنے دعوے کی سچائی پر استدلال کرے۔
۴...... چوتھی شرط: اس معجزہ کے ذریعے چیلنج کرنے والے نبی کے دعوے کے موافق وہ معجزہ واقع ہو۔
۵...... پانچویں شرط: کوئی شخص بطورِ معارضہ اس معجزہ کی مثل نہ لا سکے۔

لہٰذا اگر یہ پانچ شرائط پائی جائیں تو وہ خارقِ عادت امر معجزہ کہلائے گا جو اس مدعی کی نبوت پر دال ہوگا جس کے ہاتھ پر یہ معجزہ ظاہر ہوا ہے، اور اگر یہ شرائط نہ پائی جائیں تو وہ امر معجزہ ہونے سے نکل جائے گا اور مدعی کی سچائی پر دلالت نہ کرے گا۔

پہلی شرط کی تفصیل: سو اگر کوئی شخص ایسے زمانہ میں آئے جس میں انبیاء کا آنا ممکن ہے، اور رسالت کا دعویٰ کرے، اور اپنا معجزہ کھڑا ہونا، بیٹھنا، کھانا، پینا، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف حرکت کرنا قرار دے تو اس کا یہ دعویٰ معجزہ نہ ہوگا، اور نہ ہی اس کے صدق پر دال ہوگا؛ کیونکہ مخلوق اس کی مثل لانے پر قادر ہے، اور معجزات کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اشیاء میں سے ہوں جس پر انسان قدرت نہیں رکھتا، جیسے سمندر کا چیرنا، چاند کا دو ٹکڑے کرنا اور مردوں کا زندہ کرنا وغیرہ۔

دوسری شرط کی تفصیل: دوسری شرط معجزہ کا خرقِ عادت ہونا ہے، لہٰذا اگر نبوت کے دعویدار نے کہا کہ میرا معجزہ یہ ہے کہ سورج مشرق سے طلوع ہوگا اور مغرب میں غروب ہوگا، اور رات کے بعد دن آئیگا تو اس کے اس دعوے کو معجزہ نہیں کہا جائے گا؛ کیونکہ ان امور پر اگرچہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی قادر نہیں، لیکن وہ اس کی وجہ سے رونما نہیں ہوئے، بلکہ اس سے پہلے کے ہیں، چنانچہ اس میں اس کی سچائی پر کوئی دلیل نہ ہوگی۔

تیسری شرط کی تفصیل: اور وہ یہ کہ مدعیٔ نبوت اس معجزہ کے ذریعے اپنی نبوت پر استدلال کرے، اور فرمائش کے وقت اس کے دعوے کی تصدیق کیلئے وہ معجزہ پایا جائے، پس اگر کوئی انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا معجزہ یہ ہے کہ بے جان حیوان یا انسان میں تبدیل ہو جائے گا، لیکن وہ تبدیل نہیں ہوا تو یہ اس کے دعوے کی صداقت پر دال نہیں ہوگا۔

چوتھی شرط کی تفصیل: اور وہ یہ ہے کہ معجزہ دعوے کے مطابق ہو، اس کے خلاف نہ

ہو، کیونکہ اگر خلاف ہوگا تو وہ اس کی تکذیب کرے گا، مروی ہے کہ مسیلمہ کذاب لعنہ اللہ کے ساتھیوں نے اس سے کہا کہ وہ کنویں میں تھوکے تا کہ اس کا پانی زیادہ ہوجائے، اس نے تھوکا تو پانی زمین میں اتر گیا، تو یہ اس کے کذب پر دلیل ہوگئی۔

پانچویں شرط کی تفصیل: اور وہ یہ ہے کہ معجزہ کا معارضہ نہ کیا جاسکے، لہٰذا اگر اس کا معارضہ کیا گیا تو اس کا معجزہ ہونا باطل ہوجائے گا، اور صاحبِ معجزہ کے صدق پر دال نہ ہوگا، لہٰذا اگر کوئی سمندر کو چیرنے اور چاند کو دو ٹکڑے کرنے کی قدرت رکھے گا تو فلقِ بحر اور شقِّ قمر معجزہ شمار نہیں ہوگا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو خطاب کر کے فرمایا: ﴿فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ﴾ (الطور: ۳۴) ''تو یہ لوگ اس طرح کا کوئی کلام (بنا کر) لے آئیں اگر یہ (اس دعویٰ میں) سچے ہیں''۔

قرآن کے اعجاز کی وجہ کیا ہے؟ قرآن پاک اپنے اسلوب ونظم، حسن وبیان، علوم وحکمتوں، تاثیرِ ہدایت اور ماضی ومستقبل کے غیوبات کی پردہ کشائی میں اللہ تعالیٰ کا مخلوق کے لئے معجز کلام ہے، علمائے کرام نے اعجازِ قرآن کی وجوہ کے رازہائے بیان کی نقاب کشائی فرمائی ہے بعدازیں کہ اہلِ عرب کے ہاں یہ تمام وجوہ وجدان ودلیل سے ثابت تھیں، اور تمام اہل عرب اور ان میں سے اہلِ زبان وبیان کا اس پر اتفاق ہے کہ قرآن فی نفسہ معجز ہے، یعنی قرآن کا اعجاز اپنی فصاحتِ الفاظ، حسنِ بیان اور ایسے منفرد اسلوب میں ہے کہ نظم ونثر کا کوئی اسلوب اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا، نیز اس کا اعجاز اس کے ایسے مسحور کن لفظی طریقہ کی وجہ سے ہے جو اس کے صوتی نظام، لغوی جمال اور فنی مہارت میں اپنی تجلی دکھاتا ہے۔

اہلِ صرفہ کا مسلک: بعض معتزلہ جن میں اَبواسحٰق النظام بھی ہیں، کی رائے یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز صرفہ کی وجہ سے ہے، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو معارضہ پر قادر ہونے کے باوجود قرآن کے معارضہ سے پھیر کر منع کردیا، اور ان کے دلوں اور زبانوں میں اس کی مثل لانے سے عجز کو پیدا کردیا، اگر اللہ تعالیٰ ان کو اس معارضہ سے نہ پھیرتے تو اس کی مثل لانا ان کے لئے ممکن ہوتا......۔

بخدا! یہ ایسے شخص کا قول ہے جس نے عربی زبان کا ذائقہ چکھا ہے اور نہ ہی وہ اس کے رموز سے واقف ہے، بلکہ یہ تو اس شخص کا قول ہے جس نے علوم میں سے سوائے چھلکوں کے

کچھ نہیں پایا، جو نہ ہی فربہ کرتے ہیں اور نہ بھوک مٹا سکتے ہیں، یہ ایک گرا ہوا اور گھٹیا قول ہے، جو کہ قدیم وجدید تمام علمائ، فصحاء اور بلغاء کے اجماع کے مخالف ہے۔

حجۃ الادب العربی علامہ مصطفی الرافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''اعجازِ قرآن کی وجہ کے بارے میں معتزلہ کی آرا مختلف ہیں، شیطان المتکلمین ابواسحق النظام کا مسلک یہ ہے کہ اعجاز صرفہ کی وجہ سے ہے، صرفہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرب کو معارضہ پر قدرت رکھنے کے باوجود قرآن کے معارضہ سے پھیر دیا، چنانچہ یہ پھیرنا خرق عادت ہے، اور شیعہ میں سے مرتضیٰ نامی کا کہنا یہ ہے کہ بلکہ صرفہ کا معنیٰ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن سے وہ علوم سلب کر لئے جو ان کے لئے قرآن کی مثل لانے میں ضروری تھے، گویا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ عرب اصحابِ بلاغت تھے، قرآن جیسے نظم واسلوب کے لانے پر قادر تھے، البتہ اس ہٹ کر قرآنی الفاظ جن معانی پر مشتمل ہیں اُن کی مثل لانے پر قادر نہ تھے، کیونکہ وہ اہل علم نہ تھے اور نہ ہی ان کے دور میں علم کی فراوانی تھی...... یہ رائے جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں ظاہر البطلان ہے!

پھر علامہ رافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: خلاصہ کلام یہ ہے کہ ''صرفہ'' کا قول مشرکینِ عرب کے قرآن کے بارے میں اس قول سے بالکل مختلف نہیں ہے: ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ﴾ (المدثر: ۲۴) ''پس یہ جادو ہے (جو اوروں سے) منقول (ہے)''۔

جبکہ یہ ایسا دعویٰ ہے کہ جس کے قائلین کی اللہ تعالیٰ نے اس دعویٰ میں تردید وتکذیب کی ہے، اور اُن کے قول کو اندھے پن کی ایک قسم قرار دیا ہے: ﴿اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ﴾ (الطور: ۱۵) ''تو کیا یہ (بھی) سحر ہے (دیکھ کر بتلاؤ) یا یہ کہ تم کو (اب بھی) نظر نہیں آتا''۔

اس فاسد مذہب کی بناء پر تو یہ کہنا بھی ممکن ہوگا کہ معجزہ بزعم اُن کے وہ قرآن نہیں بلکہ وہ ''صرفہ'' ہے جس کے سبب وہ قرآن کی مثل لانے سے عاجز آ گئے: ﴿صَرَفَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۲۷) ''خدا تعالیٰ نے ان کے دلوں کو (ہی ایمان سے) پھیر دیا ہے، اس وجہ سے کہ وہ محض بے سمجھ لوگ ہیں (کہ اپنے نفع سے بھاگتے ہیں)''۔

اور ابن حزم الظاہری بھی جب اس پیچ دار مسلک پر چلے تو معمولی بات میں الجھ کر رہ گئے، اور اپنے پیش رو نظام معتزلی کے اختیار کیے ہوئے لچر کلام میں اُس کی اتباع کی، البتہ

اس کا اسلوب بڑا دقیق اور خوشنما ہے، بایں طور پر کہ اس نے سببِ اعجاز کے متعلق اپنی کتاب: ''الفصل'' میں لکھا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''کوئی شخص بھی اس بات کا قائل نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کلام معجز نہیں، البتہ جب اللہ تعالیٰ نے اُس پر تکلم فرما کر اسے اپنا کلام بنایا، تو اسے معجز بنادیا، اور اس کی مماثلت سے منع کر دیا، اور یہی دلیل کافی ہے جو دوسری دلیل کی محتاج نہیں''۔

چنانچہ آپ اس رائے کے قائل کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ قرآن کریم کو معجز قرار دیتا ہے، بایں معنی کہ اللہ عزّ وجل نے اس کی مماثلت سے منع فرما دیا ہے اور یہ رائے بعینہٖ ''صرفہ'' کے قائل نظام معتزلی کی ہے، جبکہ یہ رائے باطل ہے جیسا کہ ہم نے پیچھے ذکر کر دیا، اور یہ قوم روشن حق کے روشنی سے محروم ہے، کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

قدتنکرالعین ضوء الشمس من رمد وینکر الفم طعم الماء من سقم

ترجمہ: کبھی آنکھ آشوبِ چشم کی وجہ سے سورج کی روشنی سے توحش محسوس کرتی ہے اور کبھی بیماری کی بنا پر منہ کو پانی کا ذائقہ برا لگتا ہے

اعجاز کے بارے میں علمائے کرام کی آراء: علماء کا اس بات پر اجماع کے بعد کہ قرآن فی نفسہ معجز ہے، اور کوئی انسان اس کی مثل لانے پر قادر نہیں ہے، البتہ اعجاز قرآن کی وجہ کے بارے میں ان کی آراء مختلف ہوگئی ہیں:

(الف)...... بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اعجاز قرآن کی وجہ قرآن میں موجود وہ اچھوتا نظم ہے جو اپنے مطالع، مقاطع اور فواصل میں عرب کے نظم ونثر کے مختلف ہے۔

(ب)...... اور دیگر بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ اعجاز قرآن کی وجہ الفاظِ قرآن کی فصاحت، اُس کی عبارتوں کی بلاغت، اور اس کی ترتیب وترکیب کی عمدگی میں پوشیدہ ہے، کیونکہ قرآن کریم بلاغت کے اُس بلند مرتبہ پر فائز ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔

(ج)...... اور دوسرے بعض علماء کی رائے یہ کہ قرآن کا اعجاز اُس کے تناقض سے خالی ہونے، دقیق معانی اور اُن غیبی امور پر مشتمل ہونے میں ہے جو کسی انسان کے بس میں نہیں اور نہ ہی اُن کا جاننا اُس کی قدرت میں ہے، جیسا کہ یہ قرآن تناقض وتعارض سے بھی محفوظ ہے۔

(د)......اور کوئی یہاں یہ کہتا ہے کہ اعجازِ قرآن کی وجہ قرآن میں موجود وہ ظاہری خوبیاں اور بہترین مثالیں ہیں جو ہر سورت کے آغاز، مقاصد اور خاتمہ میں پائی جاتی ہیں، ان حضرات کے ہاں اعجاز کا دارومدار درج ذیل چیزوں پر ہے:

۱-الفاظ میں فصاحت

۲-معانی میں بلاغت

۳-انوکھے نظم کی شکل

تاہم یہ تمام اقوال ایک دائرہ یعنی "دائرہ بیانیہ" سے نہیں نکلتے جس کی بناء پر قرآن ممتاز حیثیت رکھتا ہے، اور یہ بات اگرچہ صحیح ہے مگر اعجاز قرآن صرف فصاحت و بلاغت میں منحصر نہیں بلکہ یہاں اعجاز قرآن کی دیگر وجوہات بھی ہیں، علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی گراں قدر تفسیر موسوم بہ "الجامع لأحکام القرآن" میں بڑی عمدہ بات کی ہے۔ چنانچہ آپؒ نے اعجازِ قرآن کی دس وجوہات شمار کی ہیں، اسی طرح علامہ زرقانی رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب "مناھل العرفان" میں اعجاز کی چودہ وجوہات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض تو وہ ہیں جو علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے ذکر کی ہیں اور بعض ایسی ہیں جن کا ذکر انہوں نے نہیں کیا، اور ہم یہاں ان وجوہات کا اجمالاً ذکر کریں گے پھر ان کی کچھ تفصیل بیان کریں گے، لہٰذا ہم بعونہ تعالیٰ کہتے ہیں:

اعجاز قرآن کی وجوہات: ۱-عربی زبان کے ہر معروف نظم سے مختلف ایک انوکھا نظم۔

۲-تمام عربی اسالیب کے خلاف ایک نادر اسلوب۔

۳-قدرتِ بشر سے ماوراء مثل نہ لائی جاسکنے والی فصاحت۔

۴-ہر وضع کردہ قانون سازی پر غالب دقیق اور کامل قانون سازی۔

۵-وحی کے بغیر معلوم نہ ہونے والی غیبی باتوں کی خبر دینا۔

۶-یقینی طور پر صحیح تکوینی علوم کے ساتھ عدم تعارض۔

۷-قرآن کریم کی بیان کردہ ہر وعدے اور وعید کا پورا کرنا۔

۸-علوم شرعیہ اور علوم تکوینیہ میں موجود علوم و معارف۔

۹-قرآن کا انسانی ضروریات کو پورا کرنا۔

۱۰-قرآن کی اپنے پیروکاروں اور دشمنوں کے دلوں میں تاثیر۔

اعجازِ قرآن کی پہلی وجہ: وجوہِ اعجاز میں سے پہلی وجہ عربی زبان کے ہر معروف نظم سے مختلف ایک انوکھا نظم ہے، لہٰذا نظم ونثر کا کوئی حصہ قرآن کریم کے نظم کی مماثلت نہیں رکھتا، اور اُساطینِ بلاغت اور ائمہ فصاحت وبیان ''ولید بن مغیرہ، عتبہ بن ربیعہ'' اور اِن کے علاوہ دیگر عرب کے فصیح ونامور حضرات کو اس بات کا خود اعتراف بھی ہے۔

تاریخ سے چند مثالیں: ۱-روایت میں آتا ہے کہ ولید بن مغیرہ نبی اکرم ﷺ کے پاس آیا، آپ علیہ السلام نے اس کے سامنے قرآن پڑھا جس سے وہ بہت متاثر ہوا، اُبوجہل کو جب یہ بات پہنچی تو وہ ولید کے پاس آیا اور کہا کہ اے میرے چچا! آپ کی قوم چاہتی ہے کہ وہ آپ کے لیے مال جمع کرکے آپ کو دے دے، کیونکہ آپ محمد کے پاس اس لئے گئے تھے کہ اس کی قبول کردہ چیز کو اختیار کرلو، یعنی اس کے احسان سے کچھ پالو، اس پر ولید نے کہا کہ قریش کو یہ بات معلوم ہے کہ میں ان میں سب سے زیادہ مالدار ہوں، اُبوجہل نے کہا کہ پھر آپ اس کے بارے میں ایسی بات کہیں جس سے آپ کی قوم کو معلوم ہوجائے کہ آپ اس کے منکر ہیں، ولید نے کہا: میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ اللہ کی قسم! تم میں سے کوئی بھی مجھ سے زیادہ شعر کو نہیں جانتا، اور نہ ہی اس کے رجز وقصیدہ اور جنات کے اشعار سے مجھ سے زیادہ واقف ہے، اور اللہ کی قسم! یہ جو کہتے ہیں وہ ان میں سے کسی کے بھی مشابہ نہیں، بخدا! جو ان کے کلام میں بلا کی شیرینی اور رونق ہے، اس کا اوپر والا حصہ پھل دار اور نچلا حصہ شاداب ہے، یہ کلام غالب ہی رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا، یہ سن کر اُبوجہل ملعون نے کہا کہ بخدا! آپ کی قوم اس وقت تک راضی نہ ہوگی جب تک آپ اس کے بارے میں کوئی نازیبا بات نہ کریں گے، ولید نے کہا کہ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں غور وفکر کرسکوں، پس جب اُس نے سوچا تو کہنے لگا: ﴿اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ یُّؤْثَرُ﴾ (المدثر: ۲۴) ''پس یہ جادو ہے (جو اوروں سے) منقول (ہے)''۔

تب اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نازل ہوا: ﴿ذَرْنِیْ وَمَنْ خَلَقْتُ وَحِیْدًا ﴿۱۱﴾ وَّجَعَلْتُ لَهٗ مَالًا مَّمْدُوْدًا ﴿۱۲﴾ وَّبَنِیْنَ شُهُوْدًا ﴿۱۳﴾ وَّمَهَّدْتُّ لَهٗ تَمْهِیْدًا ﴿۱۴﴾ ثُمَّ یَطْمَعُ اَنْ اَزِیْدَ ﴿۱۵﴾ كَلَّا ؕ اِنَّهٗ كَانَ لِاٰیٰتِنَا عَنِیْدًا ﴿۱۶﴾ سَاُرْهِقُهٗ صَعُوْدًا ﴿۱۷﴾ اِنَّهٗ فَكَّرَ

وَقَدَّرَ ﴿۱۸﴾ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۱۹﴾ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ ﴿۲۰﴾ ثُمَّ نَظَرَ ﴿۲۱﴾ ثُمَّ عَبَسَ وَبَسَرَ ﴿۲۲﴾ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ ﴿۲۳﴾ فَقَالَ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ ﴿۲۴﴾ اِنْ هٰذَآ اِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ ﴿۲۵﴾﴾ (المدثر: ۱۱۔۲۵)

ترجمہ: ''مجھ کو اور اس شخص کو (اپنے اپنے حال پر) رہنے دو جس کو میں نے اکیلا پیدا کیا اور اس کو کثرت سے مال دیا، اور پاس رہنے والے بیٹے (دیئے) اور سب طرح کا سامان اس کے لئے مہیا کر دیا، پھر بھی اس بات کی ہوس رکھتا ہے کہ (اس کو) اور زیادہ دوں، ہرگز نہیں، وہ ہماری آیتوں کا مخالف ہے، اس کو عنقریب (یعنی مرنے کے بعد) دوزخ کے پہاڑ پر چڑھاؤں گا، اس شخص نے سوچا، پھر ایک بات تجویز کی، سو اس پر خدا کی مار ہو کیسی بات تجویز کی، (اور) پھر (مکرر) اس پر خدا کی مار ہو کیسی بات تجویز کی، پھر (حاضرین کے چہروں کو) دیکھا، پھر منہ بنایا (تاکہ دیکھنے والے یہ سمجھیں کہ اس کو قرآن سے بہت زیادہ کراہت ہے)، اور زیادہ منہ بنایا، اور پھر منہ پھیرا اور تکبر کیا، پھر بولا کہ پس یہ جادو ہے (جو اوروں سے) منقول (ہے)، پس یہ تو آدمی کا کلام ہے''۔

۲- نیز منقول ہے کہ جب ولید نے نبی ﷺ سے قرآن سنا تو بہت زیادہ متاثر ہوا، اور اپنی قوم بنی مخزوم کے پاس آکر اُن سے کہا کہ اللہ کی قسم! میں نے محمد سے ابھی ایک ایسا کلام سنا ہے جو نہ کسی انسان کا کلام ہے اور نہ کسی جن کا، بخدا! اس میں بلا کی شیرینی اور رونق ہے، اس کا اوپر والا حصہ پھل دار اور نچلا حصہ شاداب ہے، یہ کلام غالب ہی رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا، تو قریش نے کہا کہ ولید اگر بے دین ہو گیا تو خدا کی قسم! تمام قریش بے دین ہو جائیں گے، اُبوجہل نے کہا کہ میں اُس کے لیے تمہاری طرف سے کافی ہوں، اور اس کے پاس غمگین ہو کر بیٹھ گیا، اور اس سے غصہ دلانے والی باتیں کیں، تو ولید اٹھ کھڑا ہوا اور اُبوجہل بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا، جب ولید اپنی قوم کے پاس پہنچا تو کہا کہ تمہارا دعویٰ ہے کہ محمد پاگل ہے، کیا تم نے اسے دیکھا ہے کہ وہ کسی کا گلا گھونٹ رہا ہو؟ اور تم کہتے ہو کہ وہ کاہن ہے، کیا تم نے اس کو دیکھا ہے کہ وہ کاہنوں جیسی بات کہتا ہو؟ اور تمہارا خیال ہے کہ وہ شاعر ہے، آیا تم نے کبھی اسے کوئی شعر کہتے سنا ہے؟ اور

تمہارا گمان ہے کہ وہ جھوٹا ہے، کیا تم نے اس پر جھوٹ کی کسی بات کا تجربہ کیا ہے؟ اِن تمام باتوں کے جواب میں سب نے کہا کہ خدا کی قسم! یہ بات نہیں......

پھر لوگوں نے پوچھا تو بتاؤ کہ وہ کیا ہے؟ ولید نے کچھ سوچا اور پھر کہا کہ وہ جادوگر ہی ہوسکتا ہے، کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ آدمی اور اس کے گھر والوں اور باپ اور بیٹے کے درمیان تفریق پیدا کر دیتا ہے۔ اور جو بھی وہ کہتا ہے وہ جادو ہی ہے جسے وہ اہلِ بابل سے نقل کرتا ہے، اس بات کو سن کر مجمع خوشی سے جھوم اٹھا، اور اس کی بات پر خوشی اور حیرت کا اظہار کرتے ہوئے منتشر ہو گیا۔

۳- صحیح مسلم میں آیا ہے کہا اُبوذر رضی اللہ عنہ کے بھائی اُنیس غفاری رضی اللہ عنہ نے حضرت اُبوذر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میری مکہ میں تمہارے ہم دین شخص سے ملاقات ہوئی ہے، وہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اللہ نے اُسے رسول بنا کر بھیجا ہے، (اُبوذر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں) میں نے اس سے پوچھا کہ لوگ کیا کہتے ہیں؟ تو اُنیس نے کہا کہ وہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، جادوگر ہے، کاہن ہے، جبکہ اُنیس خود ایک شاعر تھے، انہوں نے کہا کہ میں نے کاہنوں کی باتیں سنی ہیں، لیکن اس کا کلام کاہنوں والا نہیں، اور میں نے اس کے کلام کو شاعری کی اَقسام یعنی اَنواع و بحور پر جانچا، لیکن اس کا شعر ہونا کسی ایک شاعر کے کلام کے موافق بھی نہیں اترتا، خدا کی قسم! لوگ جھوٹے ہیں اور وہ شخص سچا ہے۔

۴- ابن اسحق رحمہ اللہ نے ''سیرت'' میں نقل کیا ہے کہ اُبوجہل نے سردارانِ قریش کی ایک جماعت میں کہا کہ محمد کا معاملہ ہم پر مشتبہ ہو گیا ہے، کاش کہ تم ہمارے لئے ایک ایسا آدمی تلاش کرو جو شعر، کہانت، اور جادو کو جانتا ہو، اور وہ محمد سے بات کرے پھر ہمارے پاس اس کے معاملہ کی وضاحت لے کر آئے، تو اس پر عتبہ بن ربیعہ جو قوم کے بڑوں اور سر برآوردہ لوگوں میں سے تھا کہنے لگا کہ میں اس کے پاس جاتا ہوں اور اس سے بات کرتا ہوں، چنانچہ عتبہ آپ ﷺ کے پاس آیا اور کہا کہ اے محمد! آپ بہتر ہو یا ہاشم؟ آپ بہتر ہو یا عبد المطلب؟ آپ بہتر ہو یا عبداللہ؟ تو پھر آپ کیوں ہمارے خداؤں کو برا بھلا کہتے ہو؟ اور ہمیں گمراہ گردانتے ہو؟ اگر آپ کو سرداری چاہئے تو ہم آپ کو سرداری کا جھنڈا تھما دیتے ہیں، آپ ہمارے سردار بن جائیں، اور اگر تمہیں عورتوں کی خواہش ہے

توقریش میں سے جس عورت کو تم چاہتے ہو، اور اُن کی لڑکیوں میں سے جس کو بھی تم پسند کرو گے تمہاری شادی کرادیں گے، اور اگر آپ کو مال چاہئے تو ہم آپ کے لئے اتنا مال جمع کریں گے کہ آپ ہم میں سب سے زیادہ مالدار اور غنی ہو جائیں گے۔

اس دوران آپ ﷺ خاموش رہے، اسے کوئی جواب نہ دیا، جب وہ اپنی درخواست سے فارغ ہو گیا تو آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ کیا تم اپنی بات سے فارغ ہو گئے؟ اُس نے کہا: جی ہاں! پھر آپ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ تب سنو، اور آپ ﷺ نے سورۃ فصلت کی تلاوت فرمانا شروع کردی: ﴿حٰمٓ ① تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ② كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ③ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۚ فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ ④ وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ ⑤ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ ۗ وَوَيْلٌ لِّلْمُشْرِكِيْنَ ⑥ الَّذِيْنَ لَا يُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ⑦ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ ⑧ قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ⑨ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَاۗءً لِّلسَّاۗىِٕلِيْنَ ⑩ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَاۗءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَاۗىِٕعِيْنَ ⑪ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَاۗءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا السَّمَاۗءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ڰ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ⑫ فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ⑬﴾ (حٰمٓ السجدۃ: ۱۔۱۳)

ترجمہ: ''حٰمٓ، یہ کلام رحمن رحیم کی طرف سے نازل کیا جاتا ہے، یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں، یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان میں) ہے، ایسے لوگوں کیلئے (نافع) ہے جو دانشمند ہیں، بشارت دینے والا ہے (اور نہ ماننے والوں کیلئے) ڈرانے والا ہے، سو اکثر لوگوں نے (اس سے) روگردانی کی پھر وہ (بوجہ اعراض کے) سنتے ہی نہیں، اور وہ لوگ کہتے

ہیں کہ جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں ہمارے دل اس سے پردے میں ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگ رہی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان میں ایک حجاب ہے سو آپ اپنا کام کیے جائیں اور ہم اپنا کام کر رہے ہیں، آپ فرما دیجئے کہ میں بھی تم ہی جیسا بشر ہوں مجھ پر یہ وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا ایک ہی معبود ہے سو اس (معبودِ برحق) کی طرف سیدھ باندھ لو اور اس سے معافی مانگو اور ایسے مشرکوں کے لئے بڑی خرابی ہے، جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کے منکر ہی رہتے ہیں، (اور برخلاف اُن کے) جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے اُن کے لئے (آخرت میں) ایسا اجر ہے جو (کبھی) موقوف ہونے والا نہیں، آپ فرمائیے کہ کیا تم لوگ ایسے خداؔ کی توحید) کا انکار کرتے ہو جس نے زمین کو (باوجود اتنی بڑی وسعت کے) دو روز میں پیدا کر دیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو یہی سارے جہاں کا رب ہے، اور اس نے زمین میں اس کے اوپر پہاڑ بنا دیئے اور اس (زمین) میں فائدے کی چیزیں رکھ دیں اور اس میں اس (کے رہنے والوں) کی غذائیں تجویز کر دیں چار دن میں (ہوا جو شمار میں) پورے ہیں پوچھنے والوں کے لئے، آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی اور وہ (اس وقت) دُھواں سا تھا سو اس سے اور زمین سے فرمایا تم دونوں خوشی سے آؤ یا زبردستی سے دونوں نے عرض کیا ہم خوشی سے حاضر ہیں، سو دو روز میں اس کے ساتھ آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان میں اس کے مناسب اپنا حکم (فرشتوں کو) بھیج دیا اور ہم نے اس قریب والے آسمان کو ستاروں سے زینت دی اور (استراقِ شیاطین) سے اس کی حفاظت کی یہ تجویز ہے (خدائے) زبردست واقف الکل کی۔ پھر اگر (دلائل توحید سن کر بھی) یہ لوگ (توحید سے) اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تم کو ایسی آفت سے ڈراتا ہوں جیسی عاد و ثمود پر (شرک و کفر کی بدولت) آفت آئی تھی"۔

آپ ﷺ جب اللہ تعالیٰ کے اس فرمان تک پہنچے: ﴿فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ﴾ تو عتبہ نے آپ ﷺ کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور قرابت کا واسطہ دیا کہ رک جائیں، اس کے بعد عتبہ اپنے گھر والوں کی طرف لوٹ گیا اور قریش کے پاس نہ آیا، سو جب وہ اُن کے پاس نہ گیا تو قریش نے کہا کہ ہمارا خیال

یہی ہے کہ عتبہ بھی بے دین ہو گیا ہے، لہٰذا وہ عتبہ کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اے عتبہ! ہمارے پاس آنے سے آپ کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر یہ کہ آپ بے دین ہو گئے ہو، یہ سن کر عتبہ غصہ میں آ گیا اور اُن سے کہا کہ خدا کی قسم! میں نے اُن سے بات کی تو انہوں نے مجھے ایسے کلام میں جواب دیا جو بخدا! نہ شعر و جادو ہے اور نہ ہی کہانت، اور میں نے تمہارے اوپر عذاب نازل ہونے کے خوف سے انہیں قرابت داری کی قسم دی کہ وہ رک جائیں، کیونکہ تم جانتے ہو کہ محمد جو بات کہتا ہے وہ جھوٹ نہیں ہوتی۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''جب عتبہ نے عربی زبان اور فصاحت و بلاغت میں اپنے ایک مرتبہ و مقام کے باوجود اس بات کا اعتراف کر لیا کہ اس نے قرآن جیسا کلام کبھی نہیں سنا تو اس قول میں عتبہ اور اس جیسے ماہرینِ فصاحت اور کلام کی تمام اجناس و انواع پر قادر الکلام لوگوں کی جانب سے بھی اعجاز قرآن کا اقرار ہے۔

اعجاز قرآن کی دوسری وجہ: دوسری وجہ وہ تمام عربی اسالیب کے خلاف اس کا ایک نادر اسلوب ہے، چنانچہ قرآن پاک ایسے عمدہ اور پر کشش اسلوب کو لے کر آیا جس نے اپنے حسن و جمال اور مٹھاس و شیرینی سے عرب کو حیران کر دیا، اور اس میں وہ بلند خصوصیات تھیں جو قرآن میں موجود طرز پر کسی بھی انسان کے کلام میں نہیں پائی گئیں، خصوصاً جبکہ نبی ﷺ نے اس کے ذریعے سے چیلنج دیا تو اساطینِ فصحاء کو عاجز، سردارانِ بلغاء کو بے بس اور بلند پایہ اہل سخن کی زبانوں کو گونگا کر دیا، اور یہ چیلنج ایسے زمانہ میں ہوا جس میں ہمتیں اس میدان میں عمدگی اور فوقیت سے مزین تھیں، اور یہ چیلنج ایسی قوم میں ہوا جن کی صلاحیتیں اس جہت میں برتری سے آراستہ تھیں۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: '' جان لیں کہ نزول قرآن کے دور سے لیکر ہمارے اس دور تک عربی زبان پر عروج و نزول، وسعت و تنگی، حرکت و جمود، اور شہریت و بدویت کے مختلف ادوار گذرے ہیں، لیکن قرآن ان تمام ادوار میں اپنی بلندی پر قائم اپنے آسمان سے سب کو تکتا جھانکتا، نور و ہدایت بکھیرتا، حلاوت و عظمت کا فیضان کرتا، فصاحت و خوش بیانی کو بہاتا، اور جدت و رونق کی جھنڈیوں سے لہلہاتا رہا، اور وہ پہلے ہی کی طرح تر و تازگی کے ساتھ اعجاز کا علم تھامے ہوئے ہے، اور اقوامِ عالم کو انتہائی یقین و اعتماد

کے ساتھ حق کی صاف گوئی وقوت، اور اعجاز کی طاقت ودبدبہ کے بارے میں بیان کرتے ہوئے للکار رہا ہے: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء: ۸۸)

ترجمہ: ''آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات اس بات کے لیے جمع ہوجاویں کہ ایسا قرآن بنا لاویں تب بھی ایسا نہ لاسکیں گے، اور اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار بھی بن جاوے''۔

اسلوبِ قرآن کی خصوصیات: تمام اسالیب بشریہ کے خلاف قرآن کریم کے اس نادر اسلوب کی چند خصوصیات ہیں، ہم انہیں ذیل میں اجمالا ذکر کرتے ہیں:

پہلی خصوصیت: قرآن کا وہ لفظی اثر جو اس کے صوتی نظام اور لغوی جمال میں اپنی تجلی دکھاتا ہے۔

دوسری خصوصیت: قرآن کا ہر عام وخاص کو مطمئن کرنا، یعنی تمام لوگ اس کی عظمت اور شان وشوکت کا ادراک واحساس کرتے ہیں۔

تیسری خصوصیت: قرآن کا عقل وجذبہ دونوں کو مطمئن کرنا، چنانچہ قرآن عقل ودل دونوں سے مخاطب ہوتا ہے اور حق وجمال کو ایک ساتھ جمع کرتا ہے۔

چوتھی خصوصیت: قرآنی ترتیب کی عمدگی اور اس کی روانی کی پختگی، گویا کہ وہ سانچہ میں ڈھلا ہوا ایک ٹکڑا ہے جو عقول سے کھیلتا اور آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔

پانچویں خصوصیت: قرآن کی تکرارِ کلام میں مہارت، اور اقسام کلام میں تفنن، یعنی وہ ایک معنی کو مختلف الفاظ اور مختلف طریقوں سے لاتا ہے، اور وہ تمام کے تمام عمدہ اور ممتاز ہوتے ہیں۔

چھٹی خصوصیت: قرآن کا اجمال وتفصیل دونوں کا جمع کرنا۔

ساتویں خصوصیت: لفظ کے قصد کے ساتھ ساتھ معنی کی تکمیل کرنا۔

اسلوبِ قرآنی کی خصوصیات پر چند توضیحی مثالیں: نابغۂ روزگار حجۃ الادب العربی علامہ مصطفی الرافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

۱- اگر آپ قرآنی الفاظ کو ان کے نظم وترکیب میں غور سے دیکھو گے تو آپ کو معلوم

ہوگا کہ اس کی صرفی اور لغوی حرکات فصاحت کے اندر وضع اور ترکیب میں خود حروف کی جگہ پا رہی ہیں، اور آپ ان حرکات کو حروف کی آوازوں کے ساتھ مانوس اور نظم موسیقی میں ان حروف کے ہم آہنگ پاؤ گے، یہاں تک کہ کبھی کبھار حرکت ثقیل ہوتی ہے جس کی بناء پر نہ وہ شیریں رہتی ہے اور نہ مزیدار، لیکن جب اسی حرکت کو قرآن میں استعمال کیا گیا تو آپ اس کی ایک عجیب شان پائیں گے۔

مثال کے طور پر ایک کلمہ: "النُّذُر" ہے جو "نذیر" کی جمع ہے، سو یہاں نون اور ذال پر ضمہ ایک ساتھ پے در پے آنے کی بناء پر ثقیل ہے، نیز اس حرف میں کھردارا پن ہے، اور زبان پر نامانوس بھی ہے، لیکن قرآن میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں اس کے برعکس آیا ہے: ﴿وَلَقَدْ أَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ﴾ (القمر: ۳۶)

ترجمہ: "اور (قبل عذاب آنے کے) لوطؑ نے ان کو ہمارے دارو گیر سے ڈرایا تھا انہوں نے اس ڈرانے میں جھگڑے پیدا کیئے"۔

لہٰذا آپ اس ترکیب میں غور کریں اور خوب سوچیں، پھر اس تأمل پر مزید غور و فکر کریں، حروف کے مواقع کا مزہ چکھیں، حروف کی حرکات کو قوتِ سامعہ پر جاری کریں، اور "لَقَدْ" کی دال اور "بَطْشَتَنَا" کی طاء میں قلقلہ کے مواضع میں تأمل کریں، اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ﴾ میں طاء کے بعد سے لیکر واو تک یکے بعد دیگرے آنے والی فتحات میں غور کریں، ساتھ ساتھ مد سے فصل بھی موجود ہے تا کہ ضمہ کا ثقل اس کے بعد حرف پر ہلکا ہو جائے، اور ضمہ اپنے صحیح مقام کو پالے، یہ اسی طرح ہے جیسا کہ کھانے میں تُرشی ہوتی ہے (جو کھانے کو لذیذ بنا دیتی ہے)۔

۲- قرآن میں ایک اچھوتا لفظ ہے جو کہ قرآن میں موجود ہر لفظ سے زیادہ نامانوس ہے، اور وہ سوائے قرآن میں واقع ہونے کے اور کسی بھی کلام میں بھلا نہیں لگتا، اور وہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ﴿تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ﴾ میں کلمۂ ﴿ضِيزَىٰ﴾ ہے، نامانوس ہونے کے باوجود نظمِ کلام میں اس لفظ کا حسن بے مثال اور نایاب ہے، اگر آپ عربی زبان کا تتبع کریں تو اس مقام کیلئے اس کے علاوہ کسی دوسرے لفظ کو مناسب نہیں پائیں گے، اس لئے کہ یہ جس سورت میں ہے وہ سورۂ نجم ہے، اس کی ہر آیت یاء پر ختم ہو رہی ہے، سو یہ کلمہ بطورِ

فاصلۂ فواصل کے آیا ہے، پھر یہ مشرکینِ عرب کی تردید کے ذیل میں ہے، کیونکہ یہ بتوں اور اولاد کی تقسیم کے بارے میں ان کے مزعومہ خیال کے تذکرہ میں وارد ہوا ہے، چونکہ انہوں نے فرشتوں اور بتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تھا! جبکہ وہ خود لڑکیوں کو زندہ درگور کردیتے تھے، لہٰذا اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى﴾ (النجم: ۲۱،۲۲)
''کیا تمہارے لئے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور خدا کیلئے بیٹیاں، اس حالت میں تو یہ بے ڈھنگی تقسیم ہوئی''۔

چنانچہ اس لفظ کی اجنبیت اس انوکھی تقسیم کے بہت زیادہ موافق ہے جس کو اللہ نے ناپسند فرمایا، گویا کہ پورے کا پورا جملہ اس پر نطق کی صورت میں عمدہ تصویر کشی کررہا ہے کہ پہلی آیت میں تردید وانکار ہے اور دوسری آیت میں ان کے زعمِ باطل کا مذاق اُڑایا گیا ہے، اور یہ تصویر کشی بلاغت کی بہترین شکل ہے، خاص طور پر اس نامانوس لفظ کی صورت میں کہ اس نے آیت کے آخری مقام میں جگہ پکڑی ہے۔

۳- وہ چیز جو بلیغ کلام کے نظم میں کسی انسان کے بس کی بات نہیں، پھر وہ شئی جو دلالت کرتی ہے کہ نظمِ قرآن کاریگری سے ہٹ کر اور نتیجۂ فکر سے بالا ایک شئے ہے، گویا کہ اسے ایک ہی جملہ پر ڈھالا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ آپ بعض الفاظ کو دیکھتے ہیں کہ وہ قرآن میں جمع ہی استعمال ہوئے ہیں، ان سے مفرد کا صیغہ مستعمل نہیں ہے، لہٰذا جب اسے مفرد کی ضرورت پیش آئی تو قرآن نے اس صیغہ کا مرادف استعمال کیا، جیسا کہ ''اللُّبُّ'' کا لفظ ہے کہ یہ جمع ہی آیا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (الزمر: ۲۱) ''اس (نمونہ) میں اہلِ عقل کیلئے بڑی عبرت ہے''۔ اور فرمانِ الٰہی ہے: ﴿وليذّكّر أولو الألباب﴾ (ابراهيم: ۵۲) ''اور تا کہ اہلِ فہم نصیحت حاصل کریں''۔ اور اسی طرح کے دیگر ارشادات بھی ہیں کہ ان میں یہ مفرد استعمال نہیں ہوا، بلکہ مفرد کی جگہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ''القلب'' کا لفظ آیا ہے: ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ﴾ (ق: ۳۷) ''اس میں اس شخص کے لیے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہم و) دل ہو یا وہ (کم از کم دل سے) متوجہ ہوکر (بات کی

طرف) کان ہی لگا دیتا ہو"۔

اور یہ اس وجہ سے ہے کہ لفظ باء شدت واجتماع کی صفت سے موصوف ہے، اور یہ شدت لامِ شدیدہ مسترخیہ سے آئی ہے، جب اس کا استعمال عمدہ نہ تھا تو اسے نظمِ قرآن سے بالکل ساقط کر دیا۔

اسی طرح لفظ "الکوب" ہے، یہ قرآن میں جمع استعمال ہوا ہے، اس کی مفرد نہیں آئی، کیونکہ مفرد میں نطق کے قابل بنا دینے والا وہ ظہور ونزاکت، انکشاف وحسنِ تناسب موجود نہیں جیسا کہ لفظِ "أکواب" جمع میں ہے، اسی طرح لفظِ "الارجائ" ہے، اس کے لفظ میں نقص ہونے کی وجہ سے قرآن نے اسے جمع ہی استعمال کیا ہے، مفرد نہیں جو کہ "الرّجا" بمعنی جانب ہے، اور جیسا کہ آپ دیکھ رہے ہیں کہ نظمِ قرآن میں یہ خوشنما نہیں لگتا۔

اور اس کے برعکس لفظِ "الأرض" ہے، کیونکہ وہ قرآن میں مفرد کے ساتھ ہی وارد ہوا ہے، جمع کے صیغہ "أرضین" کے ساتھ نہیں آیا، جب اس کی جمع کی ضرورت پڑی تو اسے رازِ فصاحت ختم کر دینے والی اور اس کو حسن و جمال سے دور کر دینے والی صورت سے نکال کر ایسے انداز میں سامنے لایا کہ ہر فکر اس کے سامنے سجدہ ریز ہو کر رہ جاتی ہے:

﴿اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ یَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَیْنَهُنَّ﴾ (الطلاق: ۱۲) "اللہ ایسا ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان ہی کی طرح زمین بھی، (اور) ان سب میں (اللہ تعالیٰ کے) احکام نازل ہوتے رہتے ہیں"۔

۴- اور اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں غور کریں: ﴿فَاَرْسَلْنَا عَلَیْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰیٰتٍ مُّفَصَّلٰتٍ﴾ (الأعراف: ۱۳۳) "پھر ہم نے ان پر طوفان بھیجا، اور ٹڈیاں اور گھن کا کیڑا، اور مینڈک اور خون کہ یہ سب کھلے کھلے معجزے تھے"۔

چنانچہ یہ پانچ نام ہیں جن میں خفیف ترین الفاظ: "الطوفان، الجراد اور الدم" ہیں، اور ان میں ثقیل ترین الفاظ: "القمل اور الضفادع" ہیں، لہٰذا "الطوفان" کو مقدم کیا گیا، کیونکہ اس میں دو حروف مدہ رکھے گئے ہیں تاکہ زبان اس کی خفت سے مانوس ہو جائے، پھر "الجراد" کو ذکر کیا، اسی طرح اس میں بھی ایک مدہ ہے، پھر اس کے

بعد دو مشدد لفظ لائے جن میں سے پہلا زبان پر زیادہ آسان اور غنہ کی وجہ سے آواز میں زیادہ دور ہے، پھر آخر میں لفظ ''الدم'' لایا گیا جو کہ پانچوں میں سب سے زیادہ آسان اور حروف کے اعتبار سے سب سے کم ہے، تاکہ زبان اس کے ادا کرنے میں تیزی دکھائے، ذوقِ نظم اس کے لئے بر قرار رہے اور اس کے ذریعے سے ترکیب میں اعجاز مکمل ہو جائے، آپ ان پانچ اسماء کو جیسے بھی تبدیل کر دیں لیکن اس مقام کے علاوہ کہیں اور فصاحت نہیں پائیں گے، اور آپ کی تقدیم یا تاخیر سے لغزش و ٹھوکر آپ کی طرف سبقت کرے گی اور آپ کو یہ بات تھکا دے گی کہ آپ اس سے زیادہ کوئی فصیح لفظ یا نظم لے آئیں۔

اسی سے ہمارے سامنے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کریم اپنے اسلوب میں منفرد ہے، کیونکہ یہ انسان کا وضع کردہ بالکل نہیں ہو سکتا، اگر انسان کی وضع کا اس میں دخل ہوتا تو وہ ایسے طریقہ پر آتا جس کا کوئی اسلوب اہل عرب کے اسالیب، یا ان کے بعد سے اس زمانہ تک آنے والے لوگوں کے اسالیب کے مشابہ ہوتا: ﴿وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا﴾ (النساء: ۸۲)

ترجمہ: ''اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے''۔

اہلِ عرب نے اس حقیقت کا ادراک کیا اور اُن کے بلغاء نے اسے یقینی طور پر جان لیا، اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ اس سے لاجواب نہ ہوتے اور نہ ہی خاموش رہتے، کیونکہ انہوں نے کلام کی ایک ایسی نوع کو دیکھا جس کو ان کی طبیعتیں ادا کرنے پر قادر نہ تھیں، اور ان کیلئے غیر مخلوق طبیعت کے ذریعے قرآن کا معارضہ کرنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا؟

علامہ زرقانی رحمہ اللہ اسلوبِ قرآن کی خصوصیات کے بارے میں بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''قرآن کا ایک دلکش اور انوکھا اثر ہے جو اس کے صوتی نظام اور لغوی جمال میں چمکتا ہے، قرآن کے صوتی نظام سے ہماری مراد قرآن کا اپنی حرکات وسکنات، مدات وغنات اور اتصالات وسکنات میں ایسا عجیب ارتباط اور بہترین ہم آہنگی ہے جو کانوں کو متوجہ اور دلوں کو ایسے طریقے سے اپنا گرویدہ بناتی ہے کہ

اُس کے درجہ تک کوئی بھی منظوم یا منثور کلام نہیں پہنچ سکتا''۔

قرآن کے لغوی جمال سے ہماری مراد وہ عجیب کیفیت ہے جس کے ذریعے قرآن اپنے حروف کے بیان اور کلمات کی لوگوں میں رائج تراتیب میں سب سے عمدہ ترتیب میں ممتاز مقام رکھتا ہے، یہ لغوی حسن و جمال اعجاز کی چوٹی تک پہنچ گیا ہے بایں طور پر کہ اگر قرآن میں لوگوں کے کلام میں سے کوئی چیز داخل ہوجائے تو اس کا مزہ اس کے پڑھنے والوں کے منہ میں کرکرا ہوجائے گا اور اس کا نظام اس کے سننے والوں کے کانوں میں ابتر ہوجائے گا۔

اس لغوی جمال اور صوتی نظام کے عجائب میں سے یہ بھی ہے کہ یہ دونوں جیسا کہ ایک پہلو سے اعجاز کی دلیل ہیں تو دوسرے پہلو سے حفاظتِ قرآن کیلئے مضبوط چار دیواری بھی ہیں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ لغوی جمال اور صوتی نظام کی شان یہ ہے کہ وہ کانوں کو متوجہ، بیداری کو برانگیختہ اور ہر انسان میں اس قرآن کریم کی طرف اقبال وتوجہ کے داعیہ کو ابھارتے ہیں، اور اسی کی بناء پر وہ ہمیشہ کیلئے مخلوق کی زبانوں اور ان کے کانوں پر باقی رہے گا، اور وہ لوگوں کے درمیان اپنی ذات اور خصوصیات سے پہچانا جائے گا، لہٰذا کوئی ایک بھی اس میں تغییر وتبدیل کی جرأت نہیں کرسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر:۹)

ترجمہ: ''ہم نے قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں''۔

اور قرآن کریم کے اسلوب کی خصوصیات میں سے یہ بھی ہے کہ وہ عقل ودل دونوں کو بیک وقت مخاطب کرتا ہے، اور حق وجمال کو ایک ساتھ جمع کرتا ہے، آپ قرآن کی جانب دیکھیں کہ جب وہ منکرین ومکذبین کے سامنے حشر ونشر پر دلیل عقلی قائم کرنے کی گرما گرمی میں ہوتو اپنے استدلال کو لاجواب اور فیصلہ کن دلائل کے ضمن میں وارد مثالوں کے ذریعے دلوں کو خوب جھنجھوڑنے اور جذبوں کو بہترین تسکین بخشنے والے طریقے سے بیان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ سورۂ فصلت میں فرماتے ہیں: ﴿وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۭ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ﴾ (حٰم السجدة:۳۹)

ترجمہ: ''اور منجملہ اس کی (قدرت وتوحید) کی نشانیوں کے ایک یہ ہے (کہ اے مخاطب) تو زمین کو دیکھتا ہے کہ دبی دبائی پڑی ہے پھر جب ہم اس پر پانی برساتے ہیں تو وہ ابھرتی ہے اور دھولتی ہے (اس سے ثابت ہوا کہ) جس نے اس زمین کو زندہ کر دیا وہی مردوں کو زندہ کر دیگا، بے شک وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

آپ سورۂ ق میں اللہ تعالیٰ کے فرمان کی طرف دھیان کریں کہ فرماتے ہیں:

﴿وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا طَلْعٌ نَّضِيْدٌ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا كَذٰلِكَ الْخُرُوْجُ﴾ (ق:۹۔۱۱)

ترجمہ: ''اور ہم نے آسمان سے برکت (یعنی نفع والا) پانی برسایا، پھر اس سے بہت سے باغ اگائے اور کھیتی کا غلہ اور لمبی لمبی کھجور کے درخت جن کے گچھے خوب گوندھے ہوئے ہوتے ہیں، بندوں کے رزق دینے کے لیے اور ہم نے اس (بارش) کے ذریعے سے مردہ زمین کو زندہ کیا، (پس) اسی طرح زمین سے نکلنا ہوگا''۔

اس بہترین اسلوب میں غور کریں جو ایک ہی وقت میں عقل کو قائل کرتا اور جذبہ کو تسکین پہنچاتا ہے، اس جملہ میں بھی غور کریں جو دلائل کے مقدموں کے لئے بمنزلہ نتیجہ ہے، اس لئے کہ پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿انّ الذی أحیاھا لمُحی الموتی﴾ اور آخری آیت میں فرمایا: ﴿کذلك الخروج﴾ یعنی خروج سے مراد حشر ونشر کے لئے قبور سے نکلنا ہے، کیا ہی سحر انگیز حسن اور زبردست اعجاز ہے جو انسان کی عقل ودل دونوں کو ایک ساتھ ان گنے چنے کلمات میں واضح دلائل اور خوبصورت بیان کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہے!!

پھر آپ قرآن کی طرف نظر کریں کہ جب وہ مثلاً یوسف علیہ السلام کا قصہ بیان کرتا ہے تو وہ اس کے ذیل میں کیسے زبردست نصائح لاتا ہے، اور اس کے ضمن میں وہ پاکدامنی، شرافت اور امانت کو مضبوطی سے تھامنے کے ضروری ہونے کی روشن دلائل سے خبر دیتا ہے، اس بہترین قصہ کے سینوں میں سے ایک سین میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ﴿وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ. قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ

﴿إِنَّهُ رَبِّيٓ أَحْسَنَ مَثْوَايَ ۖ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّٰلِمُونَ﴾ (یوسف: ۲۳)

ترجمہ: ''اور جس عورت کے گھر میں یوسفؑ رہتے تھے وہ ان سے اپنا مطلب حاصل کرنے کو ان کو پھسلانے لگی اور سارے دروازے بند کر دیئے اور کہنے لگی کہ آجاؤ، تم ہی سے کہتی ہوں، یوسف نے کہا (یہ تو بھاری گناہ ہے) اللہ بچائے (دوسرے) وہ میرا مربی ہے کہ مجھ کو کیسی اچھی طرح رکھا، ایسے حق فراموشوں کو فلاح نہیں ہوا کرتی''۔

سو آپ اس آیت میں غور کریں کہ گمراہی کے تین اسباب کا پاکدامنی کے تین دواعی کے ساتھ کس طرح ایسا موازنہ کیا گیا ہے جو رحمانی لشکر اور شیطانی لشکر کے درمیان دلکش بیان کے ساتھ سخت مقابلہ کی تصویر کشی کرتا ہے، اور ان دونوں کو عقلِ منصف کے سامنے ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ دیتا ہے؟!

اسی طرح آپ پورے قرآن کو شیریں اور مزیدار مشروب پائیں گے جو نفوس پر دلائل عقلیہ کے جام کو یکبارگی پی لینا آسان کر دیتا ہے، اور عقلوں کو جذباتی توجہات کے ذریعے آرام پہنچاتا ہے، سو آپ کسی انسان کے کلام میں اس طرح پا سکتے ہیں؟ نہیں، ہرگز نہیں۔ لہٰذا انسان کا کلام اگر عقل کا حق ادا کرے گا تو جذبہ کی حق تلفی کرے گا جیسا کہ یہ عرف عام ہو گیا ہے کہ انسانی اسلوبوں کی دو قسمیں ہیں، تیسری قسم نہیں، ''ایک اسلوب علمی'' ہے اور دوسرا ''اسلوب ادبی'' ہے، لہٰذا علم کے شوقین حضرات کو ادبی اسلوب بھلا نہیں لگتا، اور ادب کے چاہنے والوں کو علمی ااسلوب پسند نہیں آتا، اور اسی طرح آپ علماء اور محققین کے کلام میں بھی وہ تند مزاجی اور خالی پن پائیں گے جو نہ دلوں کو ہلاتا ہے اور نہ ہی نفوس کو حرکت میں لاتا ہے، اور آپ ادباء اور شعراء کے کلام میں بھی وہ علمی کمزوری اور بانجھ پن دیکھیں گے جو نہ افکار کو غذا فراہم کرتا ہے اور نہ عقول کو مطمئن کرتا ہے، لیکن قرآن اس خصوصیت میں کلام کی انواع کے درمیان منفرد مقام رکھتا ہے، کیونکہ وہ اس قادر ذات کا نازل کردہ ہے جسے ایک حالت سے دوسری حالت غافل نہیں کر سکتی: ﴿فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ (الغافر: ۶۴)

ترجمہ: ''سو عالی شان ہے اللہ جو سارے جہاں کا پروردگار ہے''۔

اعجازِ قرآن کی تیسری وجہ: اعجاز کی وجوہات میں سے تیسری وجہ ایسا بہترین اختصار اور غیر معمولی فصاحت ہے جو کسی انسان کے بس میں نہیں کہ اس کا احاطہ کرسکے، یا اس کی مثل لے آئے، کیونکہ وہ بشری طاقت اور انسانی قدرت سے ماوراء چیز ہے، ایک بکریاں چرانے والا دیہاتی جب قرآن سنتا تو رب العالمین کے سامنے سجدہ ریز ہوجاتا، اور یہ اس مقدس کتاب کے حسن اور سامعین کے دلوں میں اس کی تاثیر کا نتیجہ تھا، اور یہ ان جفاکش چرواہوں کے احساس کی نزاکت اور شعور کی لطافت کی بھی دلیل ہے۔

ایک بچی اور علامہ اُصمعیؒ کا قصہ: منقول ہے کہ علامہ اُصمعی رحمہ اللہ ایک دن باہر نکلے تو ایک خماسی یا سداسی (پانچ یا چھ بالشت یعنی میانہ قد کی) لڑکی سے ملاقات ہوئی اور اسے شعر کے بہترین مصرعے پڑھتے ہوئے سنا تو یہ اشعار بہت پسند آئے اور اس کے جمالِ اسلوب، حسن بیان اور فصاحتِ الفاظ سے آپ کے دل وجان تھرتھرا کر رہ گئے، چنانچہ اُصمعیؒ نے بچی سے کہا: تیرا ناس ہو، کیا ہی خوب تیری فصاحت ہے؟! تو اس بچی نے جواب دیا: تیرا ناس ہو! کیا اللہ عزوجل کے اس فرمان کے بعد اسے فصاحت شمار کیا جاسکتا ہے:

﴿وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ، فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ، اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (القصص: ۷)

ترجمہ: ''اور (جب موسیٰؑ پیدا ہوئے تو) ہم نے موسیٰ کی والدہ کو الہام کیا کہ تم ان کو دودھ پلاؤ پھر جب تم کو ان کی نسبت (جاسوسوں کے مطلع ہونے کا) اندیشہ ہو تو (بے خوف وخطر) ان کو دریا (نیل) میں ڈال دینا اور نہ تو (غرق سے) اندیشہ کرنا اور نہ (مفارقت پر) غم کرنا (کیونکہ) ہم ضرور ان کو تمہارے پاس ہی واپس پہنچادیں گے اور (پھر اپنے وقت پر) ان کو پیغمبر بنادیں گے''۔

پھر اس نے اُصمعیؒ سے کہا کہ اس آیت نے اپنے اختصار کے باوجود اپنے اندر، دو امروں، دو نہیوں، دو خبروں اور دو بشارتوں کو سمویا ہوا ہے...... اُصمعیؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کے شعر سے زیادہ اس کے فہم وادراک نے حیرت میں ڈالا کہ یہ کم سن لڑکی ہے لیکن اس کے علم وفہم کا دامن بہت وسیع ہے، باقی رہے وہ اشعار جنہیں وہ گا رہی تھی تو وہ اس کا یہ کلام تھا: ؎

أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ لِذَنْبِيْ كُلِّهِ مِثْلِ الْغَزَالِ نَاعِماً فِي دَلِّهِ
قَبَّلْتُ اِنْسَاناً بِغَيْرِ حِلِّهِ وَانْتَصَفَ اللَّيْلُ وَلَمْ ، أُصَلِّهِ

ترجمہ: ''میں اللہ سے اپنے ہر گناہ کی معافی مانگتی ہوں جو کہ اپنے ناز و نخرے میں ہرن کے نرم و نازک بچہ کی طرح تھا کہ میں نے ایک ایسے شخص کا بوسہ لیا کہ اس کا بوسہ لینا جائز نہ تھا اور آدھی رات بیت گئی اور میں نے نماز نہ پڑھی''۔

اس بچی نے اصمعیؒ کی توجہ قرآن میں موجود بلاغت و فصاحت، اور اختصار و اعجاز کے حسن کی طرف مبذول کرائی، چنانچہ آیتِ مبارکہ نے دو اَمروں کو جو کہ: ﴿أرضعيه﴾ اور: ﴿ألقيه في اليمّ﴾ ہیں، دو نہیوں کو جو کہ: ﴿لا تخافي﴾ اور: ﴿لا تحزني﴾ ہیں، دو خبروں کو جو کہ: ﴿أوحينا﴾ اور: ﴿خفت﴾ ہیں، اور دو بشارتوں کو جو کہ: ﴿انا رادّوه اليك﴾ اور: ﴿جاعلوه من المرسلين﴾ ہیں اپنے اندر سمویا ہوا ہے۔

پہلی بشارت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی والدہ کی طرف صحیح سلامت اور باعزت لوٹانے کی ہے، دوسری بشارت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عنقریب رسول اور راہنما بنا کر بھیجے گا، اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو، آپ غور کریں کہ اس دیہاتی بچی نے اس اختصار اور اعجاز کے رازوں میں سے ایک راز کیسے اپنی عربی فطرت کی بناء پر پالیا، اور اس قرآن کے بھیدوں میں سے وہ بھید جان لیا جسے اصمعی خود بھی نہ جانتے تھے، تو گویا اس آیت کو لولؤ و مرجان (ہیرے جواہرات) کی لڑی میں پرو دیا گیا ہے، لہٰذا اس کے موتی ایک توازن کے ساتھ ہیں۔

ب۔ مروی ہے کہ مشہور اور مایہ ناز انشاء پرداز ابن المقفع نے ایک مرتبہ قرآن کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا، تو اس نے ایک بچہ کو اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد مبارک تلاوت کرتے ہوئے سنا: ﴿وَقِيلَ يَٰٓأَرْضُ ٱبْلَعِى مَآءَكِ وَيَٰسَمَآءُ أَقْلِعِى وَغِيضَ ٱلْمَآءُ وَقُضِىَ ٱلْأَمْرُ وَٱسْتَوَتْ عَلَى ٱلْجُودِىِّ ۖ وَقِيلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ ٱلظَّٰلِمِينَ﴾ (هود: ۴۴)

ترجمہ: ''اور حکم ہو گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان! تھم اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دور''۔

اس آیت کا سننا تھا کہ کہ قلم توڑ ڈالا اور جن صفحات میں معارضہ کے متعلق لکھنا شروع

کیا تھا، وہ پھاڑ ڈالے، اور کہا کہ خدا کی قسم! یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس کی مثل لے آئے، اور جمع کردہ تحریر کو ریزہ ریزہ کر دیا اور اس کا اظہار کرتے ہوئے اپنے آپ سے شرم محسوس کرنے لگا۔

اور اس طرح ایک بلیغ اور عظیم ادیب قرآن کی ایک سورت کے مقابلہ کا سوچنے کے بعد اپنے عزم سے رک گئے؛ کیونکہ انہوں نے قرآن کے حسن کے راز کو پالیا تھا۔

پھر آپ قرآن کے اسلوب میں فصاحت واختصار کی طرف نظر کریں، اور پھر اس کا موازنہ کسی عربی شخص کے بیان کردہ سب سے حسین اسلوب کے ساتھ کریں، اور وہ اس بولی کے بولنے والوں میں سے سب سے زیادہ فصیح سید المرسلین محمد بن عبداللہ (ﷺ) کا اسلوب ہے، جس کی فصاحت وبلاغت کا اعتراف اس کے ہمنواؤں سے پہلے اس کے دشمنوں نے کیا، قرآن اور حدیث نبوی کے درمیان اگر آپ موازنہ کریں تو آپ آسمان وزمین کے مابین فرق کی طرح زبردست فرق اور بون بعید پائیں گے، قرآن کی بلاغت، تروتازگی اور نورانیت حسن کے اعلیٰ درجہ، اور اعجاز وبیان کے بلند مقام پر فائز ہے۔

آپ جنت اور اس میں پائی جانے والی نعمتوں اور ہمیشگی کے وصف کے متعلق آنحضرت ﷺ کے اس ارشاد میں غور کریں: "فِيهَا مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ، وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلَى قَلْبِ بَشَرٍ" "اس میں وہ کچھ ہے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ کسی انسان کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے"۔

آپ ان الفاظ کی حسن ورعنائی کے باوجود ان کے اور اہلِ جنت کی نعمتوں کے بیان میں اللہ تعالیٰ کے ان فرامین کے درمیان تقابل کرلیں: ﴿وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ﴾ (الزخرف: ۷۱) "اور وہاں وہ چیزیں ملیں گی جن کو جی چاہے گا اور جن سے آنکھوں کو لذت ہوگی"۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ أَعْيُنٍ﴾ (السجدة: ۱۷) "سو کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لیے خزانہ غیب میں موجود ہے"۔

چنانچہ یہ ارشاد یہ وزن میں زیادہ ٹھیک، ترکیب میں حسین ترین، لفظ میں زیادہ شیریں، عبارت میں فصیح تر اور حروف میں انتہائی کم ہے!!

اور آپ ان فرامین کے درمیان بھی موازنہ کریں کہ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: "کلکم راعٍ و کلکم مسؤول عن رعیته، الرجل راعٍ فی بیته مسؤول عن رعیته" "تم میں سے ہر ایک نگہبان ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا، آدمی اپنے گھر کا نگہبان ہے اور اس سے اسکی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فَوَرَبِّكَ لَنَسْـَٔلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الحجر: ۹۳،۹۲)

ترجمہ: "سو آپ کے پروردگار کی قسم! ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے"۔

اور فرمانِ باری ہے: ﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ﴾ (الأعراف: ٦)

ترجمہ: "پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے"۔

اسی طرح اگر آپ نبی کریم ﷺ کے تمام اقوال اور قرآن کریم کے درمیان تقابل کرتے جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ رسول کا کلام اپنی بلاغت کے باوجود انسانیت کے بلند حیثیت کلام کے دائرے سے نہیں نکلتا، لیکن کلام اللہ کے مشابہ کوئی کلام نہیں ہوسکتا، کیوں کہ وہ انسان کے خالق کا کلام ہے، آپ اس کلام کی طرف نظر کریں کہ وہ اپنی مقدس آیات میں سے ایک آیت کے حصہ میں گزشتہ اقوام کے احوال، منکرین و مکذبین کے انجام اور ان کی ظلم و سرکشی کے نتیجہ میں ان پر نازل ہونے والے حادثات و مصائب، پھر سرکشی میں حد سے تجاوز کرنے کے بعد ان سب سے انتقامِ الٰہی کی کیفیت اور ان میں سے کسی ایک کے بھی باقی نہ رہنے کو بیان کر رہا ہے، اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿فَمِنْهُمْ مَّنْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِ حَاصِبًا ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَخَذَتْهُ الصَّيْحَةُ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ خَسَفْنَا بِهِ الْاَرْضَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اَغْرَقْنَا ۚ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (العنکبوت: ۴۰)

ترجمہ: "سو ان میں سے بعضوں پر تو ہم نے تند ہوا بھیجی، اور ان میں سے بعض

کو ہولناک آواز نے دبایا اور ان میں سے بعض کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور ان میں بعض کو ہم نے (پانی میں) ڈبو دیا، اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرتا لیکن یہی لوگ (شرارتیں کر کے) اپنے اوپر ظلم کیا کرتے تھے''۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ ابن الحصارؒ سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''نظم، اسلوب اور فصاحت یہ تینوں وجوہات ہر سورت بلکہ ہر آیت کا لازمی حصہ ہیں، اور انہیں تین کے مجموعہ سے ہر آیت وسورت کا مسموع انسان کے تمام کلاموں سے ممتاز ہو جاتا ہے، اور اسی سے تحدی وتعجیز واقع ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ ہر سورت دس وجوہات میں سے کسی اور وجہ کے ملائے بغیر ان تین وجوہ کے ساتھ ممتاز رہتی ہے، یہ سورۂ کوثر ہے جو تین چھوٹی آیات پر مشتمل قرآن میں سب سے چھوٹی سورت ہے، لیکن یہ بھی دو غیب کی خبروں پر مشتمل ہے:

پہلی خبر جنتی نہر ''کوثر'' اس کی کشادگی ووسعت، اور اس کے برتنوں کی کثرت کے بارے میں دی گئی ہے، اور یہ اس بات پر دال ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ماننے والوں کی تعداد تمام انبیاء کے پیروکاروں سے زیادہ ہوگی۔

دوسری خبر ولید بن مغیرہ کی حالت کے بارے میں دی گئی ہے کہ ولید آیت کے نزول کے وقت مال واولاد والا تھا، پھر اللہ تعالیٰ نے اس کیا موال اولاد کو ہلاک کر دیا اور اس کی نسل ختم ہوگئی۔

اعجازِ قرآن کی چوتھی وجہ مکمل الٰہی قانون سازی: اعجازِ قرآن کی وجوہات میں سے ایک ایسی وجہ کامل الٰہی قانون سازی ہے جو قدیم وجدید میں انسان کے ہاں معروف ہر مصنوعی قانون سازی سے اعلیٰ ہے، پس قرآن کریم وہ کتاب ہے جس نے عقائد کے اصول، عبادات کے احکام، فضائل وآداب کے قوانین، اور اقتصادی، سیاسی، شہری اور معاشرتی قانون سازی کے ضوابط کو وضاحت سے بیان کیا ہے، اور وہی ہے جس نے عائلی اور سوسائٹی زندگی کو منظم کیا، اور معزز انسانیت کے بنیادی اعلیٰ اصول وضع فرمائے جن کا آج بیسویں صدی کے اصلاح پسند لوگ ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں، جی ہاں وہ مساوات، آزادی اور انصاف پسندی ہے جسے یہ لوگ ڈیموکریسی یعنی جمہوریت کا نام دیتے ہیں،

اوراس کے علاوہ دیگر شہری قوانین بنائے اور ایسی قانون سازی فرمائی جس کی جانب آج جدید تمدن رواں دواں ہے۔

عقائد میں قرآن کریم پاکیزہ، بلند، واضح اور روشن عقیدہ کا داعی ہے جس کا مدار اللہ پر ایمان، اُس کے تمام انبیاء ورُسل کی تصدیق، اور تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا ہے ؛اسی بات کا اظہار اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں ہو رہا ہے:﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ﴾ (البقرۃ: ۲۸۵)

ترجمہ:''اعتقاد رکھتے ہیں رسول (ﷺ) اس چیز کا جو اُن کے پاس اُن کے رب کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اور مؤمنین بھی سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اُس کے فرشتوں کے ساتھ اور اُس کی کتابوں کے ساتھ اور اُس کے پیغمبروں کے ساتھ کہ ہم اس کے پیغمبروں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے''۔

قرآن نے اہل کتاب ''یہود ونصاریٰ'' کو ایک ایسے متفقہ کلمہ کی طرف بلایا جس میں نہ کوئی کجی ہے نہ پیچیدگی، فرمانِ ربانی ہے:﴿قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْـًٔا وَّلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران: ۶۴)

ترجمہ:''آپ فرمادیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلّم ہونے میں) برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ تعالیٰ کے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی کسی دوسرے کو رب نہ قرار دے، خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر، پھر اگر وہ لوگ (حق سے) اعراض کریں تو تم لوگ کہہ دو کہ تم (ہمارے) اس (اقرار) کے گواہ رہو کہ ہم تو ماننے والے ہیں''۔

اور عبادات میں قرآن کریم اہم ترین اور بنیادی عبادات لیکر آیا، لہٰذا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور تمام نیکی اور اطاعت کے کاموں کو مشروع قرار دیا، عبادت اسلام میں صرف ان مذکورۃ الصدر اصول وارکان میں منحصر نہیں، بلکہ وہ تو ہر بھلائی، ہر کارِ خیر اور ہر طاعت کو شامل ہے، اسی لئے علماء کرام نے ہر اس پر عمل کو جسے انسان اللہ تعالیٰ کی رضا کی

خاطر کرتا ہے عبادت قرار دیا ہے، نیز علماء فرماتے ہیں: "ان النية الصالحة تقلب العادة الى العبادة"۔ "نیک نیتی عادت کو عبادت بنا دیتی ہے"۔ چنانچہ جب انسان کوئی کام کرتا ہے اور حرام سے بچنے اور اپنے اہل وعیال پر خرچ کرنے کے ارادہ سے اپنے لئے کوئی پیشہ اختیار کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی پر قوت وقدرت کیلئے کھاتا یا پیتا ہے، تو اس کا یہ عمل بھی عبادت ہوگا، اور وہ اس پر بھی ثواب پائے گا۔

اس باب میں اصل نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "بیشک جو کچھ بھی تو اللہ کی رضا کی خاطر خرچ کرے گا اس پر تجھے اجر ملے گا یہاں تک کہ اس لقمہ پر بھی اجر ملے گا جسے تو اپنی بیوی کے منہ میں رکھے"۔ نیز آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: "تمہارے بیوی کے پاس جانے میں بھی صدقہ ہے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم میں سے کوئی اپنی شہوت کی تکمیل کے لئے ایسا کرتا ہے اور اس میں اس کے لئے اجر ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بتائیے! اگر وہ حرام طریقے سے شہوت رانی کرتا کیا اسے گناہ نہ ہوتا؟ تو اسی طرح جب اس نے حلال طریقہ اپنایا ہے تو اسے اجر ملے گا"۔

جب ہم عباداتِ مفروضہ کے اصول پر گہری نگاہ ڈالتے ہیں تو ہم یہ بات پاتے ہیں کہ اسلام نے عبادات میں وسعت وتنوع کو اپنایا ہے، اور انہیں مختلف انواع میں تقسیم کر دیا ہے، لہٰذا عبادات میں سے کوئی تو "مالی عبادت" ہے جیسا کہ زکوٰۃ وصدقات، اور ان میں سے بعض "بدنی عبادات" ہیں، جیسا کہ نماز وروزہ، اور ان میں سے کچھ تو وہ ہیں جو دونوں پہلوؤں کیلئے جامع ہیں یعنی "مالی اور بدنی عبادات ہیں" جیسا کہ جہاد فی سبیل اللہ ہے جو کہ مال وجان دونوں سے ہوتا ہے، اس تقسیم میں اسلام کا عظیم مقصد اور عالی شان حکمت پنہاں ہے، اور یہ تقسیم اس لئے ہے کہ مبادا نفس کسی چیز سے مانوس نہ ہو جائے جس کے نتیجہ وہ اس کی عادت بن جائے، یا ایک عبادت سے تنگی اور بوریت محسوس نہ کرے۔

اور "جنرل قانون سازی" کے میدان میں ہم قرآن کو دیکھتے ہیں کہ اس نے سیولین، تعزیراتی، سیاسی اور اقتصادی قوانین سے متعلق عام قوانین وضع فرمائے، اور امن وجنگ کی حالت میں ملکی معاملات کیلئے بہترین طریقہ اور عادلانہ نظام پر مبنی قواعد مقرر کئے ہیں، چنانچہ معاملات کے باب میں قرآن نے لوگوں کے اموال کو غلط طریقہ سے کھانے کو حرام

قرار دیا: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوٓا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ إِلَّآ أَن تَكُونَ تِجَارَةً عَن تَرَاضٍ مِّنكُمْ﴾ (النساء: ۲۹)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طور پر مت کھاؤ، لیکن کوئی تجارت ہو جو باہمی رضامندی سے ہو تو مضائقہ نہیں''۔

اور سودا کرتے وقت گواہوں کے قائم کرنے اور قرض کے لکھنے کی دعوت دی: ﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوٓا إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰٓ أَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوهُ ۚ وَلْيَكْتُب بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ﴾ (البقرۃ: ۲۸۲)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! جب معاملہ کرنے لگو ادھار کا ایک میعادِ معین تک (کیلئے) تو اس کو لکھ لیا کرو اور یہ ضرور ہے کہ تمہارے آپس میں (جو) کوئی لکھنے والا (ہو وہ) انصاف کے ساتھ لکھے''۔

اور تعزیراتی امور سے متعلق بھی قرآن نے حدود کو مشروع فرمایا، اور معاشرہ کی حفاظت، اور اس کو انتشار و اضطراب سے بچانے اور امت کی زندگی، مستقبل اور اس کے اموال واعراض کی بقاء وسلامتی کی خاطر امت پر حدود کے نفاذ و اجراء کو ضروری قرار دیا، تاکہ امت ایسی پرسکون اور خوشحال زندگی گزار سکے جو امن وآشتی کے ذریعے ہی ممکن ہو سکتی ہے۔

قرآن کریم نے بڑے بڑے جرائم اور فرد و جماعت کے مستقبل کے لئے زیادہ خطرناک بدکاریوں کے متعلق وضاحت سے بیان فرمایا ہے، اور ہر ایک کیلئے مقرر سزائیں بھی وضع کی ہیں، جن پر زیادتی روا ہے اور نہ ہی کمی، اور نہ ہی ان کے نافذ کرنے میں سستی کرنا جائز ہے، اور اس کے علاوہ ہلکے جرائم کی سزاؤں کو مسلمان حاکم کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ سنت مطہرہ کی روشنی میں جو سزا ان کیلئے مناسب سمجھے اسے ان جرائم میں نافذ کرے، اور یہ نفاذ ایسے طریقہ سے ہو جو اسلام کی روح کو ثابت کردے کہ اس میں لوگوں کے ساتھ خیرخواہی اور معاشرہ کو اجتماعی مفاسد اور مظالم سے پاک کرنے کا ارادہ ہو، اور جہاں تک ان بڑے جرائم کی بات ہے جن کیلئے قرآن نے عبرتناک سزائیں مقرر کی ہیں تو وہ یہ پانچ ہیں: قتل، زنا، چوری، راہ زنی اور لوگوں کی عزتوں پر تہمت کے ذریعے

دست درازی کرنے کا جرم۔

اور شاید کہ قرآنی وربانی قانون سازی اور انسان کی بنائی ہوئی وضعی قانون سازی کے درمیان تقابل کی خوبصورت مثال وہ عظیم اثر ہے جسے قرآن کریم نے اجتماعی مفاسد اور معاشرتی بیماریوں کے علاج کیلئے اپنے اختیار کردہ دانشمندانہ طریقے کی وجہ سے عربوں کے دلوں کے اندر چھوڑا ہے، بایں طور کہ اس نے ہر فساد کو ختم کر دیا، اور ہر گناہ کو ان کے دلوں سے جڑ سمیت اکھیڑ ڈالا، اور انہیں لوگوں کی نفع رسانی کیلئے بھیجی گئی بہترین امت بنا دیا، چنانچہ وہ پوری دنیا پر حکمرانی کرنے لگے، اور عالم ارضی کی قیادت وسیادت انہیں نصیب ہوئی۔

زمینی حقائق سے چند مثالیں: قرآن کی دانشمندانہ قانون سازی کی دیگر انسانی قوانین اور زمینی نظاموں پر برتری کی مثالوں میں سے ایک مثال وہ بھی ہے جس کا ہم حقیقی زندگی میں مشاہدہ کرتے ہیں، ہمارے لئے درج ذیل میں شریعت اسلامیہ کی دیگر نظاموں پر فوقیت کی طرف ہلکا سا اشارہ کرنا ممکن ہے:

۱- زمانہ قریب ہی میں امریکا نے شراب پر پابندی لگائی، لیکن وہ بری طرح ناکام ہوا، اور کامیابی نہ پا سکا، کیونکہ اسے اُس حکیمانہ طریقہ کی توفیق نصیب نہ ہو سکی جسے اسلام نے شراب کے حرام کرنے میں اختیار کیا ہے، چنانچہ شراب کے زبردست نقصان کے اعتقاد کے باوجود امریکا کو اس کی دوبارہ اجازت دینا پڑی۔

۲- بعض مغربی ممالک اور خصوصاً امریکا نے طلاق کی اجازت دے دی جبکہ اس سے پہلے وہ اُن کے ہاں گرجا کی تعلیمات کی وجہ سے ممنوع تھی، لیکن وہ ممالک اس میں نقصان دہ حد تک پہنچ گئے اور اب بھی وہ مسلسل طلاق کی قانون سازی میں مصروف عمل ہیں۔

۳- یورپ کے اصلاح پسند لوگ متعدد بیویاں رکھنے کی اجازت کی ضرورت پر اپنی آوازیں بلند کر رہے ہیں، یہاں تک کہ دیر تک نہ بیاہنے والی عورتوں کی کثرت کی وجہ سے ان کی اپنی عورتیں بھی اس کا مطالبہ کر رہی ہیں، کیونکہ یہ پریشانی یورپی معاشرے میں بہت اہمیت اور حد درجہ خطرناک صورت اختیار کر گئی ہے۔

۴- ازدواجی بدعنوانیاں متمدن یورپی معاشرے میں انتہائی کریہہ شکل اور ہولناک صورت میں عام ہو گئی ہیں، یہاں تک کہ ہر خاندان اپنی خاندانی کڑیوں کی جدائی اور ٹوٹنے

سے سہاہوا ہے، اورنومولود پڑے ہوئے ہوئے بچوں کی کثرت ہے، یہ سب کچھ بے پردگی، نمائشی سنگار و خوبصورتی، اور مرد و زن کے باہم آزادانہ اختلاط کے سبب ہے۔

۵- حکومتِ اسپین نے اپنے ملک میں سرکاری قحبہ خانوں، اور باتھ ڈریس میں عورتوں کے سواحلِ سمندر پر نکلنے سے منع کرنے کا ایک فیصلہ اور قانون جاری کیا ہے۔

۶- فرانس کے صدر نے دوسری جنگِ عظیم میں فرانس کی شکست کے اگلے دن جرمنیوں کے سامنے اعلان کرتے ہوئے کہا کہ حکومتِ فرانس کے زوال، اور اسکی شکست و ہزیمت کا اصل سبب ان کا جنسی شہوات میں منہمک ہونا اور فساد و فتنوں کی جگہ میں بے جا آگے بڑھنا ہے"۔

۷- آخر میں ہم دیکھتے ہیں کہ متمدن مغربی معاشرہ میں طویل المیعاد قید و بند اور دار و رسن کی مقرر کردہ سزاؤں کے اعلان کے باوجود جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور اس کے باوجود ہم نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے اغوا کرنے، لوگوں کے مار ڈالنے، اور دن دیہاڑے گھروں، بنکوں، اور بڑی بڑی مارکیٹوں میں ڈاکہ ڈالنے جیسے خوفناک جرائم کا مشاہدہ کر رہے ہیں، یہاں تک کہ ہم دہشت گرد گوریلا جماعتوں کے وجود کے بارے میں بھی سنتے رہتے ہیں جو ملکوں کے امن اور لوگوں کی سلامتی کیلئے خطرہ بن رہی ہیں، یہ وضعی نظاموں اور بشری قوانین کی ناکامی پر سب سے بڑی دلیل ہے، البتہ اسلام امن و امان کو برقرار رکھتا ہے، اور جرم کے پنپنے سے پہلے ہی اسے ختم کر دیتا ہے، کہنے والے نے کیا ہی خوب کہا ہے:

اِیهِ عَصْرَ الْعِشْرِیْنَ ظَنُّوکَ عَصْراً	نَیِّرَ الْوَجْهِ مُسْعِدَ الإِنْسَانِ
لَسْتَ نُوْراً، بَلْ أَنْتَ نَارٌ و ظُلْمٌ	مُذْ جَعَلْتَ الإِنْسَانَ كَالْحَیَوَانِ
أَیْنَمَا نَظَّمَتْ عُقُوْلٌ ضِعَافٌ	مِنْ نِظَامِ الْمُهَیمِنِ الدَیَّانِ

ترجمہ اشعار: "لوگوں نے تجھے دمکتے چہرے اور انسانیت کو سعادت بخشنے والا سمجھا تھا، تو روشنی نہیں، بلکہ آگ اور ظلم ہے، جب سے تو نے انسان کو جانور بنایا ہوا ہے، کہاں کمزور عقلوں کا مرتب کیا ہوا نظام جزا و سزا کے مالک اور نگہبان ذات کے نظام کے برابر ہو سکتا ہے"۔

بس یہی وہ فرق ہے جو رحمانی اور انسانی قانون سازی کے درمیان پایا جاتا ہے، لیکن اکثر لوگ اس سے ناواقف ہیں۔

اعجازِ قرآن کی پانچویں وجہ: غیب کی خبریں بتانا: اعجاز قرآن کی وجوہات میں سے ایک وجہ ''غیب کی پیشگی خبریں بتانا'' ہے، اور یہ بات اس قرآن کے کسی انسان کے کلام نہ ہونے پر روشن اور قطعی دلیل ہے، بلاشبہ وہ صرف علام الغیوب کا ہی کلام ہوسکتا ہے جس سے کوئی راز کی بات پوشیدہ نہیں، اور اگر یہ محمد ﷺ کا بنایا ہوتا جیسا کہ معاندین کا خیال تھا تو ان غیب کی خبروں کا آپ ﷺ کی بتائی گئی خبر کے خلاف واقع ہونے کے سبب اس پر علاماتِ وضع ظاہر ہوجاتیں، اور صاف جھوٹ سے ان کے حال کی جگ ہنسائی ہوجاتی جبکہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ پر جھوٹ باندھنے سے کوسوں دور ہیں۔

الف- ان غیب کی خبروں میں سے ایک قرآن کا روم وایران کے درمیان عنقریب واقع ہونے والی اس جنگ کی خبر دینا ہے جس میں روم کو گذشتہ جنگوں میں شکست کے بعد فتح اور غلبہ حاصل ہونا تھا، اور یہ خبر اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں موجود ہے: ﴿الٓمّٓ ① غُلِبَتِ الرُّوۡمُ ② فِیۡۤ اَدۡنَی الۡاَرۡضِ وَھُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ غَلَبِہِمۡ سَیَغۡلِبُوۡنَ ③ فِیۡ بِضۡعِ سِنِیۡنَ ۬ؕ لِلّٰہِ الۡاَمۡرُ مِنۡ قَبۡلُ وَمِنۡۢ بَعۡدُ ؕ وَیَوۡمَئِذٍ یَّفۡرَحُ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ④ بِنَصۡرِ اللّٰہِ ؕ یَنۡصُرُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَھُوَ الۡعَزِیۡزُ الرَّحِیۡمُ﴾ (الروم: ۱-۵)

ترجمہ: ''الٓمّٓ، اہل روم ایک قریب کے موقع میں مغلوب ہوگئے، اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب تین سال سے لے کر نو سال تک کے اندر اندر غالب آجاویں گے، پہلے بھی اختیار اللہ ہی کو تھا اور پیچھے بھی اور اس روز مسلمان اللہ کی اس امداد پر خوش ہوں گے، وہ جس کو چاہے غالب کردیتا ہے اور وہ زبردست ہے (اور) رحیم ہے''۔

مفسرین کرام اس آیت مبارکہ کے بارے میں ذکر کرتے ہیں کہ روم کی عیسائی حکومت اور ایران کی آتش پرست حکومت کے درمیان ایک جنگ لڑی گئی جس میں ایرانی رومیوں پر غالب آگئے، اس فتح سے مشرکین بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مسلمانوں پر طعنہ زنی کی اور کہا کہ تم اپنے آپ کو اہلِ کتاب سمجھتے ہو اور عیسائی بھی اہل کتاب ہیں، تم نے

دیکھ لیا کہ ہمارے (بت پرست) بھائی تمہارے (اہلِ کتاب) بھائیوں پر غالب آگئے ہیں، اور بخدا! ہم بھی تم پر ضرور غلبہ پائیں گے، مسلمان ایرانیوں کی ایک آتش پرست مملکت سے رومیوں کی مذہبی حکومت کی شکست سے بہت غمگین ورنجیدہ خاطر ہوئے، تب ان آیات کا نزول ہوا جس نے مسلمانوں کو تین سے نو سالوں کے درمیان تلکی مختصری مدت میں رومیوں کے ایرانیوں پر غالب آنے کی خوشخبری سنائی، حالانکہ اس بشارت کے وقت روم کا ایران پر غالب آنا ناقابل یقین تھا، کیونکہ رومی حکومت کو خونریز جنگوں نے کمزور و لاغر کر دیا تھا، یہاں تک کہ انہیں اپنے ملک کے اندر منہ کی کھانی پڑی تھی، نیز اسی طرح ایرانی حکومت ایک طاقتور اور مضبوط سلطنت تھی، پھر اس آخری فتح نے اس کی طاقت وقوت کو مزید بڑھا دیا تھا۔

تاہم جب یہ آیتِ مبارکہ نازل ہوئی تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک مشرک اُبی بن خلف سے نو سال کی مدت مقرر کر کے سو اونٹوں کی شرط لگالی، ابھی یہ مدت گزری نہ تھی کہ روم وایران کے درمیان دوبارہ جنگ بھڑک اٹھی، بالآخر اس میں رومیوں کو فتح ہوئی اور ایرانی شکست کھا گئے، اور یوں قرآن کی پیشین گوئی پوری ہوگئی۔ یہ واقعہ ۶۲۲ عیسوی بمطابق ۲ ھجری میں پیش آیا، حضرت اَبوبکر رضی اللہ عنہ یہ شرط جیت گئے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (اس شرط کے ناجائز ہونے کی وجہ سے) حضرت اَبوبکر رضی اللہ عنہ کو ان اونٹوں کے صدقہ کرنے کا حکم دیا۔

اس آیتِ مبارکہ میں ایک دوسری پیشین گوئی بھی تھی کہ مسلمان رومیوں کے غالب آنے کے وقت میں قریبی مدد سے خوش ہوں گے: ﴿وَيَوْمَئِذٍ يَفْرَحُ الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللهِ﴾ ''اور اس روز مسلمان اللہ تعالیٰ کی اس امداد پر خوش ہوں گے''۔

اور اللہ تعالیٰ نے رومیوں کے فتح پانے کے اس وعدے کی طرح اپنا یہ وعدہ بھی سچ کر دکھلایا، لہٰذا مسلمانوں کو بدر میں اسی وقت کامیابی ہوئی جس وقت میں رومی فاتح بنے، اور اس طرح اللہ کے فضل سے ایک ہی وقت میں دو پیشین گوئیاں پوری ہوگئیں۔

علامہ زمخشری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''یہ آیت ان واضح آیتوں میں سے ایک ہے جو نبوت کی صحت اور قرآن کے اللہ کی طرف سے ہونے پر دلیل وشاہد ہیں، کیونکہ یہ اس علمِ غیب کی خبر ہے جسے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا''۔

ب- رسول کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کیمکہ میں امن واطمینان سے داخل ہونے کی پیشین گوئی

منقول ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے حدیبیہ کی طرف نکلنے سے پہلے سوتے میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اور آپ کے صحابہ مکہ میں بے خوف داخل ہوئے ہیں، اور انہوں نے سر منڈایا ہے اور بال بھی کترائے ہیں، آپ ﷺ نے یہ خواب اپنے صحابہ کو سنایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور مسرت کا اظہار کیا، اور صحابہ نے سمجھا کہ وہ سب اسی سال مکہ میں داخل ہوں گے اور کہنے لگے کہ بے شک رسول اللہ ﷺ کا خواب سچا ہے۔ چنانچہ جب صلح حدیبیہ کا موقع آیا تو یہ حضرات احرام کی حالت میں مدینہ سے نکل پڑے اور قربانی کے جانوروں کو مکہ کی طرف ہانکنے لگے، ان کا ارادہ جنگ کا نہیں تھا بلکہ ان کا مقصد صرف عمرہ اور قربانی کی ادائیگی تھی لیکن قریش نے انہیں روک لیا، اگر رسول اللہ ﷺ صلح کو ترجیح نہ دیتے اور امن عامہ کو پسند کرنے کی وجہ سے مشرکین کے ساتھ صلح پر راضی نہ ہوتے تو قریب تھا کہ مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ چھڑ جاتی۔ اس صلح کی شرائط میں سے یہ بھی تھا کہ آپ اور آپ کے ساتھی اس سال مدینہ واپس لوٹ جائیں گے اور آئندہ سال مکہ میں داخل ہوں گے، اس صلح کی وجہ سے منافقین کو ضعیف الایمان لوگوں کو ورغلانے اور طعن و تشنیع کا نشانہ بنانے کا موقع مل گیا یہاں تک کہ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی (لعنہ اللہ) بول اٹھا کہ اللہ کی قسم! ہم نے نہ تو سر منڈایا کیا، نہ بال کتروائے اور نہ ہی ہم مسجد حرام دیکھ سکے!!

لیکن آیت مبارکہ نازل ہوگئی جو تینوں یقینی وعدوں یعنی مکہ میں دخول، مناسک کی ادائیگی اور قریش سے بے خوفی کو لئے ہوئی تھی باوجود اس کے کہ قریش کی دھوکہ دہی، عہد شکنی، اور صلہ رحمی کی پاسداری نہ کرنا مشہور و معروف تھا، اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھلایا، معاملہ انجام پذیر ہوا اور بالآخر مؤمنین امن واطمینان کی حالت میں مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ اسی کے متعلق قرآن کریم کہتا ہے: ﴿لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ. لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ. مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ. لَا تَخَافُوْنَ. فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا﴾

(الفتح: ۲۷)

ترجمہ: ''بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا جو مطابق واقع کے ہے کہ تم لوگ مسجد حرام (یعنی مکہ) میں انشاء اللہ ضرور جاؤ گے امن وامان کے ساتھ کہ تم کوئی سر منڈاتا ہوگا، اور کوئی بال کتراتا ہوگا، تم کو کسی طرح کا اندیشہ نہ ہوگا، سو اللہ تعالیٰ کو وہ باتیں معلوم ہیں جو تم کو معلوم نہیں، پھر اس سے پہلے ایک فتح دے دی''۔

ج- جنگ سے پہلے قرآن کریم کا مشرکین کی شکست کی پیشین گوئی کرنا

یہ پیشین گوئی سورۂ قمر میں اس فرمان الٰہی کے اندر ہے: ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ﴾ (القمر: ۴۴-۴۶)

ترجمہ: ''یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہماری ایسی جماعت ہے جو غالب ہی رہے گی، عنقریب (ان کی) یہ جماعت شکست کھائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، بلکہ قیامت ان کا (اصل) وعدہ ہے اور قیامت بڑی سخت اور ناگوار چیز ہے''۔

سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی جبکہ جہاد دوسری ہجری میں شروع ہوا تو ان حالات میں جنگ کا تصور کیسے ممکن تھا؟ اور کس کے دل میں یہ بات آسکتی تھی کہ مشرکین کی جماعت شکست سے دوچار ہوگی؟ اور مسلمان تعداد اور سامان حرب کی قلت کے باوجود ان پر فتح پائیں گے؟ لیکن یہ اللہ کا وعدہ تھا جس میں تبدیلی نہیں ہوسکتی تھی۔

حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ وہ کونسا لشکر ہے جو عنقریب شکست کھائے گا؟ لیکن غزوۂ بدر کے موقعہ پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زرہ میں لپکتے اور یہ آیت: ﴿سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ﴾ پڑھتے دیکھا تو اس آیت کی تفسیر سمجھ میں آگئی۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ اس آیت کے نزول اور جنگ بدر کے وقوع کے درمیان سات سال کا عرصہ تھا۔

د- قرآن کا اس تاریک مستقبل کی پیشگی خبر دینا جو کفار قریش کا منتظر تھا

یہ خبر سورۂ دخان میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں موجود ہے: ﴿فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِينٍ ﴿١٠﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ۖ هٰذَا عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿١١﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢﴾ أَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٣﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ﴿١٤﴾ إِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا إِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ﴿١٥﴾ يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ إِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ﴾ (الدخان: ۱۰۔۱۶)

ترجمہ: ''سو آپ (ان کے لیے) اس روز کا انتظار کیجئے کہ آسمان کی طرف ایک نظر آنے والا دھواں پیدا ہو جو ان سب لوگوں پر عام ہو جائے، یہ (بھی) ایک دردناک سزا ہے، اے ہمارے رب! ہم سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے ہم ضرور ایمان لے آویں گے۔ ان کو (اس سے) کب نصیحت ہوتی ہے حالانکہ (اس کے قبل) ان کے پاس ظاہر شان کا پیغمبر آیا، پھر بھی یہ لوگ اس سے سرتابی کرتے رہے اور یہی کہتے رہے کہ (کسی دوسرے بشر کا) سکھلایا ہوا دیوانہ ہے، ہم چندے اس عذاب کو ہٹا دیں گے تم پھر اپنی اسی حالت پر آجاؤ گے، جس روز ہم بڑی سخت پکڑ پکڑیں گے (اس روز) ہم (پورا) بدلہ لیں گے''۔

ان آیات کریمہ کا شانِ نزول: جب باشندگانِ مکہ نے آنحضرت ﷺ کی تکذیب اور نافرمانی کی اور آپ ﷺ سے بغاوت پر کمر باندھ لی تو آپ ﷺ نے ان کیلئے بددعا کی اور فرمایا: ''أللهم أعنّي عليهم بسبعٍ كسبعِ يوسف'' ''یا اللہ آپ ان کے خلاف یوسف علیہ السلام کی سات سالہ قحط سالی کی طرح قحط سالی کے ذریعے میری مدد فرمائیں''۔

چنانچہ وہ ایسے قحط میں مبتلا ہوئے جس نے ہر چیز کو مٹا کر رکھ دیا یہاں تک مشرکین بھوک کی شدت کی وجہ سے چمڑے اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے، ان میں سے کوئی ایک اگر آسمان کی طرف نظر اٹھاتا تو دھویں کی شکل دکھائی دیتی، ابوسفیان آپ ﷺ کے پاس آئے اور کہا: اے محمد! آپ تو اللہ کی بندگی، اور صلہ رحمی کا حکم لیکر آئے ہیں جبکہ آپ کی قوم ہلاک ہو رہی ہے، آپ اللہ سے ان کیلئے دعا کریں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان آیاتِ مبارکہ کو نازل کیا۔

علامہ زرقانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں غور و فکر کرنے سے پانچ پیشن

گوئیاں معلوم ہوتی ہیں:

۱-اس قحط اور بھوک کی خبر دینا جو مشرکین کا احاطہ کرلیگی یہاں تک کہ آدمی کو اپنے اور آسمان کے درمیان دھویں کی شکل دکھائی دے گی۔

۲-اس بحران ومصیبت کے ان پر آنے کے وقت اُن کے اللہ کے سامنے گڑگڑانے کی خبر دینا۔

۳-اللہ تعالیٰ کا ان سے کچھ مدت کیلئے عذاب کو دور کرنے کی اطلاع دینا۔

۴-مشرکین کا اپنے کفر ونافرمانی کی جانب دوبارہ لوٹ جانے کا بتانا۔

۵-اللہ تعالیٰ کا مشرکین سے پکڑ کے دن یعنی جنگ بدر کے دن انتقام لینے کی خبر دینا۔

پھر آگے فرماتے ہیں کہ اللہ نے ان سب پیشین گوئیوں کو سچ کر دکھلایا، کوئی ایک پیشین گوئی بھی غلط نہ ہوئی، چنانچہ وہ قحط سالی کا شکار ہوئے یہاں تک انہیں ہڈیاں بھی کھانا پڑیں، اور کوئی شخص اگر آسمان کی طرف دیکھتا تو اسے بھوک اور تکلیف کی شدت کی وجہ سے اپنے اور آسمان کے درمیان دھویں کی مانند دکھائی دیتا، پھر وہ عجز وانکساری کے ساتھ پکارنے لگے: ﴿رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ إِنَّا مُؤْمِنُونَ﴾ ''اے ہمارے رب! ہم سے اس مصیبت کو دور کر دیجئے''۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان سے کچھ مدت تک کیلئے عذاب کو ہٹادیا تو دوبارہ وہ اپنے کفر ونافرمانی میں منہمک ہو گئے، لہٰذا اللہ نے ان سے بدر کے دن انتقام لیا، پھر اللہ نے ان کی بڑی سخت پکڑ کی کہ ان میں سے ستر قتل ہوئے اور ستر گرفتار ہوئے اور ان کے مقابلے میں مسلمانوں کی مدد کی گئی۔

آپ کا کیا خیال ہے کہ مخلوق میں سے کسی فرد سے اس جیسے تمام کاموں کا صدور ممکن ہے؟ نہیں ہرگز نہیں! یہ تو غلبہ وحکمت والے اللہ ہی کی شان ہے۔

ھ-اسلام کے تمام ادیان ومذاہب پر غالب آنے کی پیشین گوئی کرنا

یہ خبر اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں موجود ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ۙ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ (التوبۃ: ۳۳)

ترجمہ: ''چنانچہ وہ اللہ ایسا ہے جس نے (اس اتمام نور کیلئے) اپنے رسول کو ہدایت (کا سامان یعنی قرآن) اور سچا دین (یعنی اسلام) دیکر بھیجا ہے، تاکہ

اس (دین) کو تمام (بقیہ) دینوں پر غالب کردے (کہ یہی اتمام ہے) گو مشرک کیسے ہی ناخوش ہوں"۔

☆- اور اسی طرح عنقریب مسلمانوں کو حاصل ہونے والے ایک کھکھلاتے مستقبل کی خبر دینا

یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان میں مذکور ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۠ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا﴾ (النور: ۵۵)

ترجمہ: "(اے مجموعۂ امت) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا اُن سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) اُن کے لئے پسند فرمایا ہے (یعنی اسلام) اُس کو اُن کے (نفعِ آخرت کے) لئے قوت دیگا اور اُن کے اس خوف کے بعد اس کو مُبدَّل اُمن کردے گا"۔

اور یہ وعدۂ الٰہی بھی پورا ہوا، سو اللہ تعالیٰ نے اسلام کو تمام ادیان پر غالب اور مسلمانوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہی میں زمین پر حکومت عطا فرمائی یہاں تک کہ تمام ممالک عربیہ پر حکومت کرنے لگے اور بلادِ عرب میں کوئی بھی ایسا علاقہ نہ رہا جس نے مسلمانوں کی فرمانبرداری میں سر تسلیم خم نہ کرلیا ہو، جس نے اسلام قبول نہ کیا تو وہ مسلمانوں کا ذمی بن کر رہنے لگا، اُن کے اقتدار کے آگے سرنگوں ہوگیا، اور انہیں جزیہ دینے لگا۔

پھر آپ ﷺ کے دنیا سے رحلت فرمانے کے بعد آپ ﷺ کے صحابہ قیصر و کسریٰ کی سلطنتوں کی طرف چل پڑے، اور ایرانیوں، اور رومیوں کی سلطنتوں کو تخت و تاراج کردیا اور ایک صدی بھی نہ گزری تھی کہ اسلامی سلطنت کا رقبہ وسیع تر ہوگیا، چنانچہ یہ مغرب میں بحرِ ظلمات (بحرِ اوقیانوس) سے لیکر مشرق میں چین کی سرحدوں تک پھیل گیا، اور اسی سلطنتِ اسلامیہ کی توسیع کے ساتھ مبارک وعدہ کی تکمیل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ

پورا ہو کر رہتا ہے۔

اور مذکورہ بالا یہ تمام اور ان جیسی کثیر مثالیں قرآن میں موجود ہیں جن میں مستقبل کے بارے میں پیشگی خبریں ہیں جو سب کی سب سچ ثابت ہوئیں، اور یہ چونکہ ایک خارقِ عادت اُمر ہے، لہٰذا یہ بھی وجوہِ اعجاز میں سے ایک وجہ ہوگی، کیونکہ ان جیسی خبریں کا صحیح واقع ہونا اللہ رب العزت کی طرف سے بتانے سے ہی ممکن ہے۔

اور ہم سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہونا چاہئے کہ قرآن کریم میں وارد ہونے والے تمام قصے ''اِخبارعن غیوب الماضی'' یعنی گزشتہ زمانے کی غیبی خبروں کی قبیل سے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے اپنے پیارے رسول کو اطلاع دی، جبکہ آپ ﷺ ان سے ناواقف تھے اور اسی (آپ ﷺ کے واقف نہ ہونے کی) وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کے قصہ کے بعد اس آیت مبارکہ کو ذکر کیا ہے، ارشادِ پاک ہے: ﴿تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا إِلَيْكَ. مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هٰذَا. فَاصْبِرْ. إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ﴾ (هود:۴۹)

ترجمہ: ''یہ قصہ منجملہ اخبارِ غیب کے ہے جس کو ہم وحی کے ذریعے سے آپ کو پہنچاتے ہیں، اس کو اس کے قبل نہ آپ جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، سو صبر کیجئے یقیناً نیک انجامی متقیوں ہی کے لیے ہے''۔

اور وہ قصے کس قدر عمدہ ہیں جو خاتم المرسلین ﷺ پر نازل فرمائے گئے تاکہ وہ آپ کے قلب مبارک کے لئے مضبوطی اور مومنوں کیلئے نصیحت کا باعث ہوں؟! یہ قصے قرآن کے رب العالمین کی طرف سے نازل ہونے پر بہت بڑی دلیل ہیں، کیا ہی قرآن کریم کی عالی شان حکمت ہے؟! اور کس قدر اس کے بلند پایہ معجزے ہیں؟!۔

اعجازِ قرآن کی چھٹی وجہ: جدید عصری علوم کے ساتھ قرآن کا عدمِ تعارض:

اعجازِ قرآن کی ایک وجہ بعض کائناتی علوم کی طرف وہ دقیق اشارے ہیں جن کی طرف قرآن نے جدید سائنس کے انکشاف سے بہت پہلے سبقت فرمائی ہے، پھر قرآن کا اُن جدید سائنسی نظریات سے تعارض بھی نہیں جن کا سائنس نے انکشاف کیا ہے۔ قرآن کریم نے اعجاز کے پہلوؤں میں اس پہلو کی طرف اس ارشادِ خداوندی میں اشارہ فرمایا ہے:

﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنْفُسِهِمْ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ أَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ أَنَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ﴾ (فصلت: ۵۳)

ترجمہ: ''ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد ونواح میں بھی دکھادیں گے اور خود انکی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے (تو) کیا آپ کے رب کی یہ بات (آپ کی حقیقت کے لیے) کافی نہیں کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے''۔

نیز ہمارا یہ اعتقاد بھی ہے کہ قرآن پاک کوئی فزیکل سائنس، ریاضی یا فزیالوجی کی کوئی کتاب نہیں بلکہ وہ تو صرف ''ہدایت وارشاد'' اور ''تشریع واصلاح'' کی کتاب ہے، لیکن اس کے باوجود قرآنی آیات اُن بعض سائنسی، طبی اور جغرافیائی مسائل کی طرف باریک اشاروں اور مخفی حقائق سے خالی نہیں ہیں جو قرآن کے اعجاز اور اس کے وحیٔ الٰہی ہونے پر دلالت کرتے ہیں، پس یہ بات یقینی ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ناخواندہ تھے، لکھنا پڑھنا نہ جانتے تھے، اور آپ ﷺ نے تہذیب وتمدن کے مظاہر سے کوسوں دور ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں علوم ومعارف تھے اور نہ ہی ایسے مدارس جن میں کائناتی وآفاقی علوم پڑھائے جاتے ہوں، کیونکہ آپ ﷺ کی قوم اور قبیلہ سب کے سب ناخواندہ لوگ تھے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ سائنسی نظریات جن کی جانب قرآن نے اشارہ فرمایا ہے انہیں عہد نبوی میں کوئی نہ جانتا تھا، سائنس نے بھی اس کے رازوں سے پردہ کچھ عرصہ قبل ہی ہٹایا ہے، یہ سب سے زیادہ سچی دلیل ہے کہ یہ قرآن محمد ﷺ کی تالیف نہیں ہے جیسا کہ بعض مستشرقین کی رائے ہے، بلکہ وہ اللہ کی جانب سے ایک وحی ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے عربی زبان میں سید الأنبیاء حضرت محمد ﷺ کے سینۂ اُطہر پر اتارا ہے۔

پروفیسر عفیف طبارہ نے اپنی کتاب ''روح الدین الاسلامی'' میں اس موضوع سے متعلق عمدہ بحث فرمائی ہے، انہوں نے اِن بعض دقیق علمی حقائق کو بھی بیان کیا ہے [1]، ہم ان میں سے چند ایک کو مختصر طور پر کچھ تصرف کے ساتھ نقل کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید میں مذکور سائنسی انکشافات کی بحث سے پہلے ہم اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم نہ تو سائنسی تحقیقات قدیمہ یا جدیدہ کی طرف دعوت دیتا ہے اور نہ ہی ان کی مخالفت کرتا ہے، تاہم اس بات =

....

= سے بھی انکار ممکن نہیں کہ قرآن کریم نے بہت سے ایسے علمی، تاریخی، طبی اور فلکیاتی حقائق کی نشاندہی فرمائی ہے جو نزول قرآن کے زمانے میں نامعلوم اور خارج از مشاہدہ تھے، لیکن علم جدید نے اب جاکر ان کی نقاب کشائی کردی ہے، اور سائنسی کرشموں کا یہ فائدہ ہوا ہے کہ جسے انسان کی ناقص عقل پہلے اگر مستبعد یا محال سمجھتی تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان پر حجت تمام کردی ہے اور اس کے امکان کو ثابت کردیا ہے، اس کے علاوہ قرآن کریم کے اجمالی بیانات و اشارات کی جدید تحقیقات واکتشافات کے ساتھ تطبیق انتہائی نازک اور پرخطر کام ہے، کیونکہ یہ بات عین ممکن ہے کہ جو تحقیق آج بدیہی سمجھی جارہی ہے کل کو وہ مجروح یا ساقط شمار ہونے لگے یا بالکل بدل جائے، جس کا تجربہ آئے دن ہوتا رہتا ہے، لہٰذا موجودہ سائنسی تحقیقات کو عین منشأ قرآنی سمجھنا اور ان مسائل پر تفسیر قرآن کی بنیاد رکھنا درست نہیں، پھر سائنسی تحقیق سے مرعوب ہوکر یہ دعوی کرنا کہ چودہ صدیوں تک امت اس صحیح معنی کو نہ سمجھ سکی اور اب اس کی حقیقت آشکارا ہوئی ہے، بہت ہی عجیب بات ہے، البتہ اسے بنیادی تفسیر سمجھے بغیر احتمال کے درجہ میں بیان کیا جاسکتا ہے جبکہ وہ لغتِ عربیہ اور قواعدِ شرعیہ کے مخالف نہ ہو، بعض قدیم مفسرین سے بھی اس سلسلہ میں لغزش ہوئی ہے کہ انہوں نے قدیم فلسفہ کے نظریات کو دیکھتے ہوئے کسی آیت کی تاویل کی، لیکن آگے آکر تحقیقات اس کے بالکل برعکس نکل آئیں، جس سے لوگوں کے اعتقاد ڈگمگانے لگے، جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اسلام اور قرآن سے ان نظریات کا کوئی تعلق نہ تھا، اسی طرح آج کے بعض مفسرین جن آیات کو جدید سائنس کے نظریات کے مخالف یا اس سے لاتعلق دیکھتے ہیں تو ان میں تاویلات کرکے اس کے مطابق بنانے کی فکر میں لگ جاتے ہیں، جبکہ یہ طرز و اسلوب درست نہیں اور سلفِ صالحین کے طریقہ کے خلاف ہے۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''آج کل لوگوں نے قرآن کے مَاوُضِعَ لَہٗ کو بالکل نہیں سمجھا، قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن کا موضوع نہیں ہیں پھر جب کوئی فلسفہ کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھونس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے تیرہ سو برس پہلے ہی اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے، قرآن کریم ایک ہی قانون کی کتاب ہے، سائنس وغیرہ کا ذکر اگر اس میں آئے گا تو مقصود کے تابع ہوکر آئے گا، چنانچہ سائنس کے متعلق جو گفتگو ہوگی محض اس قدر کہ سب مصنوعات ہیں اور ہر مصنوع کے لیے ایک صانع کی ضرورت ہے، لہٰذا ان کے لیے بھی کسی صانع کی ضرورت ہے، مگر استدلال کے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے کہ اس چیز کی حقیقت بھی دریافت ہوجائے، بلکہ مجملاً ان کا علم ہونا کافی ہے'' (مقدمہ بیان القرآن)۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ قرآنی تحقیقات دو طرح کی ہیں: ایک تو وہ ہیں جن کی قرآن نے خبر دی ہے اور سائنس=

....

☆☆......☆☆
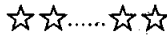
= نے ان دور از نظر و فکر اکتشافات کو آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا ہے، اور علم الیقین کو عین الیقین میں بدل دیا ہے، اور جنہیں اگر بالفرض اطمینان قلب حاصل نہ تھا انہیں بھی ان انکشافات نے ورطہ حیرت میں ڈال دیا ہے، لیکن دوسری تحقیقات جدیدہ وہ ہیں جن کے بارے میں قرآن نے کوئی واضح خبر نہیں دی، ہاں! کائنات اور اس کی تخلیق سے متعلق اجمالی اشارات موجود ہیں، تو ان اشارات و ابہامات کی توضیح و تفصیل جدید سائنسی حقائق کے مطابق کرنے کی کوشش کرنا بہت ہی نازک گھاٹی ہے، جس کا آسانی و سلامتی سے عبور کرنا انتہائی مشکل ہے۔

بہر حال قرآن حکیم نے تحقیقاتِ کائنات سے متعلق جو بھی تفصیل بیان کی ہے وہ اپنی جگہ بالکل اٹل ہے، خواہ اس سے قدیم نظریۂ ہیئت پر زد پڑے یا جدید تحقیقات کی تردید ہو، اور چاہے قدیم فلسفہ اس کے مطابق ہو یا جدید اکتشافات اس کی تائید کریں، لیکن یہ کسی بھی طرح مناسب نہیں کہ ہم قرآن کو سائنسی کتاب سمجھ بیٹھیں اور ہر جدید تحقیق کو قرآن سے ثابت کرنے کی لاحاصل کوشش میں اپنا وقت برباد کریں۔

قرآن کریم اگر ان حقائق کونیہ کو طرف کبھی کبھی اشارہ کرتا ہے تو اس کا مقصد تذکیر و موعظت ہے کہ انسان ان آثارِ عجیبہ کو دیکھ کر مؤثرِ حقیقی کے وجود و توحید اور اس کی بے مثال قدرت و علم کا یقین کر لیں، اور ثانوی درجہ میں یہ بھی مقصود ہے کہ وہ اپنی عقل و شعور سے کام لے کر دنیوی منافع حاصل کرے، لیکن ان اسرار و رموز کو جو درحقیقت ایمان و معرفت کا وسیلہ ہیں حیاتِ انسانی کا مقصدِ وحید بنا لینا اور اصل مقصد کو نظر انداز کر کے وسیلہ ہی کو مقصدی حیثیت دے دینا نہ انسان کے لیے مفید ہے اور نہ ہی اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔

دسویں فصل

قرآن کریم کے سائنسی معجزات

ا- کائنات کی وحدت: جدید علمی (سائنٹفک) نظریات میں سب سے زیادہ واضح نظریہ یہ کہہ رہا ہے کہ: ''زمین شمسی مجموعہ کا ایک حصہ تھی، پھر وہ سورج سے جدا ہو کر ٹھنڈی پڑ گئی، اور انسان کے رہنے کے قابل ہو گئی۔ سائنس دان اس نظریہ کی صداقت پر زمین کی تہہ میں موجود آتش فشاں چٹانوں اور آتش گیر مادوں کی موجودگی، اور زمین کے وقتاً فوقتاً اس سلگتے ہوئے آتش فشاں لاوے کے اگلنے کے ذریعے استدلال کرتے ہیں۔

یہ نظریہ اس بات کے موافق ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس فرمانِ الٰہی میں اشارہ کیا ہے: ﴿اولم یر...﴾

ترجمہ: ''کیا ان کافروں کو یہ معلوم نہیں ہوا کہ آسمان اور زمین (پہلے) بند تھے پھر ہم نے ان دونوں کو (اپنی قدرت سے) کھول دیا۔ اور ہم نے (بارش کے) پانی سے ہر جاندار چیز کو بنایا ہے کیا (ان باتوں کے منکر) پھر بھی ایمان نہیں لاتے''۔

پروفیسر عفیف طبارہ کہتے ہیں کہ یہ معجزہ قرآن کے ان معجزات میں سے ایک ہے جس کی تائید جدید سائنس کر رہی ہے، اس کا اعلان ہے کہ یہ کائنات ابتداء میں گیس سے ملی ہوئی ایک چیز تھی، پھر یہ کئی اجرام سماویہ میں تقسیم ہو گئی، اور ہمارا نظام شمسی انہی تقسیمات کا نتیجہ ہے۔

اور رہا اس آیت کا دوسرا حصہ یعنی: ﴿وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ﴾ تو وہ اس سائنسی تحقیق کی تقریر و اثبات میں وارد ہونے والی آیات میں سب سے زیادہ بلیغ ہے جس کے راز کو سائنسدانوں نے پا لیا ہے۔ چنانچہ کیمیائی ورک کا ایک بڑا حصہ پانی کا محتاج ہوتا ہے، اور پانی پوری کائنات و نباتات کی زندگی کے دوام و بقا کے لیے بنیادی عنصر ہے،

اور پانی کی اس کے علاوہ دیگر بھی ایسی خصوصیات ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ خالق کائنات نے پانی کو ایسے اجزاء سے بنایا ہے جو اس کی مخلوق کے لیے فائدہ مند ہیں۔

پانی کا درجہ حرارت جب کم ہوتا ہے تو یہ آکسیجن کی ایک بہت بڑی مقدار اپنے اندر جذب کر لیتا ہے، اور جس وقت یہ منجمد ہو جاتا ہے تو حرارت کی ایک بڑی مقدار اس سے خارج ہوتی ہے جو سمندر میں رہنے والی مختلف جاندار مخلوقات کی زندگی میں مدد دیتی ہے جیسے مچھلیاں وغیرہ، قرآن کی حکمت کس قدر انوکھی اور عجیب ہے جو واضح الفاظ کے ساتھ زندگی کے راز کو بیان کر رہی ہے!!''۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ انہوں نے اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں فرمایا: ''کہ آسمان پہلے بند تھا کہ بارش نہ برساتا تھا، اور زمین بند تھی کہ نباتات نہ اگاتی تھی، پس جب اللہ نے زمین کے باشندوں کو پیدا فرمایا تو آسمان کو بارش برسانے اور زمین کو نباتات اگانے کے ذریعے کھول دیا''۔

میں کہتا ہوں کہ یہ تفسیر بڑی عمدہ اور اچھی ہے جو کہ استعارہ کی قبیل سے ہے، متقدمین مفسرین کی بھی یہی رائے ہے، لیکن یہ بات اس سے مانع نہیں کہ قرآن میں بعض ایسی بہترین علمی باتیں پائی جائیں جن کا جدید سائنسی علم نے ابھی انکشاف کیا ہو، پس قرآن کی کئی آیات بہت سی وجوہ کا احتمال رکھتی ہیں، اور قرآن کے اسرار و رموز سمجھنے میں یہاں کوئی زبردستی نہیں، بہت مرتبہ ایسا ہوا ہے کہ متاخرین نے اس بات کو سمجھ لیا ہے جس تک متقدمین کی فہم کی رسائی نہیں ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ﴾

ترجمہ: ''ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گرد و نواح میں بھی دکھادیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی، یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے''۔

اور شاید کہ یہ آیت بھی ان آیات میں سے ایک ہو جن کی تفسیر پر اللہ تعالیٰ نے ان جدید علوم والوں کو بیسویں صدی میں مطلع فرمالیا ہو!

۲۔ تخلیق کائنات: مشہور عالم فلکیات جینز کا کہنا ہے کہ کائنات کا مادہ ابتدا میں فضا میں

ترتیب کے ساتھ پھیلے ہوئے ایک گیس کی شکل میں تھا، اور ان کہکشاؤں یعنی اجرام سماویہ کی تخلیق بھی اسی گیس کے گاڑھے (سیال مادہ کی شکل میں تبدیل) ہوجانے کا نتیجہ ہے۔

اور ڈاکٹر جاموکہتے ہیں کہ یہ کائنات اپنی ابتدائے آفرینش میں ایک خاص مرتب اور منظم گیس سے پر تھی، اور اسی سے تمام نظام وجود میں آیا۔

اس نظریہ کی تائید ہم قرآن میں بھی پاتے ہیں۔اور اگر قرآن اس کی خبر نہ دیتا تو ہمارے لیے اس نظریہ کا سمجھنا مستبعد و محال ہوتا۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿ثم استوی...﴾

ترجمہ: ''پھر آسمان (کے بنانے) کی طرف توجہ فرمائی، اور وہ (اس وقت) دھواں سا تھا، سو اس سے اور زمین سے فرمایا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ یا زبردستی سے، تو دونوں نے کہا ہم خوشی سے حاضر ہیں''۔

چنانچہ قرآن نے اس کائنات کی تخلیق کے منبع کی دھویں کے ساتھ منظر کشی کی ہے، اور اس کو عرب محسوس اشیاء میں سے گردانتے تھے، آیا چودہ صدیاں قبل ایسے وقت میں جب کہ لوگ اس کائنات اور اس کے مخفی رازوں کو نہ جانتے ہوں کسی امی (ناخواندہ) شخص کے بس میں ان حقائق کا ادراک کرنا ممکن تھا؟!

۳-ایٹم کی تقسیم: انیسویں صدی عیسوی تک یہ اعتقاد و نظریہ چھایا رہا کہ ایٹم ہی وہ سب سے چھوٹا جزء ہے جس کا کسی عنصر میں پایا جانا ممکن ہے، نیز وہ ناقابل تجزی ہے کیوں کہ وہ ایسا جزء ہے جس کی تقسیم ممکن نہیں، اور اس نظریہ پر کئی صدیاں بیت گئیں، اور گزشتہ دسیوں سالوں سے سائنسدانوں نے اپنی دلچسپیوں اور توجہات کو ایٹم کے پیچیدہ مسئلہ کی طرف موڑا تو ان کیلئے اس کی تجزی و تقسیم ممکن بن گئی، اور انہیں علم ہوا کہ ایٹم ان ذیلی باریک اجزاء پر مشتمل ہے: (۱) پروٹان۔ (۲) نیوٹران۔ (۳) الیکٹران۔

اور اسی تقسیم کی وجہ سے ان کیلئے ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنانا ممکن ہوا، اور جب بموں کا بے دریغ استعمال ہوتو ہم قیامت کی اس گھڑی سے اور شیطان مردود کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرتے ہیں!

آپ اللہ کے اس ارشاد کی طرف غور کریں کہ وہ ایٹم کی خبر دے رہا ہے: ﴿وما

یعزب...﴾

ترجمہ:''رب (کے علم) سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں، نہ زمین میں اور نہ آسمان میں (بلکہ سب اس کے علم میں حاضر ہیں) اور نہ کوئی چیز اس (مقدار مذکور) سے چھوٹی ہے اور نہ کوئی چیز (اس سے) بڑی ہے مگر یہ سب (بوجہ علم الٰہی کے احاطہ کے) کتاب مبین (یعنی لوح محفوظ میں مرقوم) ہے''۔

چنانچہ آیت قرآنی میں ﴿**اصغر**﴾ کا لفظ ایٹم کی تقسیم کے امکان پر نہایت واضح تصریح ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فرمان: ﴿**ولا فی السماء**﴾ میں اس بات کی وضاحت ہے کہ زمینی ایٹموں کے خواص بعینہ سورج، ستاروں اور سیاروں میں موجود ایٹموں کے خواص ہیں، تو کیا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایٹم کے خواص کو (کسی سائنسدان یا ماہر فلکیات سے) پڑھا تھا کہ ان کیلئے ایٹم کی تقسیم اور زمین و آسمان میں اسکے خواص کو جاننا ممکن ہوا؟! بے شک یہ قرآن کے وحی الٰہی ہونے پر مضبوط دلیل ہے۔

۴- آکسیجن کی کمی: پرواز کی ایجاد کے بعد سائنسدانوں کے سامنے یہ بدیہی سائنسی بات آشکارا ہوئی کہ فضا کے بالائی طبقات میں آکسیجن کی کمی ہے، چنانچہ جب بھی انسان آسمان کی فضاؤں میں محوِ پرواز ہوا، اور بلندی پر گیا، تو جوں جوں اس نے فضائی کیفیت کا ادراک کیا، اور اسے اس وقت سینہ کی تنگی، اور سانس کی گھٹن کا احساس ہوا، یہاں تک اسے اپنا گلا گھٹتا محسوس ہوتا، اسی وجہ سے پائلٹ حضرات اور جہاز کا عملہ مسافروں کو ہدایات دیتا ہے کہ جب جہاز سواریوں کو ۳۵ ہزار فٹ کی بلندیوں سے بھی اونچائی میں لے جائے تو وہ مصنوعی آکسیجن لگا لیں، جبکہ قرآن کریم نے پرواز کی ایجاد اور چودہ صدیاں قبل اس سائنسی مظہر کی جانب رہنمائی کر لی تھی، آپ اللہ کے اس ارشاد میں غور کریں: ﴿فمن یرد......﴾

ترجمہ:''سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستہ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو اسلام کیلئے کشادہ کر دیتے ہیں، اور جس کو بے راہ رکھنا چاہتے ہیں اس کے سینہ کو تنگ بہت تنگ کر دیتے ہیں، جیسے کوئی آسمان پر چڑھتا ہے''۔

اور مفسرین میں سے حضرات متقدمین اس آیت کی تفسیر انہی مفاہیم و معانی کے ذریعے سے کیا کرتے جو ان کے دور کے موافق تھے، چنانچہ وہ: ﴿**کانما یصعد فی**

السماء﴾ کی تفسیر ان الفاظ سے کیا کرتے تھے: ''یعنی گمراہ شخص کی مثال ایسی ہے جیسا کہ کوئی شخص آسمان پر چڑھنے کا ارادہ کرے، جبکہ یہ اس کے بس میں نہیں ہے، یا کوئی غیر ممکن کام کے کرنے کا عزم کرے''۔

اور پھر یہ نیا دور آیا تو اس نے قرآن کے معجزات کو ہویدا، اور سائنسی حقیقیت کی آیت قرآنی کے ساتھ بہترین ہم آہنگی کو ریکارڈ کرلیا، لہٰذا یہ سائنسی حقیقت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کی مؤید ہے۔ بخدا! کیا ہی اس قرآن کی عظمت شان اور رفعت مقام ہے؟!

۵-ہر شے میں جوڑے کا وجود: پہلے لوگوں کا خیال تھا کہ زوجیت (یعنی نر اور مادہ) دو ہی نوعوں (یعنی انسان وحیوان) کے درمیان ہی عام اور شائع ہے۔ لیکن جدید سائنس نے آکر ثابت کر دیا کہ زوجیت نباتات، جمادات، اور عالم کون وجود کے ہر ہر ذرہ میں پائی جاتی ہے، یہاں تک کہ بجلی میں بھی پائی جاتی ہے، چنانچہ اس میں مثبت (positive) اور منفی (Negative) کا وجود ہے۔ یہ ایک تار ہے کہ جس میں چارج شدہ بجلی مثبت ہے اور ایک وہ تار ہے جس میں چارج شدہ بجلی منفی ہے، یہاں تک کہ ذرہ میں بھی پروٹان اور نیوٹران کا تحقق ہے، اور ان دونوں میں سے ہر ایک نر اور مادہ کے مثل ہے۔ جبکہ اس انکشاف سے پہلے ہی قرآن نے متعدد آیات مبارکہ میں اسے بیان کرلیا تھا، آپ ان عظیم الشان دلائل کی طرف ذرا غور کریں۔

(الف) ﴿ومن کل ...﴾

ترجمہ: ''اور ہم نے ہر چیز کو دو دو قسم بنایا تا کہ تم (ان مصنوعات سے توحید کو) سمجھو''۔ اور یہاں پر عموم ﴿ومن کل شیئ﴾ سے بخوبی واضح ہے۔

(ب) ﴿اولم یروا...﴾

ترجمہ: ''کیا انہوں نے زمین کو نہیں دیکھا کہ اس میں کس قدر عمدہ عمدہ قسم کی بوٹیاں اگائی ہیں''۔ یہاں نباتات کی طرف اشارہ ہے۔

(ج) ﴿سبحان...﴾

ترجمہ: ''وہ پاک ذات ہے جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین

کے قبیل سے بھی اور (خود) ان آدمیوں میں سے بھی، اوران چیزوں میں سے بھی جن کو (عام لوگ) نہیں جانتے"۔

سواس آیت کریمہ نے زوجیت (نر اور مادہ) کونباتات، انسان، اور ہراس چیز میں عام کردیا جسے ہم جانتے ہیں یا نہیں جانتے، پاک ہے وہ ذات الٰہی جو قدیر وعلیم ہے اوراس کے علم نے تمام کائنات کا احاطہ کررکھا ہے، اور ہر چیز کو گن کر شمار کررکھا ہے۔

۶-رحم مادر میں بچہ کی جھلیاں اور پردے: یہ بات سائنسی طور پر ثابت ہوئی ہے کہ بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں تین پردوں میں گھرا ہوتا ہے، اور یہ پردے باریک خوردبینی تجزیہ کے سوا نظر نہیں آسکتے، جبکہ محض آنکھ سے ایک ہی پردہ دکھائی دیتا ہے، اوران تینوں پردوں کے نام یہ ہیں:

۱-ممبرین سیل، پہلی مادری شکمی دیوار۔

۲-رحمی دیوار۔

۳-غلاف جنین، جھلی۔

اور یہ وہ حقیقت ہے جسے جدید طب نے آشکارا کیا ہے، اور قرآن کریم بھی اس سائنسی حقیقت کی تائید میں وارد ہے، اور یہ بات سورۂ زمر میں اس فرمان الٰہی میں موجود ہے: ﴿یخلقکم...﴾

ترجمہ: "وہ تم کو ماؤں کے پیٹ میں ایک کیفیت کے بعد دوسری کیفیت پر بناتا ہے تین تاریکیوں میں، یہ ہے اللہ تمہارا رب، اسی کی سلطنت ہے"۔

چنانچہ اس آیت میں قرآن کا ایک علمی معجزہ نظر آتا ہے، اس میں قرآن نے اس بات کی خبر دی ہے کہ رحم مادر میں بچہ کے گرد تین پردے ہوتے ہیں جنہیں ﴿ظلمت﴾ سے تعبیر کیا ہے، کیوں کہ پردہ ایسا مانع اور رکاوٹ ہے جو بچے سے نور اور روشنی کو روکتا ہے، اور ظلمات جدید سائنس میں تین پردے ہیں۔

۷-ہواؤں کے ذریعے عمل بارآوری: جدید سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ ہوا کھجور، انجیر اور اس کے علاوہ دیگر پھل دار درختوں میں نر اعضاء کو مادہ اعضاء کی طرف منتقل کرتی ہے۔ لہٰذا یہ بارآوری ہواؤں کے ذریعے انجام پاتی ہے ا ہے۔ او۔ اسی سائنسی

پہلو کو قرآن نے اس ارشاد خداوندی میں بیان کیا ہے: ﴿وارسلنا...﴾

ترجمہ: ''اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے رہتے ہیں جو کہ بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں، پھر ہم ہی آسمان سے پانی برساتے ہیں۔ پھر وہ پانی تم کو پینے دیتے ہیں، اور تم اتنا پانی جمع کر کے نہ رکھ سکتے تھے''۔

۸- حیوان منوی: جدید طب نے یہ انکشاف کیا ہے کہ انسان کی منی کا یہ سیال مادہ چھوٹے چھوٹے حیوانات پر مشتمل ہے جنہیں ''حیواناتِ منویہ'' کہا جاتا ہے۔ اور ان کا دیکھنا محض آنکھ سے ممکن نہیں بلکہ یہ مائیکروسکوپ خوردبین سے ہی دکھائی دے سکتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر حیوان کا ایک سر، گردن اور دم ہوتی ہے، یہ اپنی شکل وصورت میں جونک کے مشابہ ہوتا ہے، اور اس حیوان کا ملاپ جب نطفے سے مادہ انڈہ کے ساتھ ہوتا ہے تو یہ اسے حاملہ بنا دیتا ہے، اور جب بارآوری کا یہ عمل پورا ہو جاتا ہے تو رحم کا منہ بند ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد کوئی چیز بھی رحم میں داخل نہیں ہوتی، البتہ باقی حیواناتِ منویہ مرجاتے ہیں۔ اور اسی سائنسی پہلو یعنی ''حیوان منویہ کا شکل وصوت میں جونک کے مشابہ ہونا'' کو بھی قرآن نے ثابت کیا ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی طرف توجہ دیں: ﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ﴾

ترجمہ: ''(اے پیغمبر ﷺ) آپ (پر جو قرآن نازل ہوا کریگا) اپنے رب نام لیکر پڑھا کیجئے (یعنی جب پڑھیے ''بسم اللہ الرحمن الرحیم'' کہہ کر پڑھا کیجئے) وہ جس نے (مخلوق کو) پیدا کیا، جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا''۔

چنانچہ یہ آیت قرآن کے معجزات میں سے ایک ایسے بلیغ معجزہ پر مشتمل ہے جس کا ظہور اس کے نزول کے وقت اور نہ ہی اس کے بعد کئی صدیوں تک ہو سکا، یہاں تک کہ مائیکروسکوپ خوردبین کی ایجاد ہوئی اور یوں معلوم ہوا کہ اللہ کی قدرت سے انسان کس طرح وجود میں آتا ہے۔

۹- انسان کی انگلیوں کے نشانات کا باہم اختلاف: گزشتہ صدی ۱۸۸۴ء میں انگلینڈ میں سرکاری طور پر فنگر پرنٹس کے ذریعے شخص کو پہچاننے کا طریقہ استعمال کیا گیا، اور پھر تمام ملکوں میں اس طریقہ کا رواج چل پڑا، اور یہ اس لیے ہوا کہ انسانی

انگلیوں کی کھال باریک لکیروں سے ڈھکی ہوتی ہے، اور یہ لکیریں مختلف اقسام کی ہوتی ہیں، کوئی لکیر کمانوں اور کڑیوں جیسی ہے تو کوئی پھرکیوں کی طرح۔ ان لکیروں میں پوری زندگی تبدیلی نہیں آتی، جبکہ بقیہ جسم کے تمام اعضاء ایک دوسرے کے متشابہ ہو سکتے ہیں، لیکن انگلیوں کی امتیازی خصوصیات ہیں؛ کیونکہ نہ تو وہ باہم یکساں ہوتی ہیں، اور نہ ہی قریب قریب۔ یہ ایک معجزہ الٰہیہ ہے۔ پس اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرنے کے بعد اٹھنے پر دلیل قائم کرنے میں انگلیوں کے پوروں کو کیوں اختیار کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿ایحسب...﴾

ترجمہ: ''کیا انسان خیال کرتا ہے کہ ہم اسکی ہڈیاں ہرگز جمع نہ کریں گے۔ ہم ضرور جمع کریں گے (اور یہ جمع کرنا ہم کو کچھ دشوار نہیں) کیوں کہ ہم اس پر قادر ہیں کہ اسکی انگلیوں کی پوریوں تک درست کر دیں''۔

اعجاز قرآن کی ساتویں وجہ: ایفائے عہد: اعجاز قرآن کی وجوہ میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ جس وعدہ کی بھی خبر دی گئی ہے اور جس بات کا بھی اللہ نے اپنے بندوں سے وعدہ کیا ہے اس کو پورا کیا جاتا ہے۔ اور اس وعدہ کی دو قسمیں ہیں: (الف) مطلق وعدہ (ب) مقید وعدہ

مطلق وعدہ: مطلق وعدے مثلاً اللہ تعالیٰ کا اپنے رسول کی مدد کا وعدہ، ان لوگوں کو نکالے جانے کا وعدہ جنہوں نے آپ علیہ السلام کو اپنے وطن سے نکالا، اور مؤمنین کو کفار کے مقابلہ میں فتح دینے کا وعدہ وغیرہ، یہ تمام وعدے پورے ہوئے۔ اگر آپ چاہیں تو اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی تلاوت فرمائیں: ﴿انا فتحنا...﴾

ترجمہ: ''بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی، تا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف کر دے۔ اور آپ پر اپنے احسانات کی تکمیل کر دے اور آپ کو سیدھے رستے پر لے چلے۔ اور اللہ تعالیٰ آپ کو ایسا غلبہ دے جس میں عزت ہی عزت ہو''۔

اور یہ نصرتِ موعودہ فتح مکہ اور لوگوں کے اسلام میں فوج درفوج داخل ہونے سے پوری ہوئی، اور اسی کے ساتھ سید الخلائق محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نعمتِ خداوندی کی بھی تکمیل ہوئی، اور اللہ تعالیٰ نے دشمنوں کے مقابلہ میں آپ علیہ السلام کی مدد کر کے آپ کی آنکھوں کو

ٹھنڈک بخشی: ﴿اذا جاء...﴾

ترجمہ: ''(اے محمد! ''صلی اللہ علیہ وسلم'') جب خدا کی مدد اور (مکہ کی) فتح (مع اپنے آثار کے) آپہنچے (یعنی واقع ہوجائے) اور (آثار جو اس پر متفرع ہونے والے ہیں یہ ہیں کہ) آپ لوگوں کو اللہ کے دین (یعنی اسلام) میں جوق در جوق داخل ہوتا ہوا دیکھ لیں، تو اپنے رب کی تسبیح وتحمید کیجئے اور اس سے استغفار کی درخواست کیجئے۔ وہ بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے''۔

اور اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء اور اولیاء کی نصرت کا یہ وعدہ بھی سچ کر دکھلایا: ﴿انا لننصر...﴾

ترجمہ: '' ہم اپنے پیغمبروں کو اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی مدد کرتے ہیں اور اس روز بھی جس میں گواہی دینے والے (یعنی فرشتے جو کہ اعمال نامے لکھتے ہیں) کھڑے ہوں گے''۔

اور مطلق وعدے میں سے ایک یہ ارشادِ خداوندی بھی ہے: ﴿وکان حقا علینا نصر المؤمنین﴾

ترجمہ: ''اور اہل ایمان کا غالب کرنا ہمارے ذمہ تھا''۔

چنانچہ متعدد مقامات مثلاً ''بدر و اُحد'' اور اس کے علاوہ بھی عظیم الشان معرکوں میں مومنین کی مدد ونصرت کی گئی جن کی تاریخِ اسلام شاہد وگواہ ہے۔ آپ اللہ کے اس ارشاد کو پڑھیں: ﴿ولقد...﴾

ترجمہ: ''اور یہ بات محقق ہے کہ حق تعالیٰ نے تم کو بدر میں منصور فرمایا حالانکہ تم بے سروسامان تھے، سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم شکرگذار رہو''۔

اور اس فرمان پر بھی نظر دوڑائیں: ﴿ولقد صدقکم...﴾

ترجمہ: ''اور یقیناً اللہ تعالیٰ نے تم سے اپنے وعدے کو سچا کر دکھلایا تھا جس وقت کہ تم کفار کو بحکم خداوندی قتل کر رہے تھے''۔

﴿تحسونھم﴾ کے معنی ہے: بے دریغ قتل کر رہے تھے۔ (حاشیہ میں)

اور مطلق وعدے میں سے ایک اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی ہے: ﴿وعد اللہ...﴾

ترجمہ: ''(اے مجموعۂ امت) تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں ان

سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو (اس اتباع کی برکت سے) زمین میں حکومت عطا فرمائے گا جیسا ان سے پہلے (اہل ہدایت) لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو (اللہ تعالیٰ نے) ان کے لیے پسند فرمایا ہے (یعنی اسلام) اس کو ان کے (نفع آخرت کے) لئے قوت دیگا اور ان کے اس خوف کے بعد اس کو مبدل بامن کر دے گا"۔

سو یہ وعدہ بھی پورا ہوا، اور مسلمان فتح یاب ہوئے، یہاں تک کہ انہوں نے مشرق ومغرب کو زیر کر لیا اور ان کے لشکر چلتے چلتے دنیا کے دور دراز علاقوں تک جا پہنچے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب کسی لشکر کو جہاد کے لیے روانہ فرماتے تو انہیں اللہ کے ان سے کیے ہوئے ان وعدوں کو بتلاتے تاکہ وہ صبر کے ساتھ تقویٰ اختیار کریں، اور اپنی کامیابی کا انہیں یقین ہو جائے۔

اور اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بھی مطلق وعدوں میں سے ایک ہے: ﴿هو الذی...﴾

ترجمہ: "وہ اللہ ایسا ہے کہ اس نے اپنے رسول کو ہدایت دی اور سچا دین (یعنی اسلام) دے کر (دنیا میں) بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کرے اور اللہ کافی گواہ ہے"۔

مقید وعدہ: البتہ مقید وعدہ وہ ہوتا ہے جس میں کوئی شرط ملحوظ ہوتی ہے، مثلاً تقوی کی شرط، صبر کی شرط، اللہ کے دین کی نصرت کی شرط، اور ان جیسی دیگر شرائط۔

فرمان خداوندی ہے: ﴿ان تنصروا الله...﴾

ترجمہ: "اگر تم اللہ کی مدد کرو گے وہ تمہاری مدد کرے گا، اور تمہارے قدم جما دے گا"۔

اور ارشاد ربانی ہے: ﴿ومن یتق الله...﴾

ترجمہ: "اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے (مضرتوں سے) نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اسکو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا"۔

اور اللہ عزوجل فرماتے ہیں: ﴿ومن یتق الله...﴾

ترجمہ: "اور جو شخص اللہ سے ڈرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر کام میں آسانی کر دے گا"۔

اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے مدد کا وعدہ فرمایا ہے بشرطیکہ وہ صبر کریں جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿یأیہا النبی...﴾

ترجمہ: ''اے پیغمبر! آپ مومنین کو جہاد کی ترغیب دیجئے۔ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم رہنے والے ہوں گے تو دوسو (۲۰۰) پر غالب آجاویں گے۔ اور (اسی طرح) اگر تم میں سے سو آدمی ہوں گے تو ایک ہزار کفار پر غالب آجاویں گے۔ اس وجہ سے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو (دین کو) کچھ نہیں سمجھتے''۔

اعجاز قرآن کی آٹھویں وجہ: علوم و معارف: قرآن کریم کی اعجاز کی وجوہ میں سے ایک وجہ وہ علوم معارف ہیں جن سے قرآن بھرا پڑا ہے، اور جو روشن دلیلی اور قوتِ حجت کی اس حد تک پہنچ گئے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر محال تھا کہ وہ انہیں اپنی طرف سے گھڑ لیتے؛ کیوں کہ وہ ایک ناخواندہ شخص تھے اور ناخواندہ لوگوں کے درمیان انہوں نے پرورش پائی تھی، بلکہ روئے زمین کے تمام ادباء اور علمائ، فلاسفہ اور حکماء قانون ساز اور عبقری صفات کے حامل حضرات کے لیے ممکن نہیں کہ وہ ان علوم و معارف کی مثل لے آئیں۔

اور وجوہِ اعجازِ قرآن میں سے یہ وجہ ایک ناقابل تردید دلیل، اور روز روشن کی طرح واضح برہان ہے جو ہر اس جھوٹے اور ہٹ دھرمی کرنے والے دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دیتی ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ محمد جو لے کر آیا ہے وہ تو نری سابقہ کتابوں کی تعلیمات ہیں جنہیں محمد نے اپنے زمانہ میں کسی اہل کتاب سے حاصل کر کے پھر اسے اپنے پروردگار کی طرف منسوب کر لیا ہے، تاکہ وہ اس نسبت سے اس کے تقدس کو پالے: ﴿کبرت کلمة﴾ ''بڑی بھاری بات ہے جو ان کے منہ سے نکلتی ہے (اور) وہ لوگ بالکل ہی جھوٹ بکتے ہیں''۔

ہم ان عقل کے اندھوں سے کہتے ہیں کہ قرآن سابقہ کتابوں کی نقل کیوں کر ہوسکتا ہے، جبکہ وہ ان کے پیروکاروں کی پرزور تردید کرتا ہے، اور ان کی کتابوں کی اکثر باتوں کا مخالف ہے، بلکہ قرآن نے تو آکر ان کے عقائد وافکار کے اصولوں کو ان کتابوں میں تحریف و تبدیل رونما ہونے کی وجہ سے باطل ولغو قرار دیا؟!۔

اور یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ عقیدۂ توحید تثلیث کے ہمنوا بن جائے، جبکہ ان دونوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے؟! کیا یہود و نصاری کے بارے میں ان لوگوں نے قرآن

کا یہ قطعی اور فیصلہ کن حکم گوش گزار نہیں کیا کہ وہ کافر و نافرمان ہیں اور اپنے علماء اور راہبوں کی پرستش کرتے ہیں اور اللہ کو چھوڑ کر بیٹھے ہیں؟! ﴿وقالت...﴾

ترجمہ: ''اور یہود (میں سے بعض) نے کہا کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں، اور نصاریٰ (میں سے اکثر نے) کہا کہ مسیح خدا کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کا قول ہے، ان کے منہ سے کہنے کا۔ یہ بھی ان لوگوں کی سی باتیں کرنے لگے جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں۔ خدا ان کو غارت کرے، یہ کدھر الٹے جارہے ہیں؟! انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے علماء اور مشائخ کو (باعتبارِ طاعت کے) رب بنا رکھا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو صرف یہ حکم کیا ہے کہ فقط ایک معبود (برحق) کی عبادت کریں جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ ان کے شرک سے پاک ہے''۔

قرآن کریم عقائد و عبادات، قانون و انتظام، اخلاق و معاملات، تعلیم و تربیت، سیاست و اقتصاد، اور فلسفہ و اجتماع کے متعدد میدانوں، اور اسی طرح قصص و واقعات، اور جدل و مناظرہ کے اصولوں کے متعلق مختلف علوم و معارف لیکر آیا۔ اور بلاشبہ یہ وجہ وجوہِ اعجاز میں سب سے زیادہ ظاہر اور نمایاں ہے،

چنانچہ ایک ایسے شخص کیلئے جو نہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو اور نہ ہی علم و شریعت کے ماحول اور تہذیب و تمدن کے شہر میں اس کی پرورش ہوئی ہو ممکن نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ قرآن میں موجود ان علوم و معارف کی طرح علوم و معارف لے کر آئے، جو کہ محقق و باکمال بھی ہوں ور دلائل و براہین سے ثابت بھی ہوں، جبکہ انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایسی حالت میں گزارا کہ وہ ان علوم و معارف کی کوئی خبر نہ رکھتے تھے۔ اور نہ کبھی ان کا کوئی قاعدہ اور اصول بیان کیا، اور نہ ہی ان کی فروعات میں سے کسی فرع کا حکم سنایا، مگر یہ کہ وہ اللہ کی طرف سے وحی ہو؟!

عقائد

اور میں چاہتا ہوں کہ ان متعدد و متنوع علوم میں سے صرف ایک ہی کی مثال کے ذکر کرنے پر اکتفاء کروں جو کہ قرآن میں عقیدہ کی بحث ہے، اور نزول قرآن کے وقت اسلام کی تعلیمات اور یہودیت و نصرانیت کی تعلیمات کے درمیان موازنہ کروں، تاکہ

صاحبِ بصیرت کے سامنے سپیدۂ سحر ہویدا ہوجائے، اور چمکتے حق کی روشنی اور اسکے دل فریب نور کو ہم آشکارا کردیں، جیسا کہ مشہور مقولہ ہے کہ: ''اشیاء کی پہچان ان کی ضد سے ہوتی ہے''۔

عقیدۂ اسلام: قرآن کریم اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات اور اس کے پیغمبروں کے متعلق ایک فراخ، صاف، روشن اور خالص عقیدہ لے کر آیا، اور بتادیا کہ اللہ تعالیٰ دونوں جہاں کے پروردگار ہیں، اکیلے، یکتا، تنہا اور بے نیاز ہیں، ان کا باپ ہے نہ بیٹا، تمام صفاتِ کمالیہ اللہ ہی کے لیے ثابت ہیں، اور وہ عیب کی تمام باتوں سے پاک ہے (اس کی ذات کے مشابہ کوئی ذات نہیں اور نہ کسی کی صفات اس کی صفات کے مثل ہیں): ﴿لیس...﴾ ''کوئی چیز اس کے مثل نہیں اور وہ ہر بات کا سننے والا دیکھنے والا ہے''۔ اور وہی مقدس ہستی سب کی محافظ ونگران ہے، اسے نہ اونگھ آتی ہے اور نہ ہی نیند، اور ایک معاملہ اسے دوسرے معاملہ سے غافل نہیں کرتا: ﴿له ما في ...﴾ ''اسی کی ملکیت ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو چیزیں ان کے درمیان ہیں اور جو چیزیں تحت الثریٰ میں ہیں''۔

اور وہی مخلوق کو پیدا کرنے والا ہے، اور وجود بخشنے میں بلاشرکت غیرے تنہا خالق ہے، اسی کے قبضۂ قدرت میں بندوں کی پیشانیاں ہیں، جسے چاہے بھٹکادے اور جسے چاہے ہدایت دے، اور وہ ہر شے پر قادر ہے، تمام اس کی مخلوق ہے اور سب اسی کے بندے ہیں، ﴿ان كل ...﴾ ''جتنے بھی کچھ آسمانوں اور زمین میں ہیں سب خدا تعالیٰ کے روبرو غلام ہوکر حاضر ہوتے ہیں''۔

اور اگر آپ چاہیں تو صفاتِ باری تعالیٰ کے متعلق یہ بہترین آیات تلاوت فرمالیں:

۱۔ ﴿ان الهكم...﴾

ترجمہ: ''تمہارا معبود (برحق) ایک ہے، وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اور پروردگار ہے طلوع کرنے کے مواقع کا''۔

۲۔ ﴿ان ربكم...﴾

ترجمہ: ''بس تمہارا (حقیقی) معبود تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، وہ اپنے علم سے تمام چیزوں کو احاطہ کئے ہوئے ہیں''۔

۳۔ ﴿قل ادعوا اللہ ...﴾

ترجمہ: ''آپ فرمائیے کہ خواہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمن کہہ کر پکارو، جس نام سے بھی پکاروگے سو اس کے بہت (اچھے) اچھے نام ہیں، اور اپنی نماز میں تو بہت پکار کر پڑھیے اور نہ بالکل چپکے چپکے ہی پڑھیے، اور دونوں کے درمیان ایک طریقہ اختیار کیجئے، اور کہہ دیجئے کہ تمام خوبیاں اسی (پاک) کیلئے (خاص) ہیں جو نہ اولاد رکھتا ہے اور نہ اسکا کوئی سلطنت میں شریک ہے اور نہ کمزوری کی وجہ سے اس کا کوئی مددگار ہے، اور اسکی خوب بڑائیاں بیان کیا کیجئے''۔

۴۔ ﴿یأیھا الناس ...﴾

ترجمہ: ''اے لوگو! تم (ہی) خدا کے محتاج ہو، اور اللہ (تو) بے نیاز ہے اور (خود تمام) خوبیوں والا ہے، اگر وہ چاہے تم کو فنا کر دے اور ایک نئی مخلوق پیدا کر دے، اور یہ بات خدا کو کچھ مشکل نہیں''۔

عقیدۂ یہودیت: یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد گمراہی میں پڑ گئے اور ''لعل'' بت کی پرستش کرنے لگے، اور یہ دعویٰ کیا کہ عزیر (علیہ السلام) اللہ کے بیٹے ہیں، اور انسان کو اللہ کے مشابہ قرار دیا، اور یہ بات گھڑ لی کہ اللہ تعالیٰ جب آسمان و زمین کی تخلیق سے تھک گئے تو ہفتہ کے دن آرام کرنے لگے اور چت ہو کر لیٹ گئے، اور پھر سوچے سمجھے بغیر مزید آگے بڑھے اور کہا کہ اللہ تعالیٰ انسان کی شکل میں ظاہر ہوئے اور اسرائیل (یعقوب علیہ السلام) سے کشتی لڑی، لیکن اس پر غالب نہ آسکے، اور نہ اپنی جان اس سے چھڑا سکے، یہاں تک کہ یعقوب علیہ السلام اور اس کی اولاد کو برکت سے نوازا، تو یعقوب نے اس وقت رب کو چھوڑ دیا (نعوذ باللہ من ذلک)۔

اور ان کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام قوموں میں سے چنیدہ اور پسندیدہ قوم ہے، اور وہ اللہ کے بیٹے اور محبوب ہیں، اور دار آخرت صرف انہی کے لیے ہے نہ کہ دوسرے لوگوں کے لیے، اور آگ انہیں صرف چند دن (یعنی بچھڑے کی عبادت کرنے کے بقدر جو کہ چالیس دن ہیں) ہی چھوئے گی، اسی طرح انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق بہتان باندھا اور کہا کہ وہ زنا کی اولاد ہیں اور ان کی ماں زانیہ تھیں (نعوذ باللہ من ذالک، کبرت

کلمۃ تخرج من أفواھھم) اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی پر چڑھایا تا کہ وہ بنی اسرائیل کو اس بد فعلی کے گناہ سے پاک کردیں، یہ تمام اور اس کے مثل دیگر یہود کی بہت ساری باطل اور گمراہ کن باتیں ہیں جنہیں قرآن نے آکر مٹاڈالا، اور ان کے خلاف اعلان جنگ کردیا، چنانچہ یہ لوگ کیسے یہ گمان کربیٹھے ہیں کہ قرآن تورات سے ماخوذ ہے؟

عقیدۂ عیسائیت: نصاریٰ گمراہ ہوئے اور انہوں نے یہ خیال کیا کہ اللہ کے لیے بیٹا ہے، اور تثلیث (یعنی باپ، بیٹا اور روح القدس) پر ایمان کے ایک پیچیدہ عقیدہ کو اپنالیا، اور ان تینوں کا نام انہوں نے ''أقانیم'' رکھا، چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تین خداؤں کے مجموعہ کے وہ دوسرے شخص ہیں جو پہلے اور تیسرے خدا کا عین ہیں، اور ان میں سے ہر ایک دوسرے کا عین ہے، تین خدا ایک ہیں اور ایک تین ہیں۔

نیز شریعت بنانے اور کسی شے کے حلال وحرام کرنے کا جو منصب صرف اور صرف اللہ کا تھا اسے اپنے مذہبی علماء اور پیشواؤں کے سپرد کردیا، اور یہ باطل عقیدہ گھڑا کہ اللہ کے بیٹے سولی پر اس لیے چڑھے تا کہ وہ انسانوں کو ان کی سزا سے چھٹکارا دلاسکیں اور ان کے گناہوں سے انہیں پاک کرسکیں۔ اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ عیسائیوں میں بہت زیادہ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام بعینہ اللہ ہیں جو انسان کی شکل میں زمین پر اترے، اور اس کے علاوہ بھی ان کے دیگر باطل اور رسوا کن عقائد ونظریات ہیں جو انہوں نے اللہ کی طرف منسوب کیے ہیں: ﴿سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَقُوۡلُوۡنَ عُلُوًّا كَبِيۡرًا﴾ ''یہ لوگ جو کچھ کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بہت زیادہ برتر ہے''۔

دیکھئے قرآن کریم کے لائے ہوئے حق اور ان دونوں فریقوں کے بیان کیے ہوئے باطل کلام میں کس قدر نمایاں اور زبردست فرق ہے، مزید یہ کہ قرآن کریم نے صرف ان باطل نظریات کو بیان کرنے، اور اہل کتاب کی ان کے بارے میں تحریف کی خبر دینے پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ روشن دلائل اور فیصلہ کن براہین سے ان کی تردید فرمائی ہے۔ قرآن کی طرف کان لگائیں کہ وہ نصاریٰ کے متعلق بتارہا ہے: ﴿یأھل الکتاب...﴾

ترجمہ: ''اے اہل کتاب! تم اپنے دین میں حد سے مت نکلو، اور خدا تعالیٰ کی شان میں غلط بات مت کہو، مسیح عیسیٰ بن مریم تو اور کچھ بھی نہیں البتہ اللہ کے رسول

ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے مریم تک پہنچا دیا تھا، اور اللہ کی طرف سے ایک جان ہیں، سو اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر ایمان لاؤ، اور یوں مت کہو کہ تین ہیں، باز آ جاؤ تمہارے لئے بہتر ہوگا، معبود حقیقی تو ایک ہی معبود ہے، وہ صاحب اولاد ہونے سے منزہ ہے، جو کچھ آسمانوں میں موجودات ہیں سب اس کی ملک ہیں اور اللہ تعالیٰ کارساز ہونے میں کافی ہے، مسیح ہرگز خدا کے بندے بننے سے عار نہیں کریں گے ار نہ مقرب فرشتے، اور جو شخص خدا تعالیٰ کی بندگی سے عار کرے گا اور تکبر کرے گا، تو خدا تعالیٰ ضرور سب لوگوں کو اپنے پاس جمع کریں گے"۔

اور اُسے غور سے سنیں کہ یہود کے بارے میں گویا ہے: ﴿فَبِمَا نَقْضِهِمْ ...﴾

ترجمہ: "سو ہم نے سزا میں مبتلا کیا، ان کی عہد شکنی کی وجہ سے، اور ان کے کفر کی وجہ سے احکام الٰہیہ کے ساتھ، اور ان کے قتل کرنے کی وجہ سے انبیاء کو ناحق، اور ان کے اس مقولہ کی وجہ سے کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں، بلکہ ان کے کفر کے سبب ان کے قلوب پر اللہ تعالیٰ نے بند لگا دیا ہے، سو ان میں ایمان نہیں مگر قدرے قلیل، اور ان کے کفر کی وجہ سے، اور حضرت مریم (علیہ السلام) پر ان کے بڑا بھاری بہتان دھرنے کی وجہ سے، اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہم مسیح بن مریم کو جو کہ رسول ہیں اللہ تعالیٰ کے، قتل کر دیا، حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ انکو سولی پر چڑھایا لیکن انکو اشتباہ ہو گیا، اور جو لوگ ان کے بارے میں اختلاف کرتے ہیں وہ غلط خیال میں ہیں، ان کے پاس اس امر پر کوئی دلیل نہیں بجز تخمینی باتوں پر عمل کرنے کے، اور انہوں نے ان کو یقینی بات ہے کہ قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو خدائے تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھا لیا اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والے ہیں"۔

اور قرآن نے کھلے لفظوں میں اس تحریف کو بیان کیا ہے جو اہل کتاب سے تورات اور انجیل میں ہوئی ہے، اور بتا دیا ہے کہ رسول علیہ السلام کی ذمہ داری یہ ہے کہ اس جھوٹ اور بہتان کی اصلاح و درستگی کریں جس کا اہل کتاب نے ارتکاب کیا ہے، اور تورات و انجیل کی ان آیتوں کو بیان کریں کہ جن کو انہوں نے اپنی قوم سے چھپائے رکھا۔ ﴿یأهل الكتاب...﴾

"اے اہل کتاب! تمہارے پاس ہمارے یہ رسول آئے ہیں، کتاب میں سے جن امور کا تم اخفاء کرتے ہو ان میں سے بہت سی باتوں کو تمہارے سامنے صاف

صاف کھول دیتے ہیں اور بہت سے امور کو واگذاشت کر دیتے ہیں۔ تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے اور ایک واضح کتاب کہ اس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ ایسے شخصوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتے ہیں، اور ان کو راہ راست پر قائم رکھتے ہیں''۔

آیا اس روشن دلیل کے بعد سردار انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر کوئی اس سے زیادہ واضح دلیل ہو سکتی ہے؟ اللہ تعالیٰ رحم فرمائے علامہ بوصیری پر کہ انہوں نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

كَفَاكَ بِالْعِلْمِ فِي الْأُمِّيِّ مُعْجِزَةً فِي الْجَاهِلِيَّةِ التَّأْدِيْبُ فِي الْيُتْمِ

ترجمہ: ''آپ کے لیے یہی معجزہ کے طور پر کافی ہے کہ دور جاہلیت میں ایک ناخواندہ کے پاس علم ہے، اور یتیمی کی حالت میں ایک یتیم اخلاق و آداب سے آراستہ ہے''۔

اعجازِ قرآن کی نویں وجہ: قرآن کا انسانی ضروریات کو پورا کرنا: یہ وجہ وجوہِ اعجاز میں سب سے روشن اور نمایاں ہے کہ جس کو شریعت اسلامیہ میں ہر غور کرنے والا پا سکتا ہے، چنانچہ بلاشبہ قرآن ایسی ہدایات کو لے کر آیا ہے جو کامل و مکمل، جامع اور ہمہ گیر ہیں، ہر زمانہ اور ہر جگہ میں حاجاتِ بشریہ کو پورا کرتی ہیں۔ اور اگر آپ قرآن کے ان شاندار مقاصد کا جائزہ لو گے جنہیں قرآن نے اپنی ہدایت وارشاد میں نکتۂ نگاہ بنایا ہے تو آپ کے سامنے یہ بات آشکارا ہو جائے گی، ان مقاصد کا مختصر خلاصہ یوں بیان کیا جا سکتا ہے: ۱۔ فرد کی اصلاح، ۲۔ معاشرہ کی درستگی، ۳۔ عقائد کی اصلاح، ۴۔ عقائد کی اصلاح، ۵۔ عبادات کی اصلاح۔ ۶۔ اخلاق کی درستگی، ۷۔ سیاست وحکومت کی اصلاح، ۸۔ مالی معاملات کی اصلاح، ۹۔ جنگی معاملات کی اصلاح، ۱۰۔ تعلیم وتربیت کی اصلاح، ۱۱۔ بے سروپا عقائد سے عقول وافکار کو آزاد کرنا۔

اور شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے۔

شَرِيْعَةُ اللّٰهِ لِلْإِنْسَانِ تِبْيَانُ وَكُلُّ شَيْءٍ سِوَى الْقُرْآنِ خُسْرَانُ

ترجمہ: ''شریعت خداوندیہ انسان کے لیے ایک واضح راستہ ہے اور قرآن کے سوا ہر چیز میں خسارہ ہی خسارہ ہے''۔

اعجازِ قرآن کی دسویں وجہ: قرآن کی دلوں میں تاثیر: اعجازِ قرآن کی وجوہ میں سے ایک وہ زبردست تاثیر بھی ہے جو قرآن نے اپنوں اور پرائیوں کے دلوں میں پیدا کی، یہاں تک کہ قرآن کی قوتِ تاثیر اس حد تک جا پہنچی کہ مشرکین بذاتِ خود مسلمانوں سے تلاوت کلام سننے کیلئے رات کے پہروں میں نکل پڑتے، اور اسی لئے وہ آپس میں ایک دوسرے کو قرآن کے نہ سننے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قرآن پڑھتے وقت شور وغل مچانے کی تلقین ونصیحت کرتے، تاکہ مبادا کوئی شخص آپ پر ایمان نہ لے آئے: ﴿وقال الذین...﴾

ترجمہ: ''اور یہ کافر (باہم) یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی مت، اور (اگر پیغمبر سنانے لگیں تو) اسکے بیچ میں شور وغل مچادیا کرو (اس تدبیر سے) تم ہی غالب رہو''۔

قرآن کی دلوں میں تاثیر یہاں تک جا پہنچی کہ اس کے سخت ترین دشمنوں اور شدید ترین مخالفین نے بھی اس کے سائے تلے پناہ لی، رؤسائے عرب اور سرداران کفر میں سرفہرست حضرت عمر بن الخطاب، حضرت سعد بن معاذ، حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنھم وغیرہ بھی اسی کے سائے تلے آ گئے۔

یہ حضرت عمر بن خطاب ہیں جن کی شدید ترین بے رحمی مسلمانوں کے خلاف اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ لوگ ان کے متعلق کہا کرتے تھے: ''بخدا! عمر اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک کہ خطاب کا گدھا ایمان نہ لے آئے! (یعنی عمر کا ایمان لانا محال ہے) اور ان کی سخت عداوت کا یہ عالم تھا کہ ایک دن دوپہر کو اپنی تلوار گلے میں لٹکائی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکل پڑے تاکہ انہیں قتل کردیں، لیکن (مشیت خداوندی کو یہ منظور نہ تھا اور وہ) شام ہونے سے پہلے پہلے اپنی بہن کے گھر میں حضرت سعد بن زید رضی اللہ عنہ سے چند آیاتِ قرآنیہ سننے کی وجہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو کر لوٹے اور آپ رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کا قصہ تو بہت مشہور ہے۔

اور آپ دیکھیں کہ قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور ان کے بھتیجے اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کیسے اسلام لائے؟ سیرت کی کتابوں میں منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم جب مکہ میں تھے تو آپ علیہ السلام کے پاس مدینہ کی ایک جماعت آئی جنہوں نے عقبہ میں بیعت کی، چنانچہ آپ علیہ السلام نے ان کے ساتھ دو جلیل القدر نمائندوں کو بھیجا تا کہ وہ انہیں قرآن واسلام کی تعلیم دیں، وہ دونوں حضرات مصعب بن عمیر اور عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہما تھے، تاہم جب یہ دونوں حضرات مدینہ منورہ پہنچے تو انہوں نے لوگوں کو قرآن کی تعلیم دینا شروع کر دی، یہ بات جب قبیلہ خزرج کے سردار حضرت سعد بن معاذ تک پہنچی تو انہوں نے اپنے بھتیجے اسید بن حضیر سے کہا کہ تم ان آدمیوں کے پاس نہیں چلے جاتے جو یہاں آ کر ہمارے ناتواں لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، کہ تم ان دونوں کو اس کام سے روکو اور منع کرو؟!۔

سو حضرت اسید ان دونوں کے پاس آئے اور جب ان کے پاس پہنچے تو ان سے کہا: ''کہ تمہیں کیا چیز یہاں لے کر آئی ہے؟ تم اس لئے آئے ہو کہ ہمارے ضعیف لوگوں کو بے وقوف بناؤ!'' پھر انہیں ڈرایا، دھمکایا اور کہا: ''کہ ہم سے دور ہو جاؤ اگر تمہیں اپنی جان پیاری ہے؟''۔

اس پر حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے اسید سے کہا: ''کہ آپ بیٹھ کر ہماری بات سننا پسند فرمائیں گے؟ پھر اگر آپ کو کوئی بات پسند آئے تو قبول کریں اور اگر اسے ناپسند کریں تو ہم آپ کی ناپسندیدہ بات سے رک جائیں گے''۔

یہ سن کر اسید بیٹھ گئے جبکہ حضرت مصعب رضی اللہ عنہ قرآن کی تلاوت کرنے لگے اور اسید سنتے رہے، اور مجلس برخاست نہ ہونے پائی تھی کہ اسید اسلام لے آئے۔ پھر سعد کی طرف لوٹ آئے اور اسے کہا کہ بخدا! میں نے ان دونوں آدمیوں میں کوئی نقصان دہ بات نہیں دیکھی، اور اپنے اسلام کو ان کے سامنے ظاہر نہ کیا، اس پر سعد بپھر گئے۔ اور غصہ اور جوش میں خود ان کی طرف اٹھ کھڑے ہوئے، اور ان دونوں سے جا کر کہا: ''کہ تمہیں یہاں کیا چیز لائی ہے؟ کیا تم اس لئے آئے ہو کہ ہمارے ناتواں لوگوں کو بے وقوف بناؤ! ہم سے دور چلے جاؤ!''۔

تو مصعب رضی اللہ عنہ نے ان سے فرمایا: ''کہ کیا آپ ہماری بات بیٹھ کر سننا پسند فرمائیں گے؟ پھر اگر آپ کوئی بات پسند کریں تو قبول کر لیں، اور اگر ناپسند کریں تو ہم آپ کی

ناپسندیدہ بات سے رک جائیں گے"۔

اس پر سعد نے کہا کہ تم انصاف کی بات کی ہے، تو مصعب رضی اللہ عنہ تلاوت فرمانے لگے اور سعد سنتے رہے، مصعب رضی اللہ عنہ کہتے کہ ہیں کہ بخدا! جب سعد قرآن سن رہے تھے تو ان کا چہرہ نور ایمان سے چمک رہا تھا، پس حضرت مصعب رضی اللہ عنہ قراءت ختم نہ کر پائے تھے کہ سردار اوس نے اپنے ایمان کا اعلان کر دیا۔

پھر واپس لوٹ گئے اور اپنے قبیلہ کو جمع فرمایا اور ان سے کہا: "کہ تم لوگوں کی نگاہ میں میں کیسا ہوں؟ انہوں نے کہا کہ آپ ہمارے سردار اور سردار کے بیٹے ہیں، اس پر سعد نے کہا: "تب مجھے تمہارے مردوں اور عورتوں سے کلام حرام ہے جب تک کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لے آؤ"۔ ان کے اس طرح کہنے پر سب کے سب اسلام میں داخل ہو گئے...... رضی اللہ عن سعد وأرضاہ!!

اسی طرح قرآن نے دوستوں اور دشمنوں دونوں کے دلوں میں اپنی تاثیر دکھائی، آپ قرآن سے متاثر ہونے والے ولید بن مغیرہ، عتبہ بن ربیعہ اور ان دونوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کے قصوں کو یاد رکھیں۔ اگر سرداری کی محبت، اور جاہ و منصب کی طمع آڑے نہ آتی تو سب کے سب اللہ کے دین (اسلام) میں داخل ہو جاتے، لیکن ہدایت تو اللہ کے ہاتھ میں ہے: ﴿یضل ...﴾ "جسکو چاہیں گمراہ کر دیتے ہیں اور جس کو چاہیں ہدایت دیتے ہیں، اور ہدایت پانے والوں کا علم (بھی) اسی کو ہے"۔

صاحب تفسیر المنار نے ذکر کیا ہے کہ ایک فرانسیسی فلسفی نے ایک کتاب لکھی جس میں اس نے عیسائی مشنریوں کے اس دعوے کو رد کیا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسی آیات لے کر نہیں آئے، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سے پہلے انبیاء جیسی غیر معمولی نشانیوں کا ظہور نہیں ہوا، چنانچہ وہ فلسفی کہتا ہے کہ:

"بلا شبہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو انتہائی خشوع و خضوع، درویدگی اور ریفتگی، تضرع وآہ و زاری کے ساتھ پڑھتے تو وہ لوگوں کے دلوں کو ایمان کی طرف کھینچنے میں وہ اثر دکھاتا جو کہ گزشتہ انبیاء کے تمام معجزات کے اثر سے زیادہ ہوتا تھا"۔ دیکھیے: تفسیر منار۔

اور علامہ رافعی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "اعجاز القرآن" میں امیر شکیب ارسلان رحمہ

اللہ کے حوالہ سے ایک قیمتی بات ذکر کی ہے، شکیب ارسلان رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ’’مسیحی تاریخ میں دو مشہور و معروف مصلحین لوتھر اور کلفین کا ایک دفعہ فرانسیسی دانش ور ’’فولٹیر‘‘ کے سامنے تذکرہ ہوا تو اس نے کہا: ’’کہ یہ دونوں تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جوتیوں کے لائق بھی نہیں‘‘۔

اعجازِ قرآن کی گیارہویں وجہ: تناقض سے سلامتی: آخر میں ہم کہتے ہیں کہ اعجاز قرآن کی ایک وجہ قرآن کا باہم تناقض تعارض سے خالی ہونا ہے، برخلاف تمام انسانی کلاموں کے، اور اللہ نے بالکل سچ فرمایا ہے: ﴿ولو کان...﴾ ’’اور اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بکثرت تفاوت پاتے‘‘۔

یہ تو اعجاز قرآن کی بعض وجوہ تھیں، اور یہاں اور وجوہ بھی پائی جاتی ہیں لیکن ہم نے طوالت کے خوف سے ان سے اعراض کیا ہے، جبکہ زمانہ ہمیشہ اعجاز قرآن کی وجہ کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھاتا رہے گا، چنانچہ جوں جوں زمانہ ترقی کرے گا اعجاز کے مختلف پہلو صاف ظاہر ہو جائیں گے، اور اس بات پر مضبوط دلیل قائم ہو جائیگی کہ یہ کتاب حکیم اور قابل ستائش ذات کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ ان تمام باتوں کے باوجود علمائے کرام کے ذکر کردہ یہ اسرار و رموز علوم قرآن کے سمندر کے ایک قطرہ سے زیادہ نہیں، بات کو جس قدر پھیلا دیا جائے اور بیان جتنا بھی بڑھ جائے لیکن اللہ کے کلام کا کوئی احاطہ نہیں کر سکتا جیسا کہ اس کی عظیم ذات اور جلیل القدر صفات کا احاطہ کسی کے بس میں نہیں!!۔

صرفہ کے اعتراض کا جواب: جب ہم اعجاز قرآن کی وجوہ کے بیان سے فارغ ہو گئے تو ہم اپنے اوپر لازم سمجھتے ہیں کہ ہم اس توہم کا بھی جواب دیں جسے بعض معتزلہ اور بعض شیعہ نے اختیار کیا ہے، اور وہ توہم و شبہ صرفہ کا قول ہے، اس اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کو قرآن کے معارضہ سے پھیر دیا، باوجود یکہ قرآن اپنی بلاغت میں اس معیار تک نہ پہنچا تھا کہ جس کی مثل لانے سے انسان عاجز ہو، اور اگر اللہ ان کی ہمتوں کو قرآن کے معارضہ سے نہ پھیرتے تو وہ لوگ اس کی مثل لا سکتے تھے...... الخ۔

آپ ان قائلین کو دیکھ رہے ہیں کہ ان کا مسلک یہ ہے کہ نفس قرآن معجز نہیں بلکہ اعجاز قرآن کے دو سبب ہیں:

پہلا سبب: وہ صارف الٰہی ہے جس نے انہیں قرآن کے معارضہ سے بے رغبت کردیا، چنانچہ وہ معارضہ سے سست پڑ گئے اور کنارہ کش ہو گئے۔

دوسرا سبب: وہ ناگہانی آفت ہے جس نے ان کی بیانی صلاحیتوں اور بلیغانہ قدرتوں کو بے کار کردیا۔

یہ قول بمع اپنی دونوں شقوں کے باطل ہے جو بحث ونظر کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا اور نہ ہی واقعہ کے مطابق ہے، اور یہ بطلان کئی اسباب کی بنا پر ہے:

۱- اگر اس قول کو صحیح مانا جائے تو اعجاز ''صرفہ'' (پھیرنے) میں ہوگا نہ کہ نفس قرآن میں، جبکہ یہ بالاجماع باطل ہے۔

۲- اگر صرفہ کا قول صحیح ہو تو یہ تعجیز (یعنی قرآن کا انہیں عاجز بنانا اگرچہ وہ فی نفسہ عاجز نہ تھے) ہوگی نہ کہ اعجاز؛ کیوں کہ اس وقت اس کی مثال یوں ہوگی کہ ہم کسی شخص کی زبان کاٹ ڈالیں پھر اسے ہم اس کے بعد بولنے کا مکلف بنائیں، چنانچہ یہ ''عجز'' کے باب سے نہیں ہوگا بلکہ وہ ''تعجیز'' کی قبیل سے ہوگا:

ألقاه في اليم مكتوفاوقال له ایاک ایاک أن تبتل بالماء

ترجمہ: ''ایک نے دوسرے کو دریا میں ہاتھ باندھ کر پھینک دیا اور اس سے کہنے لگا کہ پانی میں بھیگنے سے بچو! بچو!''۔

۳- اگر وہاں کوئی اکتاہٹ وسستی کا ایسا مانع وصارف ہوتا جو انہیں معارضہ سے بے رغبت کردیتا تو وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو کھڑے نہ ہوتے اور آپ کو اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کو نہ ستاتے، مسلمانوں کو عذاب میں مبتلا اور جلاوطن نہ کرتے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے قبیلہ سے بائیکاٹ اور شعب ابی طالب میں محصور نہ کرتے کہ جس میں وہ سب درختوں کے پتے کھانے پر مجبور ہو گئے، اور دعوت کے راستے کو چھوڑنے کیلئے آپ سے تبادلہ خیال اور بھاؤ تاؤ نہ کرتے، پھر آپ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہجرت کرنے پر مجبور نہ کرتے، اور اس کے علاوہ وہ عوامل واسباب نہ ہوتے جن کی بنا پر یہ لوگ اسلام کو ہر ممکن طریقہ سے ختم کرنے کے راستے پر چل پڑے۔

۴- اگر وہاں کوئی ایسی ناگہانی آفت ہوتی جس نے ان کی بیانی صلاحیتوں کو بے

کار کر دیا تھا تو وہ لوگوں میں اس کا برملا اعلان کرتے، تاکہ وہ اپنے لیے کوئی عذر تلاش کریں، نیز قرآن کی شان گھٹائیں، اور نزول قرآن کے بعد ان کی فصاحت و بلاغت میں نزول قرآن سے پہلے کی بنسبت کمی آجاتی، جبکہ یہ بات ظاہر البطلان ہے۔

۵- اور اگر اس ناگہانی حادثہ کو صحیح قرار دیا جائے تو آج ہمارے لئے بھی اور عربی ادب سے وابستہ رہنے والے حضرات کے لیے بھی ہر دور میں ممکن ہوگا کہ وہ قرآن کا معارضہ کریں اور اعجاز قرآن کے دعویٰ میں جھوٹ ظاہر کر دیں، جبکہ یہ تمام صورتیں باطل ہیں۔

کیا ان تمام باتوں کے باوجود بھی کوئی عقلمند شخص اپنے لئے یہ کہنا پسند کرے گا کہ تمام عربوں کو قرآن اور پیغمبر قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کے معارضہ سے پھیر دیا گیا تھا، اور وہ لوگ عجز و کسل کی طرف مائل اور اس میدان میں اترنے سے بے رغبت تھے؟! اور کیا کسی ایسے شخص کیلئے ممکن ہے جو اپنے نفس و عقل کا لحاظ رکھے کہ وہ اس قسم کے جھوٹے الزام یعنی صلاحیتوں اور حواس کو معطل کر دینے کی تصدیق کرے، بعد ازیں کہ اس نے سردارانِ قریش میں سے سب سے سخت ترین دشمن ولید بن مغیرہ کی شہادت و گواہی کو سن لیا ہو کہ جب اس نے اپنا یہ مشہور قول کہا: "کہ بخدا! میں نے ابھی ایک ایسا کلام سنا ہے جو نہ کسی انسان کا کلام ہے، نہ ہی کاہنوں کا کلام ہے، اور اللہ کی قسم! اس میں غضب کی شیرینی اور بلا کی رونق ہے، اس کا اُتلا حصہ پھل دار اور نچلا حصہ شاداب ہے، اور یہ کلام غالب ہی رہتا ہے مغلوب نہیں ہوتا"۔ اور فضیلت تو وہی ہوتی ہے جس کی گواہی دشمن بھی دے۔

آخر میں میں علامہ قرطبی رحمہ اللہ کے کلام کو جو انہوں نے تفسیر "الجامع لأحكام القرآن" میں ذکر کیا ہے بیان کر کے اپنی بات کو ختم کرتا ہوں، وہ فرماتے ہیں: "تاہم یہ دس وجوہ ہیں جنہیں ہمارے علمائے کرام رحمہم اللہ نے اعجاز قرآن کے سلسلہ میں بیان کیا ہے، اور اس مقام پر ایک دوسرا قول بھی ہے جسے نظام معتزلی نے ذکر کیا ہے کہ: "اعجاز کی وجہ: قرآن کے معارضہ سے منع کرنا اور اس کی مثل لانے کے چیلنج کے وقت لوگوں کو پھیرنا ہے، اور معجزہ منع کرنا اور پھیرنا ہے نہ کہ نفس قرآن، نیز صرفہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو قرآن کے مثل ایک سورت لانے کے چیلنج کے ساتھ ان کی ہمتوں اور ارادوں کو قرآن کے معارضہ سے موڑ دیا"۔ لیکن یہ قول فاسد ہے؛ کیوں کہ امت کا اجماع ہے کہ قرآن بذاتِ خود معجز ہے،

لہٰذا اگر ہم کہیں گے کہ معجز تو منع اور صرفہ ہے تو قرآن معجز ہونے سے نکل جائے گا''۔

صحیح بات یہ ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ایک بھی اب تک قرآن کی مثل لانے پر قادر نہ ہوسکا، اور حقارت آمیز اور تلخ چیلنج کے باوجود انسان کا قرآن کی کسی ایک سورت کے مثل لانے میں بے بسی سے اس کی خامی اور بے بسی آپ کے سامنے ظاہر ہوجائے گی۔

کیا کسی نے قرآن کے معارضہ کی کوشش کی ہے؟ تاریخ وآثار کے راویوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ مشرکین عرب کے بڑے بڑے بلغاء اور چوٹی کے شعراء کے دل میں قرآن کے معارضہ کا خیال تک نہیں آیا اور ان میں سے کسی ایک سے بھی یہ منقول نہیں کہ انہوں نے قرآن کے معارضہ کا ارادہ وکوشش کی ہو باوجودیکہ وہ لوگوں کو اسلام سے روکنے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تکذیب کرنے میں بہت زیادہ حریص ومتمنی تھے۔

البتہ بعض پرلے درجے کے بے وقوف اور احمق لوگوں سے یہ بات منقول ہے کہ انہوں نے قرآن کے معارضہ کی کوشش کی، لیکن وہ جو لے کر آئے وہ ایسی مضحکہ خیز کاوشیں تھیں جنہوں نے ان کو لوگوں کے سامنے رسوا کردیا، اور عقلاء کے سامنے مسخرہ بنادیا، چنانچہ وہ اللہ کا غضب اور لوگوں کی ناراضگی کو لے کر لوٹے، اور ان کا یہ پچھڑنا بھی حق کی ایک نئی فتح وکامیابی اور قرآن کے کلام اللہ ہونے پر ایک روشن دلیل تھی کہ کوئی انسان اس کا معارضہ نہیں کرسکتا۔

الف: مسیلمہ کذاب: ان حمقاء میں سے ایک ''مسیلمہ کذاب'' ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا، اور یہ خیال کیا کہ وہ نبوت کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شریک ہے، ہجرت کے دسویں سال اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ایک خط لکھا جس میں اس نے کہا: ''اَمابعد، بلاشبہ مجھے زمین میں تیرے ساتھ ساجھی بنادیا گیا ہے، لہٰذا آدھی زمین ہماری ملکیت ہوگی اور آدھی قریش کی، مگر قریش بے انصافی کرنے والی قوم ہے......!''۔ اور مسیلمہ نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے پاس بھی ایک قرآن ہے جو اس پر آسمان سے نازل ہوا ہے، اور اس سے ایک فرشتہ لیکر آتا ہے جس کا نام ''رحمن'' ہے۔

آیئے ہم اس کی بیہودہ باتوں اور بکواسات کا کچھ حصہ نقل کرتے ہیں تاکہ اس احمق ودجال کا جھوٹ ظاہر اور معاملہ صاف ہوجائے، سو اس کیلئے کذاب ہونے کا لیبل ہی بہت ہے۔

مسیلمہ کذاب أخزاہ اللہ نے سورۃ العادیات کے مقابلہ میں یوں کہا: ﴿والطاحنات...﴾
ترجمہ: ''قسم ہے آٹا پیسنے والیوں کی جو آٹا پیستی ہیں، اور آٹا گوندھنے والیوں کی جو آٹا گوندھتی ہیں، اور روٹیاں پکانے والیوں کی جو روٹیاں پکاتی ہیں، اور ثرید بنانے والیوں کی جو ثرید بناتی ہیں، اور لقمہ کھانے والیوں کی جو تیل اور گھی کے لقمے کھاتی ہیں ...... بلاشبہ تمہیں دیہاتی لوگوں پر فضیلت دی گئی ہے، اور متمدن اور خانہ نشین لوگ بھی تم سے آگے بڑھے ہوئے نہیں ہیں ......اپنی آبادیوں کا دفاع کرو، عاجز و درماندہ کو پناہ دو، اور باغی کا مقابلہ کرو''۔

اور ایک دوسری جگہ یہ دریدہ دہن کہتا ہے: ﴿والشاء...﴾
ترجمہ: ''قسم ہے بکریوں اور ان کے رنگوں کی، ان میں سے سب سے زیادہ خوشنما کالی بکریاں اور ان کے دودھ ہیں، قسم ہے کالی بکری اور اس کے سفید دودھ کی، بے شک یہ بہت ہی حیرت انگیز بات ہے، اور تم پر دودھ میں پانی ملانا حرام کر دیا گیا ہے، سو تمہیں کیا ہوا کہ مجیع (دودھ اور کھجور کا حلوہ) نہیں کھاتے؟''۔

اور اس کے من گھڑت قرآن میں سے ایک یہ بھی ہے: ﴿الفیل، ما الفیل...﴾
ترجمہ: ''ہاتھی، کیا ہے ہاتھی، اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ ہاتھی کیا ہے، اس کی ایک سخت دم ہے، اور لمبی سونڈ ہے......''۔

اس کا ایک کلام یہ بھی ہے: ﴿یاضفدع...﴾
ترجمہ: ''اے مینڈکی، مینڈک کی بیٹی، تو اپنے بدن کو صاف کر جس قدر صاف کر سکتی ہے، تیرا آدھا بدن پانی میں ہے اور آدھا کیچڑ میں، تو نہ پانی کو گدلا کرتی ہے اور نہ پینے والے کو پانی پینے سے روکتی ہے''۔

اور اس نے یہ دعویٰ کیا کہ اس نے سورۂ کوثر کا معارضہ کیا ہے، چنانچہ وہ اس بکواس کو لوگوں کے سامنے لے کر آیا: ﴿انا اعطیناك...﴾
ترجمہ: ''بے شک ہم نے تمہیں بیشتر عوام عطا کی ہے، سو تو اپنے رب کے لیے نماز پڑھ اور علی الاعلان بات کہہ، بے شک تیرا دشمن وہ کافر ہے''۔

اس کذاب کا تمام کلام اسی طرز پر بیہودہ اور لچر ہے جو نہ ہی حوصلہ افزا ہے اور نہ ہی باہم مربوط، اور آپ جانتے ہیں کہ اس طرح کی الجھی باتیں بالکل معارضہ کی صلاحیت نہیں رکھتیں۔

علامہ رافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ''مسیلمہ کذاب نے فن بیان کے پہلو سے قرآن کے معارضہ کا ارادہ نہیں کیا تھا، بلکہ اس نے ارادہ کیا تھا کہ اپنی قوم کو اپنے دام فریب میں پھنسانے کیلئے ایک دوسرے پہلو سے ایسا راستہ اختیار کرے جسے وہ اپنے لئے زیادہ آسان اور لوگوں کے دلوں میں تاثیر کیلئے قریب ترین سمجھتا ہے۔ اور وہ یہ تھا کہ اس نے عربوں کو دیکھا کہ وہ زمانہ جاہلیت میں کاہنوں کی تعظیم کیا کرتے تھے، اور کاہنوں کا عام اسلوب بیان اس پریشان کن قافیہ بندی پر ہوتا تھا جسے وہ لوگ جنات کا کلام سمجھتے تھے، جیسا کہ کاہنوں کا مقولہ ہے: ''یَا جَلِیْحُ، اَمْرٌ نَجِیْحٌ، رَجُلٌ فَصِیْحٌ، یَقُوْلُ لا الٰہ الا اللّٰہ''

ترجمہ: ''ارے گنجے! معاملہ کامیاب ہے، آدمی فصیح ہے، جو کہ لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے''۔

چنانچہ وہ لوگوں کے سامنے مُسَجَّع کلام پیش کرتا رہا تاکہ وہ لوگوں کو شبہ میں ڈال دے کہ اس کی طرف وحی کی جاتی ہے، مگر وہ اپنے اس حیلہ ومکر میں کامیاب نہ ہوا؛ کیوں کہ اس کی جماعت اس کے جھوٹ اور بے وقوفی کو سمجھتی تھی، اور وہ لوگ کہتے تھے کہ یہ کہانت کے استعمال کرنے میں ماہر ہے اور نہ ہی نبوت کے دعوے میں سچا ہے، اور ان لوگوں کا مسیلمہ کی اتباع کرنا قائل کے اس قول کے مطابق تھا کہ قبیلہ ربیعہ کا کذاب ہمیں قبیلہ مضر کے صادق سے زیادہ محبوب ہے۔

ب: اُسود عنسی: نبوت کے دعویداروں میں سے ایک ''اُسود عنسی'' ہے، یمن میں اس نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اس نے یہ کہا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے، چنانچہ وہ اپنے سر کو زمین کی طرف جھکا دیتا پھر اسے اوپر اٹھاتا اور کہتا کہ مجھے یوں یوں کہا گیا ہے یعنی اس کے شیطان نے جو کہ اس کی جانب القاء کرتا ہے یہ کہا ہے، وہ بڑا ظالم شخص تھا لیکن غضب کا فصیح اور کہانت، قافیہ بندی، تقریر، شعر اور نسب گوئی میں معروف تھا، اس کے بارے میں یہ مروی نہیں ہے کہ اس نے قرآن کے معارضہ کی کوشش کی ہو، بلکہ اس نے نبوت کے دعوے اور اپنے پر وحی نازل ہونے پر ہی اکتفا کیا: ﴿ان الشیٰطین ...﴾ ''اور یقیناً شیاطین اپنے دوستوں کو تعلیم کر رہے ہیں''۔

ج: طلحہ بن خویلد اُسدی: ایک ''طلحہ بن خویلد اُسدی'' ہے جس نے نبوت کا دعویٰ

کیا، اوراس کا خیال تھا کہ ذوالنون نامی شخص اس کے پاس وحی لیکر آتا ہے، لیکن اس نے اپنے لئے کسی قرآن کا دعویٰ نہیں کیا؛ کیوں کہ اس کی قوم کے لوگ فصحاء تھے، البتہ قوم نے طلحہ کی پیروی صرف اور صرف عصبیت اور جاہ وشہرت کو پانے کیلئے کی۔

''معجم البلدان'' کے مصنف فرماتے ہیں کہ اس کا کچھ کلام تھا جس کا اس نے دعویٰ کیا کہ وہ کلام اس پر وحی کے طور پر نازل ہوا ہے، اورانہیں (صاحب معجم البلدان) صرف اس کے اس کلام پر کامیابی حاصل ہوئی ہے: ''ان اللّٰہ لا یصنع بتعفیر وجوھکم، وقبح ادبار کم شیأً، فاذکروا اللّٰہ قیاما فان الرغوہ فوق الصریح''

ترجمہ: ''اللہ تعالیٰ تمہارے چہروں کے خاک آلود ہونے اور تمہارے کولہوں کے جھکنے سے کچھ نہیں کرتا، سو اللہ کو یاد کرو کھڑے ہو کر، اسلئے کہ جھاگ خالص شے کے اوپر ہوتی ہے''۔

اس کی مراد یہ تھی کہ رکوع سجدہ نہ کرو، اور نماز میں صرف قیام پر اکتفا کیا کرو، اور صرف حالت قیام میں ذکر اللہ پر قانع رہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس کی طرف خالد بن ولید کی قیادت میں ایک لشکر بھیجا، جب دونوں لشکر آپس میں گتھم گتھا ہو گئے تو اس کے پیروکاروں کی ایک بہت بڑی جماعت قتل ہوئی، جبکہ اس نے خود اپنے اوپر ایک چادر اوڑھ لی، اور وحی کا انتظار کرنے لگا، عیینہ نے اس سے کہا کہ کیا اب تک وہ شیطان تیرے پاس نہیں آیا؟ تو اس نے چادر کے نیچے سے ہی کہا کہ نہیں خدا کی قسم! ابھی تک وہ نہیں آیا ہے، اس پر عیینہ نے اس سے کہا کہ اس نے تجھے اس حال میں چھوڑا جبکہ تجھے اس کی زیادہ ضرورت تھی، پھر عیینہ نے کہا: ''اے بنی فزارہ یہ شخص جھوٹا ہے، ہمیں اور اسے اس کے مطلوب میں برکت نہ دی جائے، پھر طلحہ کو شکست ہوئی اور وہ شام کے مضافات کی طرف چلا گیا، اور کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد وہ ایمان لے آیا اور جنگ قادسیہ میں اس کا بہترین کردار رہا۔

د: نضر بن حارث: اور ان میں سے ایک ''نضر بن حارث'' ہے، وہ قریش کے سربرآوردہ لوگوں اور کفر وضلالت کے سرداروں میں سے تھا، اس نے نہ ہی نبوت کا دعویٰ کیا اور نہ ہی وحی کا لیکن اس کا گمان تھا کہ وہ قرآن کا معارضہ کرسکتا ہے، چنانچہ اس نے ایرانیوں اور عجم کے

بادشاہوں کے واقعات سے چند قصے گھڑے، اور وہ قریش کے پاس بیٹھ کر انہیں یہ قصے اور کہانیاں سناتا، پھر ان سے کہتا کہ یہ محمد پر نازل شدہ قرآن سے بہت بہتر ہے!

ھ: معری، متنبی اور ابن مقفع: روایات میں آتا ہے کا ''ابوالعلاء معری''، ''متنبی''، اور ''ابن المُقَفَّع'' نے بھی قرآن کے معارضہ کی کوشش کی، لیکن انہوں نے اس کوشش پر عمل ابھی شروع نہیں کیا تھا کہ وہ نادم ہوگئے اور انہیں شرمسار ہونا پڑا، چنانچہ انہوں نے قلم توڑ ڈالا، اور کاغذات پھاڑ ڈالے، ہم نے ماقبل میں ''ابن المقفع'' کی کاوش کا ذکر کیا تھا کہ معارضہ کا عزم کرنے اور اس پر عمل کرنے کے بعد اس نے ایک بچے کی آواز سنی کہ وہ اللہ کے اس کلام کی تلاوت کر رہا تھا: ﴿وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ وَقُضِيَ الْأَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُودِيِّ وَقِيلَ بُعْدًا لِلْقَوْمِ الظَّالِمِينَ ۝۴۴﴾ (هود: ۴۴)

ترجمہ: ''اور حکم ہوگیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان! تھم اور پانی گھٹ گیا اور قصہ ختم ہوا اور کشتی جودی پر آٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ کافر لوگ رحمت سے دور''۔

تو اس نے جو جمع کیا تھا پھاڑ ڈالا، ور اس نے لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے سے شرم محسوس کی، اور اس نے اپنا یہ مشہور قول کہا کہ: ''اللہ کی قسم! کسی انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ اس کی مثل لے آئے''۔

علامہ رافعی رحمہ اللہ ''ابن المقفع'' کا یہ قصہ ذکر کرنے کے بعد فرماتے ہیں: ''بلاشبہ ابن المقفع معارضہ کے ناممکن ہونے کو لوگوں میں سب سے زیادہ جاننے والے تھے، اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ بلیغ شخص تھے، اور جب آپ سے کہا جائے کہ فلاں شخص معارضہ کے امکان کا مدعی ہے، اس کیلئے دلیل قائم کرتا ہے اور اس میں جھگڑتا ہے تو آپ سمجھ لیں کہ وہ اس فن میں دو میں سے کوئی ایک شخص ہے: یا تو وہ جاہل ہے جو بزعم خود سچا ہے اور یا وہ عالم ہے جو لوگوں سے جھوٹ بولتا ہے، ان دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا آدمی بالکل نہیں ہوسکتا۔ تاہم علامہ رافعی رحمہ اللہ ''ابوالعلاء المعری'' کی طرح ''ابن المقفع'' سے بھی اس قصہ کے وقوع کے منکر ہیں، چنانچہ یہ دونوں روایتیں ان کی نظر میں باطل اور ان پر نرا بہتان ہے۔

و: بہائی اور قادیانی: اور زمانہ قریب ہمیں بتاتا ہے کہ بہائی اور قادیانی فرقے کے پیشواؤں نے چند کتابچے تحریر کیے تھے، ان کا گمان یہ تھا کہ وہ ان کے ذریعے قرآن کا معارضہ کریں گے، لیکن پھر لوگوں کے سامنے ان کتابچوں کے ظاہر کرنے میں خوف و پریشانی محسوس کی، اور مناسب وقت آنے کی امید پر انہیں چھپا دیا، تاکہ اسے جہالت کے عام ہونے اور عقلیں بہک جانے کے بعد نکال سکیں۔

اعجازِ قرآن کے بارے میں چند اعتراضات اور ان کے جوابات

۱- پہلا اعتراض: دشمنانِ اسلام قرآن اور صاحبِ قرآن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں دورانِ تنقید کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قرآن بحیرا راہب سے حاصل کر کے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی؛ تاکہ لوگوں کو اپنی تقدیس و احترام کے فریب میں پھنسا دے؟!

جواب: اس بہتان کے جھوٹ ہونے میں کوئی شک نہیں، اور اس طرح کی خرافات کو ترویج دینا انہی صلیب پرست بدطینتوں اور ان کے معاون ملحدین ہی کا کام ہے؛ تاکہ وہ مسلمانوں کی تعلیم یافتہ نسل کو تشویش میں مبتلا کر دیں، اور اس طرح شبہات اور بہتانوں کے ذریعے ان کے عقائد کو بگاڑ دیں، اور یہ شبہ چند باتوں کی بناء پر فاسد ہے:

۱- پہلی بات: آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شام کی طرف سفر کرنا صرف دو مرتبہ ثابت ہے: ایک مرتبہ بچپن میں اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ اور دوسری مرتبہ اپنی جوانی میں سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہا کے غلام "میسرہ" کے ساتھ۔ اور تاریخ اس بات سے خاموش ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے "بحیرا" سے سماع کیا ہو یا کوئی ایک سبق حاصل کیا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ بحیرا راہب نے جب بادل کو دیکھا کہ اس نے رسول پر سایہ کیا ہوا ہے تو اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو بتایا کہ اس بچہ کی عنقریب ایک عظیم شان ہوگی، اور ان سے درخواست کی کہ اسے مکہ کی طرف واپس لے جائیں؛ تاکہ مبادا انہیں یہود کی طرف سے کوئی ضرر نہ پہنچے۔

پھر کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ رسول نے بچپن کی عمر میں یہ علوم و معارف حاصل

کر لئے؟ یا اس معجز کلام کی طرح کلام لے آئے جبکہ وہ عمر کے دسویں سال میں بھی داخل نہیں ہوئے تھے؟!

اور دوسری مرتبہ سفر سے آپ کی غرض تجارت تھی، اور اس سفر میں آپ کی کسی راہب سے ملاقات بھی ثابت نہیں، لہٰذا ان کا یہ بہتان وافتراء کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے؟!

۲- **دوسری بات:** یہ بات از روئے عقل محال ہے کہ کوئی شخص کسی راہب سے صرف اتفاقی ملاقات سے دنیا کے استاذ کا یہ بلند مقام پالے، باوجود اس کے کہ پہلی مرتبہ وہ بچہ ہو، اور دوسری مرتبہ تاجر ہو، اور اسی طرح وہ کسی راہب سے صرف ایک یا دو مرتبہ ملنے کی بنا پر اپنے ناخواندہ ہونے کے باوجود یہ معجز کتاب لے آئے؟!

۳- **تیسری بات:** اگر بحیرا نامی یہ راہب قرآن کا منبع ہوتا تو نبوت ورسالت کے لائق وہ خود زیادہ ہوتا، یا اس کی بے مثال شخصیت دنیا کی نابغۂ روزگار شخصیتوں سے فائق ہوتی؛ کیوں کہ وہ ایسا کلام لے کر آیا تھا کہ جس نے اولین وآخرین سب کو عاجز کر دیا تھا؟!

۴- **چوتھی بات:** ہم کہتے ہیں کہ کفار قریش اور مشرکین عرب ان پاگلوں سے زیادہ عقلمند اور سلیم الفکر تھے؛ کیوں کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی تکذیب اور انہیں لاجواب کرنے کی حد سے زیادہ حرص کے باوجود بھی اپنے لیے اس گھٹیا جھوٹ کو پسند نہیں کیا۔ اور انہوں نے یہ کبھی نہیں سوچا کہ وہ کہیں کہ آپ علیہ السلام نے بحیرہ راہب سے صرف دو ملاقاتوں سے ہی یہ سب کچھ سیکھ لیا ہے؛ کیوں کہ عقل اسے آسانی سے قبول نہیں کرتی۔

۲- **دوسرا اعتراض:** یہ مادہ پرست لوگ کہتے ہیں کہ قرآن جبر نامی ایک رومی شخص کی تعلیمات سے ماخوذ ہے، جو آپ علیہ السلام نے مکہ میں اس سے حاصل کیں......؟!

جواب: اللہ تعالیٰ نے اس اعتراض کو بلیغ طریقے اور عمدہ بیان کے ساتھ رد کرنے کے معاملہ کو خود اپنے ذمہ لے کر فرمایا: ﴿ولقد...﴾

ترجمہ: ”اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھلا جاتا ہے، جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے اور یہ قرآن صاف عربی ہے“۔

یہ شخص جس کی طرف مشرکین عرب محمد ﷺ کو تعلیم دینے کی نسبت کرتے تھے وہ

ایک روم کا رہنے والا عجمی شخص تھا جو عربی زبان سے نابلد تھا، لہٰذا آپ علیہ السلام کو وہ قرآن کی تعلیم کیوں کر دے سکتا تھا؟ اور جبر نامی یہ شخص پیشہ ور لوہار تھا، اور ایمان لے آیا تھا، چنانچہ آپ علیہ السلام کا اکثر جب اس سے گذر ہوتا تو آپ علیہ السلام اس کے پاس بیٹھ جاتے، جس کی وجہ سے مشرکین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ بخدا! محمد کو یہ قرآن سکھانے والا جبر رومی ہی ہے، اور جبر کا آقا اسے مارتا اور کہتا کہ تم محمد کو سکھاتے ہو، تو وہ کہتا کہ نہیں! اللہ کی قسم! بلکہ وہ مجھے سکھاتے ہیں اور میری راہنمائی کرتے ہیں۔

اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ اس بہتان کو انتہائی نامانوس اور ضعیف ہونے کے باوجود بعض لوگوں کے ہاں اچھی پذیرائی ملی ہے، جبکہ استاذ کا غلام، لوہار، عجمی اور عربی زبان سے بالکل ناواقف ہونے کے باوجود رسول کو عربی زبان کی تعلیم دینا کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟ کیا یہ بات عقل تسلیم کر سکتی ہے کہ یہ رومی عجمی اس قرآن کا مرجع ہو جو کہ م عربی کلام کا سب سے عمدہ شاہکار ہے؟! بلکہ جو ایک عظیم معجزہ اور عربی زبان اور اہل عرب کے لیے باعث فخر ہے!! اسی وجہ سے قرآن نے انہیں لاجواب اور ناقابل تردید جواب دیا ہے: ﴿لِسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ إِلَيْهِ أَعْجَمِيٌّ وَهَٰذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِينٌ﴾

۳- تیسرا اعتراض: بلاشبہ محمد ﷺ کی شخصیت منفرد اور عبقری شخصیت تھی، اور یہ کیوں نہیں ہو سکتا کہ ان اخبار کا منبع یہی غیر معمولی عبقریت ہو، اور یہ قرآن محمد ﷺ کی ترتیب وتالیف ہو؛ کیوں کہ وہ ایک بلند شخصیت کے مالک تھے؟

جواب: یہ بات کسی ایسے جاہل شخص کے منہ سے ہی نکل سکتی ہے جو کہ حضور ﷺ کی زندگی کے بارے میں کچھ جانتا ہو، اور نہ ہی آپ ﷺ کی قوم اور قبیلہ کی تاریخ سے واقف ہو، چنانچہ رسول اللہ ﷺ ۴۰ سال تک اپنی قوم کے درمیان اس طرح رہے کہ آپ ﷺ کی طرف صداقت وامانت، اور عزت وشرافت میں انگلیوں کے ذریعے اشارہ کیا جاتا تھا (یعنی آپ علیہ السلام صداقت وامانت، اور عزت وشرافت میں لوگوں کے درمیان معروف تھے) یہاں تک کہ مشرکین بھی آپ کو "الصادق الامین" کے لقب سے پکارنے لگے، لہٰذا اس شریفانہ اور پاکباز زندگی کے بعد عقل یہ گوارا کر سکتی ہے کہ وہ ایک عظیم من گھڑت کلام لا کر یہ دعوی کرتے کہ یہ قرآن اللہ کی طرف سے ہے اور وہ اللہ کے رسول ہیں؟

نیز انسان کی ابتدا اس کی انتہا پر دلالت کرتی ہے، لہٰذا رسول کی معزز اور عیب سے پاک تاریخ اور باکمال و معطر زندگی کے ساتھ اس جھوٹ کا ملاپ کیوں کر ہوسکتا ہے؟ جب روم کے بادشاہ ہرقل نے ابوسفیان (جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے اور انکا شمار رؤسائے مشرکین میں ہوتا تھا) سے رسول اللہ ﷺ کے متعلق پوچھا کہ: ''کیا تم لوگ اسے ان باتوں کے کہنے سے پہلے بھی جھوٹا کہتے تھے؟'' تو ابوسفیان نے جواب میں یہ کہا کہ'' نہیں! بلکہ وہ تو ہمارے ہاں صادق اور امین ہیں''۔ تو ہرقل نے کہا کہ: ''یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ لوگوں پر جھوٹ نہ باندھے اور اللہ پر جھوٹ کہے؟''۔

اور دوسرے پہلو سے دیکھا جائے تو تاریخ میں یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ محمد ﷺ امی تھے، پڑھنا لکھنا نہ جانتے تھے، اور اس قرآن نے بھی اپنے ان الفاظ کے ساتھ اس بات کی توثیق کردی ہے: ﴿وما کنت...﴾

ترجمہ: ''اور آپ اس کتاب سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھے ہوئے تھے اور نہ کوئی کتاب اپنے ہاتھ سے لکھ سکتے تھے کہ ایسی حالت میں یہ حق ناشناس لوگ کچھ شبہ نکالتے''۔

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے انبیاء و مرسلین کی باتوں، انتہائی دقت اور تفصیل کے ساتھ تاریخ کی باریکیوں، گزشتہ امتوں کے احوال اور سابقہ لوگوں کی خبروں کا علم کیسے ہوسکتا تھا جبکہ انہوں نے ابھی تک کوئی کتاب نہیں پڑھی تھی؟! اور نہ ہی کسی علم کو سیکھا تھا؟! اور نہ ان خبروں کو اہل کتاب کے کسی عالم سے حاصل کیا تھا؟!

نیز جب کسی انسان کی خداداد صلاحیتیں بے مثال ہوں اور علم و فن میں زبردست مہارت اور ذکاوت بھی وافر مقدار میں ہو پھر بھی غیب کی باتوں اور مستقبل کے احوال سے اس کی واقفیت و آگہی کیسے ہوسکتی ہے؟ اور کسی انسان کیلئے ممکن نہیں خواہ وہ کتنا ہی بلند ہو کہ وہ غیب کی باتیں اس طور پر بتائے کہ مغیبات میں سے کوئی ایک بھی اس کی خبر کے خلاف واقع نہ ہو مگر یہ کہ وہ رسول صادق ہو اور اللہ کی جانب سے اس کی طرف وحی آتی ہو۔ بلاشبہ عقل اس بات کی توثیق کرتی ہے کہ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں اور عبقریت، مہارت وذکاوت کے جس درجہ تک بھی پہنچ جائے اور شخصیت جس قدر بھی قوی اور مثالی ہو لیکن وہ

طاقت نہیں رکھتا کہ غیب کے پردوں کو چاک کر ڈالے یا غیر مقدور چیز کی خبر دے۔

اور اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا ہے:﴿ کذلك... ﴾

ترجمہ:''(جس طرح ہم نے موسیٰ کا قصہ بیان کیا) اسی طرح ہم آپ سے اور واقعات گزشتہ کی خبریں بھی بیان کرتے رہتے ہیں اور ہم نے آپ کو اپنے پاس سے ایک نصیحت نامہ دیا ہے (یعنی قرآن)''۔

۴-چوتھا اعتراض: کہتے ہیں کہ انسان کا قرآن کی مثل لانے سے عاجز آنا دلالت نہیں کرتا کہ وہ اللہ کا کلام ہے، یہ تو اسی طرح ہے جیسا کہ کلام نبوی کی مثل لانے سے لوگوں کا عاجز ہونا ہے، تو کیا رسول کا کلام بھی اللہ کی طرف سے ہے؟ یا یہ کہا جائے گا کہ وہ کلام اللہ ہے؟

جواب: بے شک حدیثِ نبوی کی مثل لانے سے اگرچہ عام لوگ عاجز ہیں لیکن خواص اس کے بعض حصہ کی مثل لانے سے عاجز نہیں اگرچہ وہ بعض ایک حدیث یا اس کے کلام کی ایک سطر کیوں نہ ہو، اور رسول اللہ ﷺ کا کلام اگرچہ فصاحت و بلاغت کے بلند مرتبہ پر ہے لیکن پھر بھی وہ بشر کا کلام ہونے سے نہیں نکلتا۔

اور کبھی ایک انسان کا کلام دوسرے سے مشابہ ہو جاتا ہے، اسی لئے ہم نبی کے کلام اور بعض خاص صحابہ کے کلام میں مشابہت پاتے ہیں، ہم حدیث سنتے ہیں تو معاملہ ہم پر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ آیا یہ حدیث مرفوع ہے جو آپ علیہ السلام تک پہنچتی ہے؟ یا موقوف ہے صحابی پر یعنی اس کا کلام ہے؟ اور یا یہ مقطوع ہے تابعی پر یعنی اس کا کلام ہے؟ اور جب تک سند بعینہ اس کے قائل تک پہنچنے میں ہماری راہنمائی نہ کرے تو ہم تمیز نہیں کر سکتے، اور جس کو حسنِ بیانی سے نوازا گیا ہے وہ یہ التباس بہت زیادہ پاتا ہے، اور جب ہم فصحائے عرب میں سے کسی ایک کا عمدہ اور بلیغ کلام سنتے ہیں تو معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور ہم اسے رسول اللہ ﷺ کا کلام خیال کر لیتے ہیں۔

جب یہ بات ہے تو کبھی کبھی یہاں پر عربی زبان کی فصیح ترین شخصیت حضرت محمد ﷺ کے کلام اور بعض دوسرے ماہرین کے کلام میں کچھ التباس سا ہو جاتا ہے، مثلاً اس بہترین جملے کی طرف کان دھریں: ''المعدة بيت الداء، والحمية رأس كل دواء، وعودوا كل جسم ما اعتاد''۔

ترجمہ: ''معدہ بیماریوں کا گھر ہے، اور پرہیز ہر دوا کی اصل ہے، اور ہر جسم کو اس چیز کا عادی بناؤ جس کا وہ عادی ہے''۔

چنانچہ جب کوئی شخص اس جملے کو سنتا ہے تو اس کے حسن، صحت اور دلکش اسلوب کی وجہ سے اس کا حدیث ہونا محال نہیں سمجھ سکتا۔ اور کبھی تو یقین کر لیتا ہے کہ وہ حدیث شریف ہے، باوجود اس کے کہ یہ حدیث نہیں بلکہ یہ تو عرب کے مشہور طبیب ''ابن کلدہ'' کا کلام ہے، البتہ قرآن کی ایک الگ شان ہے وہ کسی بھی کلام کے ساتھ ملتبس نہیں ہوتا، اور آپ ہرگز اس کی مثل اور نظیر نہیں پا سکتے؛ کیوں کہ جس ذات نے اسے اپنی نگہداشت میں بنایا ہے تم اس کی نظیر اور مثل نہیں تلاش کر سکتے، لہٰذا اس مقام میں قرآن کریم کو حدیث پاک پر کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ اگر یہ قرآن محمد ﷺ کی تالیف ہوتا تو ضروری تھا کہ قرآن وسنت دونوں میں اسلوب ایک ہوتا؛ کیوں کہ وہ ایک ہی شخص کے منہ سے نکلے تھے، جس کی استعداد بھی ایک اور مزاج بھی ایک ہے، لیکن اس کے باوجود ہم ان دونوں کے درمیان واضح فرق اور بون بعید دیکھتے ہیں، چنانچہ اسلوبِ قرآن ایک ایسی نوع ہے جس پر الوہیت و ربوبیت کی علامات ہویدا ہیں جو کہ مشابہت و مماثلت سے بالکل دور ہیں، اور اسلوبِ حدیث ایک دوسری نوع ہے جو مشابہت و مماثلت سے مبرا نہیں ہے، بلکہ وہ فضائے بیان میں عالی شان بشری اسالیب کے بقدر منڈلا رہی ہے، اور کسی صورت میں بھی وہ اعجاز قرآن کے آکاش کی طرف نہیں چڑھ سکتی، اور اس بات کا ادراک ہر انسان کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ دونوں اسلوبوں کے درمیان وسعتِ نظری سے موازنہ کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے بالکل سچ فرمایا ہے: ﴿وَلَوْ اَنَّ مَا فِي الْأَرْضِ...﴾

ترجمہ: ''اور جتنے درخت زمین بھر میں ہیں اگر وہ سب قلم بن جائیں اور یہ جو سمندر ہے اس کے علاوہ سات سمندر اس میں اور شامل ہو جائیں تو اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں، بے شک خدا تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے''۔

نیز ارشاد فرمایا: ﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا﴾ (الاسراء: ۸۸)

ترجمہ: ''آپ فرما دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات اس بات کے لیے جمع ہو جاویں کہ ایسا قرآن بنا لاویں تب بھی ایسا نہ لا سکیں گے، اور اگرچہ ایک دوسرے کا مددگار بھی بن جاوے''۔

☆☆......☆☆

گیارہویں فصل

قرآنی سورتوں کے فضائل میں موضوع احادیث پر تنبیہ کا بیان

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''الجامع لاحکام القرآن'' کے مقدمہ میں قرآنی سورتوں کے فضائل میں وارد موضوع احادیث پر تنبیہ کے باب میں درج ذیل کلام فرمایا ہے:

''قرآنی سورتوں کے فضائل میں اور دیگر دوسرے اعمال کے فضائل میں جو جھوٹی احادیث اور باطل روایات وضع کرنے والوں نے وضع کی ہیں اور گھڑنے والوں نے گھڑی ہیں نا قابل التفات ہیں، لوگوں کی کثیر جماعت نے اس کا ارتکاب کیا ہے، اس عمل سے ان کی مختلف اغراض ومقاصد ہیں:

۱- ان میں سے ایک گروہ زنادقہ کا ہے جیسے مغیرہ کوفی اور مصلوب محمد شامی وغیرہ کہ انہوں نے احادیث گھڑیں اور پھر انہیں بیان کرنے لگے؛ تاکہ وہ اس کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں شک پیدا کردیں۔ ان من گھڑت روایتوں میں ایک روایت وہ بھی ہے جسے شامی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''میں خاتم النبیین ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا مگر جسے اللہ چاہے''۔ چنانچہ اس نے اپنے اس الحاد وزندقہ کی تائید کیلئے جس کی وہ وہ دعوت دیتا تھا آخر میں اس استثنا (مگر جسے اللہ چاہے) کا اضافہ کرلیا!

۲- ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس نے خواہش نفس کی تسکین کے لیے کہ جس کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے تھے احادیث کو وضع کیا۔ خوارج کے مشائخ میں سے ایک شخص نے تائب ہونے کے بعد کہا کہ بے شک یہ احادیثِ نبویہ دین (کا حصہ) ہیں، لہٰذا تم جس سے اپنا دین حاصل کررہے ہو اسے ضرور جانچو؛ کیوں کہ ہم جب کسی بات کو پسند کرتے تو اسے حدیث بنالیتے۔

۳-اور ان میں سے ایک فریق وہ ہے جس نے بزعم خویش ثواب کی نیت سے احادیث کو گھڑ کر لوگوں کو فضائل اعمال کی طرف بلایا، جیسا کہ اُبوعصمہ مروزی سے مروی ہے کہ ان سے جب پوچھا گیا کہ آپ کے پاس قرآن کی ہر ہر سورت کے فضائل کے بارے میں ''عن عکرمۃ عن ابن عباسؓ'' کی سند کہاں سے آئی ؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ میں نے جب لوگوں کو دیکھا کہ وہ قرآن سے اعراض کرنے لگے ہیں اور اُبوحنیفہ کی فقہ اور ابن اسحٰق کی مغازی میں مشغول ہو گئے ہیں، تو میں نے ثواب کی امید سے احادیث گھڑ لیں۔

ابن صلاح رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اسی طرح وہ لمبی حدیثیں جو قرآن کی ہر ہر سورت کے فضائل میں نبی ﷺ سے اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کے واسطے سے روایت کی جاتی ہیں سب موضوع ہیں، جب ایک محقق نے ان احادیث کے مخرج کا کھوج لگانا شروع کیا تو بالآخر وہ اس شخص تک پہنچ گئے جس نے اعتراف کیا کہ انہیں اس نے خود اور ایک جماعت نے گھڑا ہے۔ ان احادیث کے موضوع ہونے کا اثر ان پر بالکل نمایاں ہے، مفسر واحدی اور دوسرے وہ مفسرین جنہوں نے انہیں اپنی تفاسیر میں ذکر کیا ہے بلاشبہ بہت بڑی غلطی کی ہے۔

۴-ان میں سے ایک گروہ گداگروں کا بھی ہے جو بازاروں اور مسجدوں میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور از بر یاد کی ہوئی صحیح سند ذکر کر کے احادیث گھڑ کر رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کر لیتے ہیں، چنانچہ وہ ان صحیح اسناد کے ذریعے موضوع احادیث بیان کر لیتے ہیں۔

جعفر بن طیالسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''اُحمد بن حنبل اور یحیی بن معین رحمہما اللہ نے ''رصافہ'' کی ایک مسجد میں نماز پڑھی تو نماز کے بعد ان کے درمیان ایک قصہ گو راوی اُٹھ کھڑا ہوا، اور کہنے لگا کہ: ''ہمیں اُحمد بن حنبل اور یحیی بن معین نے بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمیں عبدالرزاق نے بتایا اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں معمر نے خبر دی اور انہوں نے قتادہ سے اور قتادہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے سنا کہ انہوں نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص نے ''لا الہ الا اللہ'' کہا تو کلمہ کے ہر ہر حرف سے ایک پرندہ پیدا کیا جاتا ہے جس کی چونچ سونے کی اور پر مرجان کے ہوتے ہیں''۔ اور بیس صفحات کے بقدر روایت سنا ڈالی، امام اُحمد بن حنبل، یحیی بن معین کی طرف

اور یحیی بن معین امام احمد کی طرف دیکھنے لگے تو ہر ایک نے دوسرے سے کہا کہ کیا تم نے اس کو یہ روایت سنائی ہے تو دوسرے نے کہا کہ بخدا! یہ روایت تو میں نے خود بھی ابھی ہی سنی ہے، چنانچہ دونوں خاموش ہو گئے۔ جب وہ قصہ گو اپنے قصہ سے فارغ ہو گیا تو یحیی نے اس سے کہا کہ تم سے یہ حدیث کس نے بیان کی ہے؟ تو اس قصہ گو نے کہا کہ احمد بن حنبل اور یحیی بن معین نے، اس پر یحیی بن معین نے فرمایا کہ میں ابن معین ہوں اور یہ احمد بن حنبل ہیں، ہم نے تو یہ قصہ حدیثِ رسول ﷺ میں کبھی نہیں سنا، اگر جھوٹ بولنا ضروری ہی ہے تو ہمارے علاوہ کسی اور پر بولو، اس قصہ گو نے یحیی سے پوچھا کہ کیا آپ یحیی بن معین ہیں؟ انہوں نے فرمایا: جی ہاں! تو اس شخص نے کہا کہ میں سنتا رہتا تھا کہ یحیی بن معین احمق آدمی ہیں اور مجھے اس بات کا علم اب جا کر حاصل ہوا! یحیی نے اُس سے پوچھا کہ تو نے کیسے جان لیا کہ میں احمق ہوں؟ قصہ گو کہنے لگا کہ ایسا لگتا ہے کہ دنیا میں تم دونوں کے سوا کوئی دوسرا یحیی بن معین اور احمد بن حنبل ہے ہی نہیں! میں نے اس احمد بن حنبل کے علاوہ سترہ دیگر اشخاص سے احادیث لکھی ہیں جن کا نام احمد بن حنبل تھا"۔

جعفر کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر احمد بن حنبل نے اپنی آستین کو اپنے چہرے پر رکھ دیا اور کہا کہ اس شخص کو چھوڑ دو کہ وہ اُٹھ ہو جائے، تو وہ ان دونوں سے اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسا کہ ان حضرات کا مذاق اڑا رہا ہو۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"چنانچہ یہ گروہ اور جو بھی ان کی روش پر چلے رسول اللہ ﷺ پر بہتان باندھنے والوں کا گروہ ہے، پھر آگے فرمایا کہ اگر لوگ صحاح و مسانید وغیرہ کی ان تصنیفات پر بھی اکتفا کر لیں جو علماء میں متداول اور ائمۂ فقہ سے مروی ہیں تو اس میں ان کیلئے کفایت ہو جائے اور حضور ﷺ کی اس وعید سے نکل جائیں: "جس نے مجھ پر جان بوجھ کر جھوٹ باندھا تو اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے"۔

پس آپ دشمنانِ دین، اور زنادقۂ مسلمین کی ترغیب و ترہیب وغیرہ کے باب میں گھڑی ہوئی احادیث سے دور رہیں، اِن وضّاعین میں سب سے زیادہ نقصان دہ وہ لوگ

ہیں جو زہد کی طرف منسوب ہیں، انہوں نے جس معاملہ میں بھی کچھ خیال کیا ثواب کی نیت سے احادیث گھڑ لیں، پھر لوگوں نے اُن پر اعتماد اور اُن کی طرف میلان کی بنا پر اُن کی موضوع احادیث کو بھی قبول کر لیا، اسی لئے خود بھی وہ گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا۔

کیا قرآن میں غیر عربی الفاظ بھی ہیں؟ یہ بات یقینی ہے کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا، اور یہ عربی کتاب ہے جو عرب قوم پر صاف عربی زبان میں اتری؛ تا کہ ان کیلئے راہِ حیات اور ان کے معاشرے کے لیے ضابطۂ عمل ہو، اور تا کہ لوگ اس سے عبرت ونصیحت پکڑیں: ﴿لیدبروا...﴾

ترجمہ: ''تا کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور تا کہ اہل فہم نصیحت حاصل کریں''۔

اور بہت سارے نصوص قرآنیہ اس بات پر موجود ہیں کہ قرآن اپنے نظم، لفظ، اسلوب اور ترکیب میں عربی ہے، اور اس میں ایسی کوئی چیز نہیں جو کہ مفردات، جملوں، اسلوب اور خطاب میں عرب کے طریقہ کے مخالف ہو، اِن نصوص کریمہ میں سے بعض درج ذیل ہیں:

۱-فرمان الٰہی ہے: ﴿لِتَكُونَ مِنَ الْمُنْذِرِينَ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ﴾

ترجمہ: ''تا کہ آپ (بھی) منجملہ ڈرانے والوں کے ہوں، (یہ قرآن) صاف عربی زبان میں ہے''۔

۲-ارشاد پاک ہے: ﴿کتب...﴾

ترجمہ: ''یہ ایک کتاب ہے جس کی آیتیں صاف صاف بیان کی گئی ہیں یعنی ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان) میں ہے ایسے لوگوں کے لیے (نافع) ہے جو دانشمند ہیں''۔

۳-ارشاد ربانی ہے: ﴿انا أنزلناه...﴾

ترجمہ: ''ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تا کہ تم سمجھو''۔

۴-فرمان الٰہی ہے: ﴿قرانا...﴾

ترجمہ: ''وہ عربی زبان میں ہے جس میں ذرا کجی نہیں (اور) تا کہ یہ لوگ ڈریں''۔

علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ قرآن عربی ہے، لیکن اس میں ان کا اختلاف ہے کہ آیا قرآن میں کلامِ عرب کے علاوہ مفرد الفاظ موجود ہیں یا نہیں؟ اس میں علماء کے دو مذہب ہیں:

اَلف۔ پہلا مذہب: یہ جمہور کا مذہب ہے، اور ان میں سرفہرست قاضی اَبوبکر ابن طیب، شیخ المفسرین ابن جریر طبری، علامہ باقلانی اور ان کے علاوہ دیگر کبار علمائے کرام ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ قرآن تمام کا تمام عربی ہے، اس میں غیر عربی الفاظ یا مفردات نہیں، اور اس میں پائے جانے والے وہ الفاظ جو دیگر سب لغات کی جانب منسوب ہیں تو ان میں اتفاقاً لغات کا یکساں استعمال ہوا ہے، چنانچہ ان الفاظ پر عرب، اہلِ فارس اور حبشیوں وغیرہ سب نے تکلم کیا ہے۔

ب۔ دوسرا مذہب: یہ علماء کے ایک گروہ کا مذہب ہے، اُن کہنا ہے کہ قرآن میں بعض الفاظ غیر عربی ہیں، اور یہ الفاظ اپنی قلت کی وجہ سے قرآن کو فصیح عربی ہونے سے نہیں نکالتے، مثلاً:

- لفظِ ''مشکوٰۃ'' ہے جو ''طاق'' کے معنٰی میں ہے۔
- لفظِ ''کفیل'' ہے جو ''ضعف'' کے معنٰی میں ہے۔
- اور لفظِ ''قسورۃ'' ہے جو ''شیر'' کے معنی میں ہے۔ یہ سب الفاظ حبشی زبان کے ہیں جو کہ غیر عربی الفاظ ہیں۔
- اور اسی طرح لفظِ ''قسطاس'' ہے جو رومی زبان میں ''ترازو'' کے معنی میں ہے۔
- لفظِ ''سجیل'' ہے جو ایرانیوں کی زبان میں ''کنکری اور گارے'' کے معنی میں ہے۔
- لفظِ ''غساق'' ہے جو ترکی زبان میں ''بدبودار ٹھنڈی چیز'' کے معنٰی میں ہے۔
- اور سریانی زبان میں لفظِ ''یم'' ہے جو ''سمندر'' کے معنٰی میں ہے۔
- اور لفظِ ''طور'' ہے جو ''پہاڑ'' کے معنٰی میں ہے۔

ابن عطیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس عبارت کی حقیقت یہ ہے کہ یہ الفاظ اصل میں عجمی ہیں لیکن عربوں نے انہیں استعمال کیا اور انہیں عربی زبان کی طرف منتقل کر دیا، چنانچہ یہ الفاظ اس اعتبار سے عربی ہیں، عرب کا ہر قسم کی زبان والوں ہمسایوں سے میل جول تھا، اسی بنا پر عربوں کی بعض عجمی الفاظ سے وابستگی ہوئی اور انہوں نے ان الفاظ کو اپنے

اشعار و محاورات میں استعمال کرنا شروع کیا یہاں تک کہ وہ صحیح عربی کے قائم مقام ہو گئے اور اسی حد پر قرآن ان الفاظ کو لے کر اُترا۔

جمہور کے دلائل: جمہور کا استدلال ان بعض دلائل سے ہے جو یہ ثابت کرتے ہیں کہ قرآن عربی ہے اور اس میں غیر عربی الفاظ موجود نہیں، البتہ اس میں ان اشخاص کے نام ضرور موجود ہیں جن کی زبان عربی نہ تھی، جیسے اسرائیل، جبرئیل، عمران، نوح اور لوط وغیرہ۔

جمہور درج ذیل دلائل سے استدلال کرتے ہیں:

۱-پہلی دلیل: وہ مذکورہ قرآنی آیات ہیں جنہوں نے یہ ثابت کر دیا کہ قرآن اپنے لفظ و اسلوب اور نظم و ترکیب میں سارے کا سارا عربی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے عربی ہونے کی خبر دیتے ہوئے فرمایا: ﴿قرانا عربیا﴾ اور یہ لفظ متعدد آیات میں بار بار آیا ہے، اور یہ بات معلوم ہے کہ لفظِ قرآن عام ہے جو کہ تمام سورتوں اور آیات کو شامل ہے، نیز تمام الفاظ و مفردات کو بھی شامل ہے۔

۲-دوسری دلیل: بے شک قرآن عربی زبان میں نازل ہوا تا کہ وہ اسے سمجھیں، اس کی حقیقت کو جانیں اور اس کے معانی میں غور کریں، اور یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم سے ایسی زبان میں خطاب فرمائیں جسے وہ نہ سمجھتی ہو، یہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ آیات اس کے عربی زبان میں نصیحت و عمل کے لیے نازل ہونے پر صراحۃً دلالت کرتی ہیں: ﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ ''ہم نے اس کو اتارا ہے قرآن عربی زبان کا تا کہ تم سمجھو''۔ اور اسی طرح ارشاد ہے: ﴿قرانا عربیا لقوم یعلمون﴾ ''ایسا قرآن ہے جو عربی (زبان) میں ہے ایسے لوگوں کے لیے (نافع) ہے جو دانشمند ہیں''۔ اور یہ آیات قرآن میں غیر عربی الفاظ ہونے کی نفی کر رہی ہیں۔

۳-تیسری دلیل: جب مشرکین نے دعویٰ کیا کہ محمد ﷺ نے یہ قرآن اہل کتاب میں سے ایک جبر رومی نامی شخص سے حاصل کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین پر رد فرمایا، اور ان پر زبانوں کے اختلاف کے ذریعے حجت قائم کی اور فرمایا: ﴿ولقد نعلم......﴾

ترجمہ: '' اور ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ ان کو تو آدمی سکھلا جاتا ہے، جس شخص کی طرف اس کی نسبت کرتے ہیں اس کی زبان تو عجمی ہے

اور یہ قرآن صاف عربی ہے"۔

پس قرآن عربی ہے اور وہ رومی عجمی ہے، اور دونوں کے درمیان زمین وآسمان کا فرق ہے؟

۴-**چوتھی دلیل:** اگر قرآن میں عربی زبان کے سوا کوئی لفظ موجود ہوتا یا ایسی بات ہوتی جسے عرب نہ سمجھ سکتے یا عجمی الفاظ ہوتے تو مشرکین قرآن پر اپنا یہ اعتراض (یعنی کتاب عجمی ہے اور رسول عربی ہے) بانگ دہل کرتے اور اس کے ذریعے سے رسول اللہ ﷺ کے سچا نہ ہونے پر استدلال کرتے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے: ﴿ولو جعلنٰه...﴾

ترجمہ: "اور اگر ہم اس کو عجمی (زبان کا) قرآن بناتے تو یوں کہتے کہ اسکی آیتیں صاف صاف کیوں نہیں بیان کی گئیں یہ کیا بات کہ عجمی کتاب اور عربی رسول"۔

۵-**پانچویں دلیل:** تاہم قرآن میں ایسے الفاظ کا پایا جانا جو دیگر تمام زبانوں کی طرف منسوب ہیں تو وہ لغات کی بلاقصد یکسانیت اور توافق استعمال ہونے کی قبیل سے ہے، مطلب یہ ہے کہ اس لفظ کو عرب نے بھی بولا ہے اور اہل فارس، اہل عجم وغیرہ نے بھی اس پر تکلم کیا ہے، چنانچہ یہ ایسا لفظ ہے جس پر کئی لغات کا توافق ہو چکا ہے، اور اس کا یہ معنی نہیں کہ یہ الفاظ غیر عربی ہیں، تاہم جب اسے عرب نے بولا تو عربی بن گیا اور جب اس پر غیر عرب نے تکلم کیا یا عجمیوں نے اسے استعمال میں لایا تو اسے یہ بات عربی ہونے سے نہیں نکالے گی۔

ترجیح: صحیح بات وہی ہے جسے ابن جریر طبری رحمہ اللہ اور نے جمہور علماء نے اختیار کیا ہے کہ قرآن تمام کا تمام عربی ہے، اور اسی بات کی وہ بے شمار نصوص اور نا قابل تردید مضبوط دلائل شہادت دیتے ہیں جن کے ذریعے جمہور علماء نے استدلال کیا ہے۔

علامہ قرطبی رحمہ اللہ نے بھی جمہور کی رائے کی تصدیق کی ہے، جبکہ دوسرے فریق کی رائے کو رد کیا ہے، دونوں مذہبوں کے ذکر کرنے کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ:

"پہلا مذہب اُصح ہے: کیوں کہ عرب دو حال سے خالی نہیں یا تو اُن سے اِن الفاظ کے ذریعے خطاب فرمایا گیا ہے یا نہیں؟ تاہم اگر پہلی بات ہے تو وہ الفاظ ان کے کلام کا حصہ ہوں گے اور یہ بات بھی بعید نہیں کہ غیر عرب اپنے بعض کلمات میں عرب کے موافق ہو گئے ہوں۔ اور اگر ان الفاظ کے ذریعے عرب سے خطاب

نہیں فرمایا گیا اور نہ وہ یہ سمجھتے تھے تو یہ بات محال ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن سے ایسی زبان میں خطاب فرمائیں جسے وہ نہ سمجھتے ہوں، اور تب تو قرآن عربی نہ رہے گا، اور نہ ہی رسول اللہ ﷺ اپنی قوم سے ان کی زبان میں مخاطب ہوں گے"۔

ترجمۂ قرآن کی بحث

ترجمہ کا مطلب: ترجمۂ قرآن کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو غیر عربی اجنبی زبانوں کی طرف منتقل کرنا اور اس ترجمہ کو متعدد نسخوں میں چھاپنا؛ تاکہ قرآن کی زبان عربی کو نہ جاننے والا اس ترجمہ سے واقف ہو جائے، اور اس ترجمہ کے ذریعے کتاب اللہ سے اللہ عزوجل کی مراد کو سمجھ لے۔

ترجمہ کی اقسام: یہ ترجمہ دو قسموں پر تقسیم ہوتا ہے:

۱-حرفی ترجمہ۔ ۲-تفسیری ترجمہ۔

پہلی قسم (حرفی ترجمہ) سے مراد یہ ہے کہ قرآن کا بمع اس کے الفاظ ومفردات، جملوں اور ترکیبوں کے انگریزی یا جرمنی یا فرانسیسی زبان وغیرہ میں ایسا ترجمہ کیا جائے جو اصل کے مطابق ہو، پھر یوں کہا جائے کہ قرآن (بزبان انگریزی) یا قرآن (بزبان جرمنی) وغیرہ۔ اور یہ ترجمہ ایک ہم معنی لفظ کو اس کے دوسرے ہم معنی لفظ کی جگہ رکھنے کی مانند ہے، اور بعض حضرات اس ترجمہ کو "لفظی ترجمہ" بھی کہتے ہیں۔

البتہ دوسری قسم (تفسیری ترجمہ) کا مطلب یہ ہے کہ آیات مبارکہ کا اس طور پر ترجمہ کرنا کہ انسان اس میں الفاظ کا پابند نہ ہو، اس کے پیش نظر صرف معنی ہو، چنانچہ وہ قرآن کا ترجمہ ایسے الفاظ کے ساتھ کرے جن میں وہ قرآن کے مفردات وتراکیب کی پابندی نہ کرے، بلکہ وہ صرف اصل معنی کی طرف توجہ دے، اسے پہلے سمجھے پھر اسے دوسری ترجمہ والی زبان کے سانچے میں ڈھال دے، اور یہ معنی ومفہوم اپنے نفس کو ہر ہر مفرد اور ہر ہر لفظ کی تحقیق ومعرفت کی مشقت میں ڈالے بغیر صاحبِ اصل کی مراد کے موافق ہو، ترجمہ کی اس قسم کو "تفسیری ترجمہ" یا "معنوی ترجمہ" کہا جاتا ہے۔

ترجمہ کی شرائط: ترجمہ خواہ حرفی ہو یا تفسیری اس کی چند شرائط ہیں، جنہیں ہم ذیل میں

اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہیں:

۱-مترجم (بکسر الجیم) اصل اور ترجمہ دونوں کی زبانوں کو بیک وقت جانتا ہو۔

۲-مترجم ان زبانوں کی خصوصیات و اسالیب سے واقف ہو جن میں ترجمہ کرنا چاہ رہا ہے۔

۳-ترجمہ کے الفاظ صحیح ہوں، بایں معنی کہ ان کا اصل کے قائم مقام ہونا ممکن ہو۔

۴-ترجمہ اصل کے تمام مقاصد و مطالب کی ادائیگی مکمل طریقہ سے کرے۔

اسی طرح حرفی ترجمہ کیلئے ان شرائط کے علاوہ مزید دو شرائط لگائی جاتی ہیں:

۱-ترجمہ کی زبان میں تمام مفردات کا پایا جانا جو کہ اصل کی زبان کے مفردات کے مساوی ہوں۔

۲-دونوں زبانوں کا پوشیدہ ضمائر اور مرکب بنانے کیلئے جملوں کو ملانے والے حروفِ رابطہ میں یکساں ہونا۔

کیا قرآن کا لفظی ترجمہ جائز ہے؟ ترجمہ کی حرفی اور تفسیری کی طرف تقسیم، دونوں میں سے ہر ایک کا مطلب اور ترجمہ میں ضروری طور پر پائی جانے والی شرائط کی معرفت کے مذکورہ کلام کی روشنی میں ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حرفی ترجمہ ناجائز اور غیر صحیح ہے، اور یہ عدم جواز مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر ہے:

۱) عربی زبان کے حروف کے بغیر قرآن کا لکھنا جائز نہیں تا کہ قرآن تحریف و تبدیل کا شکار نہ ہو۔

۲) غیر عربی زبانوں میں وہ الفاظ و مفردات اور ضمائر نہیں جو عربی الفاظ کے قائم مقام بن سکیں۔

۳) صرف الفاظ پر اکتفا کرنا کبھی کبھی معنی کو بگاڑ دیتا ہے، اور تعبیر و نظم میں خلل کا سبب بنتا ہے۔

ہمیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں معنی و تعبیر کے بگاڑ کی چند مثالیں پیش کر دیں تا کہ معاملہ خوب واضح ہو جائے، پس ہم کہتے ہیں کہ اگر ہم اس ارشاد ربانی کا ترجمہ کرنا چاہیں: ﴿ولا تجعل یدك مغلولة الی عنقك، ولا تبسطها کل البسط

﴿فتقعد ملوما محسورا﴾(۱) تو اگر ہم اس کا لفظی ترجمہ کرنا چاہیں تو ترجمہ یوں ہوگا: ''نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ اور نہ کھول دے اس کو بالکل کھول دینا''۔ جبکہ یہ معنی فاسد ہے قرآن کی اس سے یہ مراد نہیں، بلکہ مترجم کبھی تو اس طرح کے ترجمہ کو خود برا سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں گردن کے ساتھ ہاتھ باندھنے یا بالکل کھول دینے سے کیوں منع کرتے ہیں؟! حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں آنے والی تعبیر تو فضول خرچی اور بخل کا انجام بیان کرنے کی تشبیہ کی قبیل سے ہے۔ اور یہ نہایت عمدہ معانی میں سے ایک معنی ہے، جس کو صرف وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اسلوبِ بلیغ کے ذریعے سے عرب کی باہم گفتگو میں طرز ہائے بیان سے واقف ہو۔

اور اسی طرح فرمانِ خداوندی ہے: ﴿وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ﴾(۲) پس اس جملہ کا لفظی ترجمہ ممکن نہیں؛ کیوں کہ اس میں بلیغ تعبیر کی ایک خاص نوع پائی جاتی ہے جسے ''استعارۂ مکنیہ'' کہتے ہیں، یہ استعارہ غیر عربی زبان میں نہیں پایا جاتا۔

اسی طرح ارشاد ربانی ہے: ﴿قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ﴾(۳) اور قول باری تعالیٰ ہے: ﴿تجري بأعيننا﴾(۴) اور اسی طرح فرمان الٰہی ہے: ﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾(۵) پس اگر ہم ان آیات کا لفظی ترجمہ کریں گے تو معنیٰ بالکل فاسد اور ایک اوٹ پٹانگ بے معنی کلام بن جائے گا، اس کے نظائر بہت زیادہ ہیں اور ان کا فساد بھی ظاہر ہے(۶)۔

---

(۱) ''اور نہ تو اپنا ہاتھ گردن ہی سے باندھ لینا چاہیے اور نہ بالکل ہی کھول دینا چاہیے ورنہ الزام خوردہ تہی دست ہو کر بیٹھ رہو گے''۔

(۲) ''اور ان کے سامنے شفقت سے انکساری کے ساتھ جھکے رہنا''۔

(۳) ''ان کے رب کے پاس (پہنچ کر) ان کو پورا مرتبہ ملے گا''۔

(۴) ''وہ کشتی ہماری نگرانی میں رواں تھی''۔

(۵) ''وہ تمہارے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہیں اور تم ان کے (بجائے) اوڑھنے بچھونے (کے) ہو''۔

(۶) لفظی ترجمہ قرآنی متن کے بغیر باتفاق علماء مفاسدِ کثیرہ کی بنا پر ناجائز ہے، عدم جواز کی وجوہِ ثلاثہ مصنف مدظلہ =

قرآن کریم کا معنوی ترجمہ: البتہ قرآن کا معنوی ترجمہ کرنا مذکورہ شرائط کے ساتھ جائز ہے، اور اسے قرآن نہیں کہا جائے گا بلکہ تفسیر قرآن کہیں گے، یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں الفاظِ قرآن سے بندگی کی دعوت دی ہے نہ کہ اس کے علاوہ دوسرے الفاظ سے، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے کلام کی روایت بالمعنیٰ جائز ہے کہ ہم کہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس کا مفہوم و معنی یہ ہے۔ لیکن قرآن کی روایت بالمعنی جائز نہیں، پس ہمارے لئے یہ جائز نہیں کہ یہ کہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جس کا معنی یہ ہے، بلکہ آیت کی تلاوت بمع اس کے حروف و الفاظ کے ضروری ہے؛ کیوں کہ قرآن بمع لفظ و معنی اللہ کی جانب سے وحی کیا گیا ہے اور اس کے الفاظ و معانی دونوں معجز ہیں۔

لہٰذا یہاں ترجمہ اصل میں قرآن کا نہیں ہوتا بلکہ قرآن یا تفسیر قرآن کا ترجمہ ہوتا ہے، یہ بات حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کو تمام مخلوق کی طرف اتارا ہے؛ تاکہ وہ ان کے لیے ہدایت وارشاد اور سعادت کا منبع ہو، پس ہمارے لئے قرآن کے معانی کو عربی زبان سے ناواقف دیگر قوموں تک پہنچانا تاکہ وہ بھی اس قرآن سے نور حاصل کریں اور اس کی ہدایت وارشاد سے استفادہ کریں کوئی ممنوع بات نہیں، جبکہ یہ کام تو بلا شبہ قرآن کے مقاصد میں سے ایک عظیم مقصد ہے: ﴿ان هٰذا القرآن...﴾ ''بلا شبہ یہ قرآن ایسے طریقہ کی ہدایت کرتا ہے جو بالکل سیدھا ہے (یعنی اسلام)''۔

لہٰذا اس معنی کے اعتبار سے ترجمۂ قرآن کو علماء نے جائز قرار دیا ہے، بلکہ یہ

= نے بھی ذکر فرمائی ہیں، لیکن پھر معنوی ترجمہ کو جائز قرار دینا محلِ نظر ہے، کیونکہ مفاسد اس میں بھی پائے جاتے ہیں، اور اگر مراد یہ ہے کہ قرآنی متن کے ساتھ لفظی ترجمہ بامحاورہ یا بے محاورہ ناجائز ہے تو یہ بات بھی قابل اشکال ہے، فسادِ معنی کی جو مثالیں مؤلفِ موصوف نے ذکر فرمائی ہیں ان میں سے بھی بعض میں اختلاف کی گنجائش ہے، بہت سے عربی کے محاورے اردو میں بھی مستعمل ہیں، بسا اوقات فسادِ معنی قاری کی فہم کے اعتبار سے ہوتا ہے، اس میں ترجمہ کا کوئی قصور نہیں ہوتا، لوگوں کی طلب کا قصور ہے، اگر دیکھنے والے غور سے دیکھیں اور پھر بھی سمجھ نہ آئے تو اسے جاننے والے سے دریافت کرلیں، ورنہ یہ دشواری تو ہر ترجمہ بلکہ ہر تفسیر میں بھی پیش آسکتی ہے، ہاں! جہاں واقعی فسادِ معنی لازم آئے تو صرف اس جگہ لفظی ترجمہ جائز نہ ہوگا، اس کی وجہ سے مطلقاً عدمِ جواز کا قول مشکل معلوم ہوتا ہے۔

تو مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ لوگوں تک دعوتِ الٰہی کو پہنچائیں اور ان کی طرف قرآن کی ہدایت کو لے کر جائیں، اور اس ترجمہ کے بغیر اس شریعت کی عظمت، اس دین کی شان وشوکت اور اس قرآن کے حسن وجمال کا پانا لوگوں کے لیے ناممکن ہے: ﴿وَاللهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ﴾ ''اور اللہ ہی سچ فرماتے ہیں اور سیدھے راستے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں''۔

اول وآخر اللہ ہی کے لیے تمام تعریفیں ہیں۔ اللہ کے فضل ومدد سے ہی یہ کتاب پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی۔

☆☆......☆☆